URDU KI ADABI TAREEKHON SE MUTALIQ TANQID KA TAJZIYATI MUTALA

THESIS

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

URDU

Hasnain Sialvi

By

NEYAZUL HAQUE

UNDER THE SUPERVISION OF

PROF. SHAHABUDDIN (SAQIB)

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH-202002 (INDIA)

2021

Centre of Advanced Study
Department of Urdu
Aligarh Muslim University, Aligarh

DATED: ....

CERTIFICATE

This is to certify that the Ph.D. thesis entitled "**Urdu ki Adabi Tareekhon Se Mutaliq Tanqid ka Tajziyati Mutala"** has been written by **Mr. Neyazul Haque.**

This thesis is his original work and he has tried to get it prepared with the help of his own study and analysis.

This is further certified that this thesis is complete in all respect and this is submitted for the award of Ph.D. degree and this is also assured that this thesis will not be submitted to any other University for any other degree.

(Prof. Mohd. Ali Jauhar)
Chairman

(Prof. Shahabuddin (Saqib)
Supervisor

مقدمہ

کہا جاتا ہے کہ زندہ قومیں اپنے ماضی کو نہ صرف یادرکھتی ہیں بلکہ اس سے سبق بھی حاصل کرتی ہیں، یہی معاملہ زندہ زبانوں اور ان کے شعروادب کا بھی ہے۔ادبی تاریخ بھی کسی قوم کے ادبی شعور اور اس کے ماضی کے شعروادب کی بازیافت ہے۔ادبی مورخ ماضی کے اندھیروں میں سفر کرتا ہے،خوابیدہ داستانوں کو بیدار کرتا ہے، گرد میں دبے ہوئے دستاویزات کو جھاڑتا ہے اور ان دستاویزات کے اوراق سے ماضی کے نامور کرداروں کو متعارف کراتا ہے، ادبی مورخ کو حال سے سفر کرتے ہوئے ماضی کے ان زمانوں تک جانا پڑتا ہے،جن میں یہ ادبی کردار زندہ تھے اور اپنے تخلیقی عمل سے اپنے عہد کو متاثر کررہے تھے۔

ادب کی تاریخ کا معاملہ عام تاریخ کے مقابلے میں خاصا نازک اور پیچیدہ ہوتا ہے، اس لیے کہ یہ تاریخ کے مروجہ تصور کے مطابق محض ایام شماری نہیں اور نہ ہی معلومات وکوائف مرتب کرنا ہے، اگرچہ تاریخ میں یہ سب کچھ شامل ہے لیکن بنیادی طور پر یہ تخلیق اور تخلیق کاروں کا مطالعہ ہے۔اگر ایک طرف تاریخ ادب سے تخلیق کی معیار بندی ہوتی ہے تو دوسری طرف تخلیق کاروں کی انسانی اور تخلیقی شخصیت کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے۔ ادبی مورخ کا کام یہیں پر ختم نہیں ہوجاتا بلکہ اس کے ساتھ ہی اسے ان تمام سیاسی ، سماجی ،تہذیبی اور تمدنی عوامل کا تجزیاتی مطالعہ بھی کرنا ہوتا ہے اور ان محرکات کے عمل اور ردعمل سے تشکیل پانے والی تخلیقات کی معیار بندی بھی کرنی پڑتی ہے، مثلاً لسانی مضمرات اور تخلیقی شخصیات کا مطالعہ، تجزیہ وتحلیل اور تشریح ادبی مورخ کا بنیادی فریضہ ہے۔

ادبی مورخ ادب کے حوالے سے انسانی مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور ادب ہی کے وسیلے سے ان تہذیبی قدروں کی نشان دہی کرتا ہے جو عام زندگی میں جاری وساری رہتی ہیں، اس طرح وہ ایک ثقافتی مبصر اور سماجی ناقد کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔اسی لیے یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہر مصنف اپنے عہد اور معاشرے کا پروردہ ہوتا ہے، چاہے اس کی شخصیت کتنی ہی ممتاز کیوں نہ ہو، اس کی تصانیف میں اس کے عہد اور معاشرے کا

عکس ضرور جھلکتا ہے۔ اس لیے تاریخ ادب میں شخصی اور اجتماعی دونوں جہتوں کی نمائندگی ضروری ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب تک تاریخ نے انیسویں صدی میں قدم نہیں رکھا تھا وہ تحقیق و ترتیب کے اصول سے نا آشنا رہی، اور تاریخ کے صفحات میں حکمراں طبقے کی تعریف، دلچسپ قصے، داستان اور رزمیہ نظمیں کہانی کی شکل میں لکھی جاتی رہیں۔ انیسویں صدی میں تاریخ کے لیے تحقیق و ترتیب کا اصول مقرر کیا گیا اور اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ تاریخ محض سیاسی واقعات یا چند شخصیتوں کے کارناموں کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں سماجی، معاشی اور ثقافتی عناصر اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ان سب کی شمولیت ہی تاریخ کو تاریخ بناتی ہے۔

ادبی تاریخ ہمہ جہت چیز ہے، اور ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔ کیوں کہ ادبی فن پارے کو پڑھ کر جہاں ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے وہیں بہت سے سوالات بھی سر اٹھاتے ہیں۔ ان سوالات کو حل کرنے کے لیے گزشتہ ادبی روایات کا سمجھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ایک شاعر یا ادیب اپنے فن پارے میں جو زبان استعمال کرتا ہے، اس میں بہت سے استعارے، تشبیہات یا تراکیب ایسی ہوتی ہیں، جو صرف اس کے دور ہی سے مخصوص ہوتی ہیں۔ ان کو سمجھنے کے لیے پورے ادب کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے، جو تاریخ ادب کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی کے پیش نظر راقم نے اساتذہ کے مشورے سے ''اردو کی ادبی تاریخوں سے متعلق تنقید کا تجزیاتی مطالعہ'' موضوع منتخب کیا۔ چوں کہ اس موضوع پر تا حال بہت زیادہ کام نہیں ہوا ہے، چند مضامین کے علاوہ ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' اور ڈاکٹر افشاں زوار کی کتاب ''اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' اس موضوع کا کل سرمایہ معلوم ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی مذکورہ کتاب میں تحقیق و تنقید سے کام لیتے ہوئے اہم تاریخوں کے سنین کا بالخصوص تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر افشاں زوار اور ڈاکٹر گیان چند جین جیسے معتبر محققین اور مستند ناقدین کی اس کتاب کے بعد بہ ظاہر ادبی تاریخوں کے مزید تحقیقی اور تنقیدی جائزے کی گنجائش نہیں رہتی، مگر جس طرح ایک آئینہ خانے میں کسی ایک چیز کے کئی مختلف پہلو، انداز اور رنگ سامنے آتے ہیں، اسی طرح اس موضوع کے اب بھی کئی پہلو تشنہ طلب محسوس ہوتے ہیں۔ مثلاً کتاب کی خصوصیات کا بیان، ہر باب کا تفصیلی تجزیہ، مصنف کے اسلوب بیان کا جائزہ اور ان محققین کے بعد شائع ہونے والی تاریخوں کا مطالعہ زیر نظر مقالے کو تحریر کرنے کا جواز بنا ہے۔ یہ مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ جن کی اجمالی کیفیت یہ ہے:

باب اوّل: تاریخ اور ادبی تاریخ کے چند مباحث

باب دوم: ادبی تاریخ کے ابتدائی نقوش (تذکروں کے حوالے سے)

باب سوم: رام بابو سکسینہ اور اعجاز حسین سے قبل ادبی تاریخ کے نمونے

باب چہارم: اردو ادب کی مختصر تاریخوں سے متعلق تنقید کا محاکمہ

باب پنجم: اردو ادب کی طویل تاریخوں سے متعلق تنقید کا محاسبہ

باب اوّل ''تاریخ اور ادبی تاریخ کے چند مباحث'' کے عنوان سے ہے۔ باب کے ابتدا میں مختلف زبانوں میں تاریخ کی جو تعریف بیان کی گئی ہے اس کا ذکر ہے۔ اس کے بعد تاریخ کے حوالے سے مشرقی و مغربی مورخین کے اقوال و نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب دوم ''ادبی تاریخ کے ابتدائی نقوش: تذکروں کے حوالے سے'' متعلق ہے۔ اس باب میں اردو کے چند اہم تذکروں مثلاً ''نکات الشعرا'' (میر تقی میرؔ) ''مخزن نکات'' (قائم چاندپوری) ''طبقات الشعرا'' (قدرت اللہ شوق) ''تذکرہ شعرائے اردو'' (میر حسن) ''گلشن ہند'' (مرزا علی لطف) ''مجموعۂ نغز'' (حکیم قدرت اللہ قاسم) ''گلشن بے خار'' (نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ) ''تاریخ ادب ہندوستانی'' (گارساں دتاسی) ''طبقات شعرائے ہند'' (کریم الدین و فیلن) کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ چوں کہ اردو شعر و ادب کے تاریخی اور تحقیقی مطالعے کے لیے تذکرے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تذکروں کے مطالعے کے بغیر نہ قدیم شعر و ادب کے فکری میلانات کو سمجھا جا سکتا ہے، اور نہ ہی اس عہد کے تنقیدی شعور کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے فنی معیاروں کو پرکھنے کی کوشش ہی کامیاب ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ یہی یادگاریں تاریخ ادب کی پہلی منزل اور اس کی بنیاد ہیں۔

باب سوم ''رام بابو سکسینہ اور اعجاز حسین سے قبل ادبی تاریخ کے نمونے'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' مولوی عبدالحی کی ''گل رعنا'' اور عبدالسلام ندوی کی ''شعر الہند'' کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

باب چہارم ''اردو ادب کی مختصر تاریخوں سے متعلق تنقید کا محاکمہ'' کے عنوان سے ہے۔ رام بابو سکسینہ سے لے کر عصر حاضر تک چھوٹی بڑی مختلف قسم کی کئی ادبی تاریخیں معرض وجود میں آ چکی ہیں۔ ان میں بعض

ادبی تاریخیں ایسی ہیں جن میں پورے اردو ادب کا جائزہ لیا گیا ہے، اور بعض ایسی ہیں جو کسی خاص پہلو یا ایک حصے پر مشتمل ہیں۔ مثلاً اصناف سے متعلق تاریخیں، مختلف علاقوں کے اردو ادب کے جائزے پر مبنی تاریخیں، اسی طرح مختلف ادوار، رجحانات یا تحریکات سے متعلق تاریخیں وغیرہ۔ چوں کہ میرے تحقیقی مقالے کا موضوع اردو ادب کی مختصر تاریخ کے جائزے پر مبنی ہے اس لیے زیر بحث باب میں ان نمائندہ ادبی تاریخوں کو شامل کیا گیا ہے جن میں خاصی حد تک تاریخی تسلسل کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اور ادب کے دونوں پہلوؤں یعنی شاعری اور نثر کو مساوی اہمیت دے کر ان کا اجتماعی جائزہ لیا گیا ہے۔

پانچواں باب ''اردو ادب کی طویل تاریخوں سے متعلق تنقید کا محاسبہ'' کے عنوان سے ہے۔ اردو میں زبان وادب کی تاریخ کی ایک درجن سے زائد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ رام بابو سکسینہ سے لے کر ڈاکٹر تبسم کاشمیری تک جو تاریخیں لکھی گئی ہیں وہ زبان وادب کی تاریخ کو سمجھنے میں بڑی معاون ہیں۔ بعض مورخین نے طلبا کے معیار ومزاج کے مطابق مختصر ادوار کی تاریخیں لکھی ہیں تو بعض مورخین نے مفصل۔ باب چہارم میں اردو ادب کی مختصر تاریخوں سے متعلق تنقید کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ اس باب میں اردو ادب کی طویل تاریخی کتابوں کا محاسبہ بہ اعتبار سنین پیش کیا گیا ہے۔ یوں تو اردو ادب کی طویل تاریخوں کی بھی ایک طویل فہرست ہے، مگر اس باب میں ان سب کا احاطہ ممکن نہیں، ان میں سے چند اہم ادبی تاریخیں مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' (مکمل جلدیں) پروفیسر سیدہ جعفر و پروفیسر گیان چند جین کی کتاب ''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک'' (مکمل جلدیں) اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی کتاب ''اردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک'' اس باب میں شامل ہیں، جن کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

''حاصل مطالعہ'' کے تحت پورے ابواب کا مجموعی جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ادبی تاریخ کو نہ محض ادبی فن پاروں کی جمالیاتی کیفیت یا سوانحات کا مجموعہ ہونا چاہیے نہ تنقیدی مضامین کا اور نہ صرف بدلتے ہوئے مذاق سخن کی دستاویز، بلکہ اسے ایک فعال اور متحرک فن کی داستان ہونا چاہیے۔ اس بے جان چیز میں روح ڈالنے کے لیے مورخ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ زبان وادب کے نشو ونما کے ساتھ ساتھ اس پس منظر میں بدلتے ہوئے حالات کی کہانی بھی پیش کرے۔ آخر میں اس مقالے کی تیاری میں جن کتب ورسائل سے

استفادہ کیا گیا ہے، ان کی تفصیلات درج کردی گئی ہیں۔

اس مقالے کی تکمیل کے موقع پر سب سے پہلے میں اپنے مالک حقیقی یعنی ربّ کریم کا شکرادا کرتا ہوں کہ اس کی عنایت اور فضل وکرم کے بغیر کوئی کام کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔اس کے بعد میں اپنے استاد محترم ونگراں پروفیسر شہاب الدین ثاقبؔ کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتا ہوں کیوں کہ ان کی توجہ اور کرم فرمائیوں کے بغیر اس موضوع پر کام کرنا مجھ جیسے ادنیٰ طالب علم کے لیے ممکن نہ تھا، انہوں نے نہ صرف موضوع کے انتخاب میں میری مدد فرمائی بلکہ مواد کی فراہمی سے لے کر مقالے کی تکمیل تک ہر مرحلے پر میری رہنمائی فرمائی اور مفید مشوروں کے ساتھ ادبی مسائل پر سنجیدگی سے غور وفکر کرنے کی طرف راغب کیا۔ان کے لیے شکریئے کے الفاظ بہت کم ہیں۔دعا گو ہوں کہ مشفق استاد کی سرپرستی ہم لوگوں پر تادیر قائم رہے۔

میں پروفیسر محمد علی جوہر (صدر شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر خورشید احمد، پروفیسر سید محمد ہاشم، پروفیسر مولا بخش، ڈاکٹر سلطان احمد، ڈاکٹر زبیر شاداب کے علاوہ شعبے کے دیگر تمام اساتذہ کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنہوں نے تعلیمی مدت کے دوران نہایت شفقت سے نوازا اور حسب ضرورت میری ہر ممکن مدد فرمائی۔

مواد کی فراہمی کے لیے مولانا آزاد لائبریری (مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) کے علاوہ جن کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ان میں خدا بخش لائبریری (پٹنہ) جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی سنٹرل لائبریری اور جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) کی ذاکر حسین لائبریری خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔مولانا آزاد لائبریری (علی گڑھ) کے محسن بھائی، باقر بھائی اور محمد ریحان وغیرہ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں نے کتب ورسائل کی فراہمی میں میری مدد فرمائی۔اس کے علاوہ مذکورہ کتب خانوں کے ان تمام اراکین کا شکریہ جنہوں نے مواد کی فراہمی کے مشکل مرحلے کو آسان بنایا۔علاوہ ازیں سیمینار لائبریری (شعبۂ اردو، علی گڑھ) کے انچارج جاوید بھائی اور اردو اکادمی لائبریری کے انچارج ڈاکٹر محمد عرفان ندوی بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ ان لوگوں نے موضوع سے متعلق مواد فراہم کرنے میں بھر پور مدد کی۔

والدین کا شکریہ بھی مجھ پر فرض ہے کہ جنہوں نے مجھے تعلیم کی طرف راغب کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ،مگر افسوس کہ اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں، دعا گو ہوں کہ خدا انہیں غریق رحمت کرے۔ناسپاسی ہوگی اگر

بڑے بھائی تمیز الحق صاحب کا شکریہ نہ ادا کروں جنھوں نے والدین کی رحلت کے بعد ان کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا اور قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ دعا گو ہوں کہ خداوند کریم ان کا سایہ تمام چھوٹے، بڑے بھائی بہنوں کے سر پر تادیر قائم رکھے۔

آخر میں مخلص دوستوں محمد معروف، خیر الدین اعظم، فصیح الرحمٰن خان، محمد شاہد خان، عباس رضا، محمد عالم، سید محمد عقیل، عبد القوی، محمد فرحان دیوان، ارشد رفیق، غلام سرور، محمد سفیان احمد، ظہیر حسن ظہیر، محمد شاہد اور ثاقب درانی وغیرہ کا شکریہ کہ جنھوں نے اس مقالے کی تکمیل میں میری ہر ممکن مدد کی۔

نیاز الحق
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ
۲۰۲۰۰۲ (یو۔ پی۔) انڈیا

اردو کی ادبی تاریخوں سے متعلق تنقید کا تجزیاتی مطالعہ

تلخیص برائے

پی ایچ. ڈی (اردو)

مقالہ نگار

نیاز الحق

نگراں

پروفیسر شہاب الدین (ثاقبؔ)

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۲۱ء

تلخیص

’’تاریخ‘‘ بنیادی طور پر عربی کا لفظ ہے جس کا مادہ ’’ارخ‘‘ ہے۔ اس کا مطلب ہے’’وقت کا بیان کرنا‘‘، ’علم التاریخ‘ سے مراد ایسا علم جس میں واقعات مع تاریخ بیان کیے جائیں۔ اردو میں تاریخ کا لفظ متعدد معنوں میں مستعمل ہے لیکن ہمیں یہاں ہر قسم کے معنی سے سروکار نہیں۔ بطور ایک علمی اصطلاح کے اردو میں لفظ تاریخ کا مفہوم کسی چیز کے ظہور کا وقت، کسی امر عظیم کے وقت کا تعین، اس فن کا نام جس میں واقعات گذشتہ سے بحث کی جاتی ہے، لیا جاتا ہے۔ انگریزی میں تاریخ کے لیے "History" کا لفظ مستعمل ہے، جس کا تعلق لاطینی لفظ "Histo" یا "Historia" سے ہے، اس سے مراد کسی واقعے کی تفتیش و تحقیق کرنا ہے۔ عام طور پر لفظ ہسٹری (History) سے مراد کسی قوم، معاشرے اور ادارے کے وقائع خاص کا صحتِ وجوہات کے ساتھ ترتیب وار تحریری ریکارڈ ہے۔ یونانی زبان میں لفظ ’تاریخ‘ انڈ نئے "EIDENAI" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، جس سے مراد کسی واقعے کی بصیرت وادراک حاصل کرنا ہے اور فرانسیسی زبان میں یہ لفظ ہسٹر (ISTOR-HISTOR) کے طور پر استعمال ہوا ہے، جس سے مراد ماضی کی کسی چیز یا واقعے کے بارے میں جاننا اور معلومات رکھنا ہے۔

تاریخ ایک سبق آموز داستان ہے، جس میں ماضی کا بیان، حال کا تجزیہ اور مستقبل کی روشنی ہوتی ہے۔ یہ صرف روایت پسند اور نقوشِ پارینہ کا خزانہ نہیں بلکہ ہمارے ذہنی وفکری، جذباتی وتہذیبی، معاشرتی وثقافتی سفر کی ارتقائی داستان ہے، جس کے آئینے میں قومی واجتماعی زندگی کے ہر پہلو کو دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ ایسا علم ہے جو پوری زندگی پر محیط ہے۔ فکری، عملی، ادبی، مالی، ملکی، سیاسی، اقتصادی غرض انسانی حیات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کی روداد تاریخ نہ کہلائے۔ دیومالائی شخصیتوں سے لے کر مفکروں، سیاست دانوں اور سائنسدانوں کے افکار ونظریات کے علم کا منبع ومخرج بھی یہی ہے۔ اسی بنیاد پر تاریخ کو ’’ام العلوم‘‘ تصور کیا جاتا ہے۔

وہ تمام عملی مطالبے جو کسی تاریخی فیصلے کے بین السطور میں ہوتے ہیں، تاریخ کو عصری تاریخ کے کردار میں بدل دیتے ہیں خواہ کوئی بھی واقعات زمانے کے اعتبار سے کتنے ہی بعید کیوں نہ ہوں فی الحقیقت موجودہ ضروریات سے متعلق ہوتے ہیں، اس لیے یہ کہا گیا ہے کہ ''**الماضی اشبہ بالآتی من الماء بالماء**'' عہد گزشتہ عہد آئندہ سے اس قدر مشابہ ہے کہ پانی، پانی سے بھی اس قدر مشابہ نہیں۔'' تاریخ ایک ایسا مضمون ہے جو زندگی کے ہر پہلو کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے، جس کے مطالعے کے لیے بڑے گہرے تجربے کے ساتھ پختہ عقل اور غور وفکر کی ضرورت ہے کیوں کہ اس کا مطالعہ جہاں ہمیں یہ مواقع فراہم کرتا ہے کہ ماضی میں کسی قوم کے افکار ونظریات کیا تھے؟ وہ نظریہ یا ایجاد کن مرحلوں، راستوں اور دشواریوں سے گزر کر پایۂ تکمیل تک پہنچی۔ وہیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ہم دوسروں کے تجربے سے سیکھیں کیوں کہ تاریخ میں لامحدود انسانی تجربہ ہوتا ہے جو کہ انفرادی تجربہ سے زیادہ وسیع اور مختلف اقسام کا ہوتا ہے۔ ان تجربات یا انسانی ذہن کو اس وقت تک مکمل طور پر نہیں سمجھا جاسکتا جب تک بکھری ہوئی کڑیوں کو ملایا نہیں جائے گا اور یہ کام صرف تاریخ کرسکتی ہے۔

انیسویں صدی میں تاریخ میں ایک بڑی تبدیلی اس وقت آئی، جب سائنس کی تعلیم اور سائنسی طرز فکر کی ہمہ گیر اہمیت زندگی کے ہر شعبہ میں محسوس کی جانے لگی تو اس رجحان نے تعلیم کے میدان میں بھی دور رس اثرات ڈالے۔ جس کا اثر تاریخ اور مورخ دونوں پر ہوا۔ اب تاریخی واقعات کی اصلیت اور صداقت معلوم کرنے کے لیے تحقیق وجستجو کے سائنسی طریقے کام میں لائے جانے لگے۔ جس کی وجہ سے وہ شخصیتیں جن کا مقام تاریخ میں اس لیے اہم تھا کہ ان کے ارد گرد کرامتیں اور معجزے تھے، ان کی اصلی اور تاریخی حقیقت جس میں چھپی تھی، ایک ایسے معاشرے میں تو موثر ہوسکتی تھیں جس کی ذہنی ترقی نہیں ہوئی تھیں یا جو چیزوں کو عقلی اور سائنسی بنیاد پر نہیں سمجھ پاتے تھے، اس لیے وہ واقعات کی وجوہات تلاش نہ کرکے ان پر یقین کر لیتے اور اسے مافوق الفطرت قوتوں سے منسوب کردیتے تھے۔ آج جب سائنسی طریقے پر ان واقعات کو جانچا گیا تو ان کی تاریخی اہمیت کم ہوگئی اور جب تاریخی اہمیت کم ہوگئی تو ان کے عمل اور کردار سے انسان کچھ سیکھنے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کرتا ہے۔ کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ انسان صرف انسان سے سیکھ سکتا ہے جو انسانی درجے سے بلند ہوں ان کی صفات حاصل کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔

جب تک تاریخ نے انیسویں صدی میں قدم نہیں رکھا وہ تحقیق وترتیب کے اصول سے نا آشنا رہی، اور تاریخ کے صفحات میں حکمراں طبقے کی تعریف، دلچسپ قصے، داستان اور رزمیہ نظمیں کہانی کی شکل میں لکھی جاتی رہیں۔ انیسویں صدی میں تاریخ کے لیے تحقیق وترتیب کا اصول مقرر کیا گیا اور اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ تاریخ محض سیاسی واقعات یا چند شخصیتوں کے کارناموں کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں سماجی ومعاشی او رثقافتی عناصر اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ان سب کی شمولیت ہی تاریخ کو تاریخ بناتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ تاریخ ادب میں ادوار کا تعین سہولت کے پیش نظر ضرور کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ادوار منجمد اور قائم بالذات ہوتے ہیں اور ایک دور سے دوسرے دور کے درمیان کوئی دیوار حائل ہوتی ہے۔ تاریخ چاہے وہ عام تاریخ ہو یا تاریخ ادب ایک مسلسل بہتے ہوئے دھارے کی طرح ہوتی ہے جسے خانوں میں تقسیم کرنا آسان نہیں۔ دراصل ایک دور دوسرے دور میں اس طرح پیوست ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ایک دور کہاں ختم ہوا اور دوسرا دور کب شروع ہوا۔

بہرحال ادبی تاریخ شیشے کے مانند وہ سمندر ہے جو ان تمام مطالبات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، جس میں ہم زبان اور اس کے بولنے اور لکھنے والوں کی اجتماعی وتہذیبی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ ادب میں سارے فکری، تہذیبی، سیاسی، معاشرتی اور لسانی عوامل ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک وحدت ایک اکائی بناتے ہیں اور ادبی تاریخ ان تمام اثرات، روایات، محرکات، خیالات اور رجحانات کا آئینہ بن جاتی ہے، جن کی مدد سے ہم کسی بھی قوم کے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور تاریخی عوامل کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ ادیبوں، فلسفیوں، مفکروں، شاعروں اور عالموں کو جان یا پہچان سکتے ہیں۔ کسی معاشرے کی اخلاقی اقدار، روایات اور ثقافتی ادارے کس طرح تبدیلی کا شکار ہوئے ان سب کا صحیح اندازہ ادبی تاریخ کے مطالعے سے ہی ہوتا ہے۔

ادبی تاریخ ہمہ جہت چیز ہے اور ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ ادبی فن پارے کو پڑھ کر جہاں ہم اس کی تحسین کرتے ہیں وہیں بہت سے سوالات بھی سر اٹھاتے ہیں۔ ان سوالات کو حل کرنے کے لیے گزشتہ ادبی روایات کو سمجھنا ہوتا ہے۔ پھر شاعر یا ادیب اپنے فن پارے میں جو زبان استعمال کرتا ہے، اس میں بہت سے استعارے، تشبیہات یا تراکیب ایسی ہوتی ہیں جو صرف اس

کے دور ہی سے مخصوص ہوتی ہیں۔ان کو سمجھنے کے لیے پورے ادب کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ جو تاریخ ادب کے بغیر ممکن نہیں۔اسی ضرورت کے پیش نظر راقم نے اپنے مقالے کا موضوع ''اردو کی ادبی تاریخوں سے متعلق تنقید کا تجزیاتی مطالعہ'' منتخب کیا، جو درج ذیل پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

باب اول: تاریخ اور ادبی تاریخ کے چند مباحث

باب دوم: ادبی تاریخ کے ابتدائی نقوش (تذکروں کے حوالے سے)

باب سوم: رام بابو سکسینہ اور اعجاز حسین سے قبل ادبی تاریخ کے نمونے

باب چہارم: اردو ادب کی مختصر تاریخوں سے متعلق تنقید کا محاکمہ

باب پنجم: اردو ادب کی طویل تاریخوں سے متعلق تنقید کا محاسبہ

باب اوّل'' تاریخ اور ادبی تاریخ کے چند مباحث'' کے عنوان سے ہے۔باب کے ابتدا میں مختلف زبانوں میں تاریخ کی جو تعریف بیان کی گئی ہے اس کا ذکر ہے۔اس کے بعد تاریخ کے حوالے سے مشرقی و مغربی مورخین کے اقوال و نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ان اقوال و نظریات میں ایک بات جو مشترک ہے وہ یہ کہ مغربی مورخین اسے صرف واقعات کی کھتونی نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت علم سمجھتے ہیں، جو زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے۔کوئی قوم یا معاشرہ ایک خاص وقت یا ایک خاص دور میں کس طرح رہتا تھا، کیا سوچتا تھا، روایات کیا تھیں، انداز تعمیر کیا تھا؟ ان سارے سوالات کا جواب صرف تاریخ دے سکتی ہے۔

اسی طرح جب ہم مسلمان مورخین کے نظریات و خیالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ بھی اس علم کو بے مقصد یا قصہ کہانی نہیں سمجھتے ہیں۔مسلمان مورخین کا نقطۂ نظر قرآن کریم سے متاثر ہے اور قرآن کریم میں خود یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر تم قوموں کے عروج و زوال اور عزت و ذلت کا حقیقی سبب معلوم کرنا چاہتے ہو تو تاریخ کی ورق گردانی کرو، اور تم سے پہلے جو قومیں گزر چکی ہیں ان کا حال معلوم کرو۔

ابتدا میں ہر قوم صرف اپنی تاریخ میں دلچسپی لیتی تھی اور اسے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی تھی لیکن جب تجارتی اور سفارتی تعلقات نے قوموں کو ایک دوسرے کے قریب کیا تو ان میں ایک دوسرے کو جاننے کا شوق پیدا ہوا۔ باوجود اس کے کہ ہر قوم کی تاریخ جدا ہوتی ہے اس میں ایک تاریخی تسلسل برقرار رہتا ہے خواہ وہ تسلسل تہذیب و تمدن کی شکل میں ہو یا تخلیقات و ایجادات کی شکل میں کیوں کہ ایک قوم جو سرمایہ

چھوڑ کر جاتی ہے وہ باقی رہتا ہے اور اس کی بنیاد پر دوسری قومیں مزید تعمیر کرتی ہیں اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے، جس سے پوری انسانیت فائدہ اٹھاتی ہے۔

جیسے جیسے حالات بدلے، تاریخ کا دائرہ بڑھا، مورخ کی ذمہ داری بڑھی۔ واقعات کے اسباب پر غور وفکر ساتھ ساتھ ان واقعات کو اصول تحقیق کی روشنی میں جانچا جانے لگا اور یوں تاریخ کو ایسے مورخین سے چھٹکارا ملا جو تاریخ کے صفحات کو اوہام وخیالات وخود تراشیدہ روایات سے بوجھل کرتے تھے کیوں کہ اب تاریخ لکھنے کے لیے ایسے مورخ کی ضرورت ہوتی ہے جو تربیت یافتہ ہو، کیوں کہ تربیت یافتہ مورخ ہی واقعات کی اہمیت اور ان کی روح کو سمجھ سکتا ہے، ایک غیر تربیت یافتہ مورخ کی نظروں میں بہت سے واقعات غیر اہم ہوتے ہیں اور وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ ان کا ادراک کر سکے، جب کہ ایک تربیت یافتہ مورخ کی نگاہ اس قابل ہوتی ہے کہ وہ واقعات کی نوعیت اور حقائق کو دیکھ سکے اور ان کا تجزیہ کر سکے۔

وقت اور معلومات کے بڑھتے ذخیرے کے ساتھ تاریخ کے علم کا دامن بھی وسیع ہوتا گیا اور اس کے بہت سے دوسرے شعبے وجود میں آتے گئے، مثلاً معاشرتی تاریخ، معاشی تاریخ، سیاسی تاریخ، قومی تاریخ، مذہبی تاریخ۔ اسی طرح اس کا ایک نہایت اہم شعبہ ادبی تاریخ بھی ہے۔

ادب کی تاریخ عام تاریخ کا ایک جز یا شعبہ ہونے کے باوجود بھی اس سے الگ اور منفرد ہے۔ ایسا اس لیے کہ ادب کی تاریخ کا معاملہ عام تاریخ کے مقابلے میں خاصا نازک اور پیچیدہ ہے۔ اس لیے کہ یہ تاریخ کے مروجہ تصور کے مطابق محض ایام شماری نہیں اور نہ معلومات وکوائف مرتب کرنا ہے۔ اگرچہ تاریخ میں یہ سب کچھ شامل ہے لیکن بنیادی طور پر یہ تخلیق اور تخلیق کاروں کا مطالعہ ہے۔ اگر ایک طرف تاریخ ادب سے تخلیق کی معیار بندی ہوتی ہے تو دوسری جانب تخلیق کاروں کی انسانی اور تخلیقی شخصیت کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ تاریخی مطالعے کا مقصد صرف اپنی معلومات میں اضافہ کرنا نہیں ہوتا، بلکہ اپنے ادبی ذوق کی تربیت بھی مقصود ہوتی ہے۔ حال کو ماضی کے حقائق کے ذریعے سوچنے سمجھنے کی کوشش ہوتی ہے۔ عام طور پر ادب کا قاری اس کا مطالعہ صرف ذہنی تسکین کی خاطر کرتا ہے۔ اس لیے وہ صرف اپنے دور کے ادبی فن پاروں تک محدود رہتا ہے۔ مگر ادب کا سنجیدہ قاری صرف اپنے دور تک محدود رہنا نہیں چاہتا بلکہ وہ اپنے دور تک آنے والی ادبی روایت اور ان کی روح سے بھی آشنا ہونا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ

اپنے دور کے ادب کی ذہنی، فکری اور لسانی روایتوں کو جاننا چاہتا ہے۔ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں کی معلومات و تفہیم کے لیے ان ادبی شہ پاروں کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔تبھی جا کر یہ مقاصد پورے ہو سکتے ہیں۔

باب دوم ''ادبی تاریخ کے ابتدائی نقوش (تذکروں کے حوالے سے) ہے۔اس باب میں اردو کے چند اہم تذکروں مثلاً ''نکات الشعرا'' (میر تقی میرؔ) ''مخزن نکات'' (قائم چاند پوری) ''طبقات الشعرا'' (قدرت اللہ شوق) ''تذکرہ شعرائے اردو'' (میر حسن) ''گلشن ہند'' (مرزا علی لطف) ''مجموعۂ نغز'' (حکیم قدرت اللہ قاسم) ''گلشن بے خار'' (نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ) ''تاریخ ادب ہندوستانی'' (گارساں دتاسی) ''طبقات شعرائے ہند'' (کریم الدین ،فیلن) کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔کیوں کہ اردو شعروادب کے تاریخی اور تحقیقی مطالعے کے لیے تذکرے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ان تذکروں کے مطالعے کے بغیر نہ قدیم شعروادب کے فکری میلانات کو سمجھا جا سکتا ہے، نہ اس عہد کے تنقیدی شعور کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے فنی معیاروں کو پرکھنے کی کوشش ہی کامیاب ہو سکتی ہے۔کیوں کہ یہی یادگاریں تاریخ ادب کی پہلی منزل اور اس کی بنیاد ہیں۔ادبی مورخین ابتدائی معلومات انہیں تذکروں سے حاصل کرتے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں اسے اپنی تاریخوں کا حصہ بناتے ہیں۔قدیم اردو شاعری کے نمونے فراہم کرنے ہوں یا کسی شاعر کے سوانحی حالات کا بیان ہو، انہیں تذکروں سے مدد لی جاتی ہے۔ان تذکروں میں مختلف اشارات کی صورت میں زبان وادب کے ارتقاء کی جو داستان ملتی ہے یا قدیم شعرا کے کلام پر جو ذاتی رائے نما تنقید نظر آتی ہے وہ ادبی تاریخوں میں جا بجا دیکھی جا سکتی ہے۔

اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت دوسری متعدد اصناف ادب کی طرح فارسی کے توسط سے داخل ہوئی۔یہاں اس میدان میں ارباب قلم کی کاوشوں کے اولین نمونے ۱۱۶۵ھ/۵۲۔۱۷۵۱ء کے قریب منظر عام پر آئے۔اس وقت سے لے کر آب حیات کی اشاعت (۱۸۸۰ء) تک اردو شعرا کے کئی تذکرے مرتب کیے گئے لیکن ان میں بعض تذکرے نایاب ہیں مثلاً محمد یار خاں خاکسارؔ، محمد رفیع سوداؔ، سراج الدین علی خاں آرزوؔ اور سید امامؔ وغیرہ کے تذکروں کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا بلکہ ان میں سے بعض کا وجود بھی مشتبہ ہے۔اس لیے ان کے آغاز وانجام یا نوعیت و کیفیت کے متعلق کوئی گفتگو لا حاصل ہے۔ہاں قدیم ترین

دستیاب تذکروں کو سامنے رکھ کر ان کی تقدیم و تاخیر کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اردو کے قدیم ترین تذکروں میں مندرجہ ذیل کے نام لیے جاتے ہیں۔

۱۔ نکات الشعرا	میر تقی میرؔ	۱۱۶۵ھ
۲۔ گلشن گفتار	حمید اورنگ آبادی	۱۱۶۵ھ
۳۔ تحفۃ الشعرا	افضل بیگ قاقشال	۱۱۶۵ھ
۴۔ ریختہ گویاں	فتح علی حسینی گرد یزی	۱۱۶۶ھ
۵۔ مخزن نکات	قیام الدین قائم	۱۱۶۸ھ

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی کتاب ''شعرائے اردو کے تذکرے'' میں جو ادوار قائم کیے ہیں اگر ان کا مختصراً جائزہ لیں تو اردو تذکروں کا پہلا دور میر تقی میرؔ کے ''تذکرے نکات الشعرا'' (مولفہ ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ء) سے لے کر اسد علی خاں اورنگ آبادی کے تذکرے ''گل عجائب'' (مولفہ ۹۶-۱۱۹۴ھ/ ۸۲-۱۷۸۰ء) تک محیط نظر آتا ہے۔ یہ دور حمید اورنگ آبادی (گلشن گفتار) سید فتح علی حسینی الگردیزی (تذکرہ ریختہ گویاں) قائم چاندپوری (مخزن نکات) اور میر حسن (تذکرہ شعرائے اردو) وغیرہ کا دور ہے۔ یہ تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں ذکر اردو شعرا کا کیا گیا ہے اس لیے انتخاب کلام بھی اردو زبان ہی میں درج ہے۔ اس دور کی واضح خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب تذکرے مختصر ہیں۔ کیوں کہ اس دور میں صرف انتخاب کلام کا رجحان تھا۔ ان تذکروں میں شعرا کی تعداد سو سے لے کر تین سو کے قریب تک پہنچتی ہے جس میں میر تقی میرؔ کا تذکرہ ''نکات الشعرا'' کلام پر تبصرے اور آرا کے اعتبار سے سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔

اس کے بعد تذکرہ نگاری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں تمام قابلِ ذکر شعرا کو جگہ دی گئی ہے اس لیے اسے جامعیت کا دور کہا جاتا ہے۔ یہ دور علی ابراہیمؔ کے تذکرے ''گلزار ابراہیم'' مرقومہ ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء سے شروع ہوکر قطب الدین باطن کے تذکرے ''گلستان بے خزاں'' مرقومہ ۶۵-۱۲۶۱ھ/ ۴۹-۱۸۴۵ء تک پھیلا نظر آتا ہے۔ اس دور میں لکھے جانے والے اہم تذکرے ''عیار الشعرا'' خوب چند ذکاؔء، مولفہ ۲۶-۱۲۳۱ھ/ ۱۸۱۲-۱۷۹۹ء، اعظم الدولہ سرورؔ کا لکھا ہوا تذکرہ ''عمدہ

منتخبہ'' مولفہ۴۴-۱۲۱۶ھ/ ۲۹-۱۸۰۱ء اور قدرت قاسم کا تذکرہ ''مجموعہ نغز'' مولفہ ۱۲۲۱ھ/ ۷-۱۸۰۷ء ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی تذکرے لکھے گئے ہیں مثلاً گلشنِ ہند (بہ زبانِ اردو) گلشنِ بے خار، دستور الفصاحت اور خوش معرکہ زیبا وغیرہ۔ اس دور میں لکھے جانے والے تذکروں میں شعرا کی تعداد چھ سو سے لے کر پندرہ سو تک ملتی ہے۔ اسی ضخامت کی وجہ سے بعض تذکروں میں کچھ خرابیاں در آئی ہیں مثلاً تکرار کی کیفیت اور ناقص معلومات پر مبنی باتیں۔ بہر حال ''عیار الشعرا'' کو اس دور کا ضخیم ترین تذکرہ کہا جا سکتا ہے کیوں کہ اس میں بقول سید عبداللہ پندرہ سو شعرا کا ذکر ملتا ہے۔ معلومات کے اعتبار سے ''مجموعہ نغز'' کو ایک بہترین کوشش کہا جا سکتا ہے۔ تیسرے دور میں صرف انہی شعرا کے حالات و واقعات کا ذکر ملتا ہے جو اہم سمجھے جاتے ہیں۔ نیز تذکروں میں حالات و واقعات کے صحت و سند کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ یہ دور کریم الدین کے تذکرے ''طبقات الشعرا ہند'' مولفہ ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء سے لے کر مولانا محمد حسین آزاد کے تذکرے ''آب حیات'' مولفہ ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء تک پھیلا نظر آتا ہے۔ آب حیات کے بعد حقیقتاً تذکرہ نگاری کا دور ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ مغرب کے زیر اثر تنقید، تاریخ اور سوانح نگاری لے لیتی ہے۔ خود ''آب حیات'' طرز قدیم کے تذکروں سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اس میں اردو زبان کی تاریخ، لسانی مسائل، مختلف ادوار کی خصوصیات اور شعرا کی شخصیت و کلام پر رائے زنی کا وہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو تاریخ، سوانح کا خاصہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ اردو زبان و ادب کے تقریباً سارے ناقدین آب حیات کو اردو ادب کی پہلی تاریخی و تنقیدی کتاب خیال کرتے ہیں، اس بات سے انکار نہیں کہ آب حیات کے بعد بھی تذکرے کے طرز پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔

گویا تذکرہ نگاری کی قدیم روش میں تبدیلی آئی اور دستاویزی شہادتوں کی بدولت مستند مواد پیش کیا جانے لگا۔ علاوہ ازیں شعری و لسانی روایات کی عہد بہ عہد ترقیوں کو ایک تاریخی دستاویز کی صورت میں منضبط کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان محرکات کی روشنی میں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ تذکرہ نگاری کا فن وقت اور حالات کے تقاضوں کا ردّعمل ہے۔ انسان کی ارتقاء پذیر قوت فکر کی کرشمہ سازیاں ماحول اور زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ان تقاضوں کی نوعیت اور ان کے نتائج کو ہر لحاظ سے نئے آب و رنگ سے آشنا کرتی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود ہر نسل کے فن کار اپنی راہ کے تعین اور کوششوں کی کامیابی

کے لیے بڑی حد تک اسلاف کے نقوشِ قدیم ہی سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اس لیے ان کے کارناموں کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوتی۔ تذکروں کا بھی یہی حال ہے۔ آج عملاً تاریخ ادب ان کی جگہ لے چکی ہے اور ان اغراض و مقاصد کی صورت گری کے لیے جن کی تکمیل کے ساتھ ان کی افادیت ومقبولیت کا دامن وابستہ تھا، علم و تحقیق کی وسیع تر شاہراہیں کھل گئی ہیں۔ تاہم کوئی انصاف پسند اور ذمہ دار مورخ یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ ماضی کے اس عظیم ورثے کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر آگے بڑھ جائے۔ کیوں کہ انہیں تذکروں کی مدد سے حال کا رشتہ ماضی سے جوڑا جا سکتا ہے اور آئندہ بھی جب کسی ادبی گتھی کو سلجھانا ہوگا یا کوئی خلا پر کرنا ہوگا تو ان کی مدد سے ہی ایسے مراحل طے کئے جا سکیں گے۔

باب سوم ''رام بابو سکسینہ اور اعجاز حسین سے قبل ادبی تاریخ کے نمونے'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' مولوی عبد الحئی کی ''گل رعنا'' اور عبد السلام ندوی کی ''شعر الہند'' کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ''آب حیات'' ۱۸۸۰ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کتاب میں آزاد نے اپنے سے قبل لکھے گئے تذکروں کا انداز اپنانے کے ساتھ ایک نئی روش بھی اختیار کی۔ انہوں نے اردو شاعری کو پانچ ادوار میں تقسیم کر کے ہر دور سے صرف نمائندہ شعرا کو منتخب کیا اور جو ان کی نظر میں غیر اہم شعرا تھے انہیں نظر انداز کر دیا۔ منتخب کیے گئے شعرا کے مختصر حالات زندگی، ان کی شکل وصورت، ان کے مزاج اور ان کی زندگی کے اہم واقعات اور خصوصیات کلام کو اس طرح بیان کیا کہ ان کی جیتی جاگتی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ یوں تو بظاہر آزاد نے اسے صرف شاعری کی تاریخ کے طور پر لکھا ہے، مگر اس میں بیک وقت کئی ایسے عناصر، اور کئی ایسی خصوصیات ہیں جو اسے تذکرہ اور تاریخ کے درمیان لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔

آب حیات جب پہلی مرتبہ منظر عام پر آئی تو اس میں بعض ایسی کمزوریاں تھیں جس کی وجہ سے اس پر سخت تبصرے ہوئے۔ خاص طور پر مومن جیسے ممتاز غزل گو شاعر کو نظر انداز کر دینے اور ذوق کو تمام منتخب شاعروں سے افضل و برتر ثابت کرنے کے نتیجے میں آزاد کو ہدف ملامت بنایا گیا۔ آخر کار مصنف کو کتاب پر نظر ثانی کرنی پڑی اور ۱۸۸۳ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن بہت سے اضافوں اور ترمیموں کے ساتھ شائع کرایا جس کی تفصیل اسلم فرخی نے اپنی کتاب ''محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف'' کی جلد دوم میں صفحہ ۱۴ تا ۱۹ پر دی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ میر ضاحک، میر حسن، خلیق، مومن، دبیر اور انیس کے حالات پہلی بار

دوسرے ایڈیشن میں پیش کیے گئے۔اسی طرح ناسخ اور ذوق کے حالات از سرنو لکھے گئے۔جن اغلاط کی طرف لوگوں نے اشارہ کیا تھا انہیں دور کیا اور نئی معلومات کا اضافہ کیا۔گویا اب یہ کتاب محض شاعری کی تاریخ نہیں بلکہ توانا،متحرک اور زندگی سے لبریز دستاویز بن کر ابھری۔اس کی وجہ یہ تھی کہ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی اس وقت تک اردو شعرا کے بے ربط سے تذکروں کو چھوڑ کر شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا اور شعرا کے مفصل حالات پر کوئی کتاب موجود نہ تھی۔لہٰذا ایک ایسی کتاب کی سخت ضرورت تھی جس میں شعرا کے متعلق زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کیے گئے ہوں،اس میں تحقیق وتنقید کے نمونے بھی ہوں اور شاعروں کے مستند حالات بھی۔محمد حسین آزاد کی کتاب ’’آب حیات‘‘ نے اس کمی کو حتی الامکان پورا کر دیا۔

آب حیات کے بعد تذکرہ نویسی کا جدید دور شروع ہوتا ہے جس میں شعرالہند،گل رعنا اور خمخانۂ جاوید جیسے تذکرے لکھے گئے۔ان میں سے بعض میں آب حیات کی طرح تاریخ ادب کا رنگ وآہنگ موجود ہے،گل رعنا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔اگر اس کے اندراجات پر نظر ڈالی جائے تو یہاں ’آب حیات‘ کی تقلید صاف نظر آتی ہے۔مثلاً ابتدا میں محمد حسین آزاد نے اپنے مقدمے میں اردو زبان اور اردو شاعری کی تاریخ بیان کی ہے۔حکیم صاحب نے بھی مقدمے میں چند صفحوں میں اردو نثر کی تاریخ کے اضافوں کے ساتھ اردو زبان اور اردو شاعری کی تاریخ بیان کی۔نثری تاریخ کے اضافے پر گیان چند جین کا یہ اعتراض ہے کہ ’’اردو شاعری کی تاریخ میں اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔‘‘ بہر حال مقدمے کے بعد کتاب کو تین طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے۔طبقۂ متقدمین،طبقۂ متوسطین،طبقۂ متاخرین،اور ہر طبقے میں تین تین دور قائم کیے گئے ہیں۔

میرؔ کے نکات اشعرا سے لے کر محمد حسین آزاد کی کتاب آب حیات تک جتنے تذکرے لکھے گئے ان میں سے اکثر تذکرے ایسے ہیں جن میں اس سے قبل لکھے گئے تذکروں کی تقلید نظر آتی ہے،اور ہر تذکرہ نگار کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان سے قبل لکھے گئے تذکرے میں جو خامیاں اور کمیاں رہ گئی ہیں انہیں دور کرے۔مولف ’’گل رعنا‘‘ نے بھی ’’آب حیات‘‘ کی تقلید کی اور اس کی تاریخی فروگزاشتوں اور کمیوں کو اپنی کتاب سے پورا کرنے اور دور کرنے کی کوشش کی ہے۔آب حیات میں جن مشہور شعرا کو نظر انداز کر دیا گیا تھا یا کسی اور وجہ سے انہیں شامل نہیں کیا گیا تھا مولوی عبدالحئی نے انہیں اپنے تذکرے میں جگہ دی

ہے۔ان کے حالات لکھے ہیں اوران کی شاعری پر نقد وتبصرہ بھی کیا ہے۔

گل رعنا کے بارے میں مولوی عبدالحق کا یہ کہنا کہ اس کتاب میں تنقید کے اعلیٰ نمونے موجود نہیں، کچھ حد تک درست معلوم ہوتا ہے۔لیکن سچ تو یہ ہے کہ مولف نے اپنی کتاب میں کہیں اس کا دعویٰ بھی نہیں کیا ہے کہ یہ کتاب تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہے،اوراس میں وہ تنقید کے ان اعلیٰ معیاروں کی پیروی کریں گے جو اس وقت تک رائج تھے۔تحقیقی اعتبار سے گل رعنا میں کچھ کمیاں ہیں لیکن اس زمانے میں اس سے زیادہ بہتر کام کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی، کیوں کہ مولف کے سامنے وہ مواد نہ تھا جوان کے اخلاف کے حصے میں آیا،ا ن کا سب سے بڑا ماخذ آب حیات ہے۔لیکن انہوں نے مواد کی کمی کے باوجود جس طرح اس اوّلین تاریخ کے بعض تسامحات اور عدم توازن کی نشان دہی کی ہے وہ قابل داد ہے۔

''شعرالہند'' مولانا عبدالسلام ندوی کی وہ تصنیف ہے جوان کی زندگی اور ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔یہ پہلی کتاب ہے جس میں اردو شاعری اوراس کی مختلف اصناف کے تاریخی و ادبی ارتقا سے بحث کی گئی ہے۔کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔پہلی جلد میں چار ابواب ہیں۔پہلے باب میں اردوشاعری کے آغاز سے بحث کی گئی ہے۔اس کے بعد قدما کا پہلا دور شروع ہوتا ہے جس میں اردو شاعری کی تجدید اور اصلاح کا ذکر ہے۔دوسرے دور میں میر تقی میؔر اور مرزا سودا کے کلام کا موازنہ کیا گیا ہے۔تیسرے دور میں لکھنوی شاعری کے آغاز پر بحث کی گئی ہے اور مصحفی و انشا کا مقابلہ کیا گیا ہے۔اس بحث کے بعد ،تلامذۂ شعرائے قدیم،کا عنوان قائم کیا گیا ہے جس میں خان آرزو،مرزا مظہر،میر سوز،انشا،جرأت،میر حسن وغیرہ کے مختصر حالات اور ان کی شاعری کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔''متبعین شعرائے قدیم'' کا عنوان قائم کر کے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کون کون شعرا نے کن کن شعرا کا تتبع کیا ہے۔دوسرے باب میں متوسطین کے پہلے دور کا ذکر ہے اس کی ابتدا شیخ ناسخ سے ہوتی ہے۔اس میں تفصیل سے یہ بتایا گیا ہے کہ شیخ ناسخ نے زبان میں کیا کیا تبدیلیاں کیں اور اس سلسلے میں ایک آخری تبدیلی الفاظ کی ہے جس کی ایک طویل فہرست ''جلوۂ خضر'' سے نقل کی گئی ہے۔اس کے بعد ''اردوشاعری کے دومختلف اسکول'' کے تحت دلّی اور لکھنؤ کی خصوصیات کلام تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔

شعرالہند اردو کی ان کتابوں میں سے ہے جس کے بارے میں آج تک یہ حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکا کہ یہ

'تذکرہ' ہے، یا 'تنقید'۔اسم بامسمیٰ ہے یا بے مسمیٰ ؟اس کوتحقیق سے کوئی نسبت ہے یا نہیں؟اس کی ادبی قدر و قیمت ہے یا تاریخی ،اگر ادبی قدر و قیمت ہے تو کیا ہے؟ یا اگر تاریخی قدر و قیمت کی حامل ہے تو اس کا مقام ومرتبہ کیا ہے؟ بعض ناقدین اسے محنت ومشقت سے لکھی ہوئی ایک کتاب سمجھتے ہیں اور بعض اسے دوسروں کے اقوال وآرا کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔وہ حضرات جو اس تنقید وتنقیص میں سب سے آگے ہیں ان میں مولوی عبد الحق ،نصیر الدین ہاشمی، نیاز فتح پوری اور کلیم الدین احمد کے نام خصوصاً لیے جا سکتے ہیں۔ان سب کے اعتراضات مختلف قسم کے ہیں ،لیکن ایک عام اعترض یہ ہے کہ شعرالہند میں ''جلوۂ خضر''،''نکات الشعرا''،''آب حیات''،''مقدمہ شعروشاعری''،''شعرالعجم ''کے اس کثرت سے اقتباسات دیے گئے ہیں کہ خود مولانا کی رائے کہیں پر بھی نہیں آسکی ہے،اور گر کوئی رائے حقیقی معلوم ہوتی ہے تو غور وفکر سے پتا چلتا ہے کہ وہ کسی پیش رو کی رائے کی تلخیص ہے۔بہر حال ان اعتراضات سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شعرالہند ان تمام ناقدین کی توجہ کا مرکز بنی رہی تھی اور آج بھی ہے جو ادبیات کو جدید فلسفہ،سماجیات اور نفسیات کے آلے سے جانچتے، پرکھتے ہیں۔اس کا بہت واضح مطلب ہے کہ شعرالہند سے اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود یہ ناقدین حضرات اس سے صرف نظر نہیں کر سکتے ،اور جس کتاب سے ناقدین کا بہت بڑا گروہ صرف نظر نہ کر سکے تو اس کتاب کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔

باب چہارم ''اردو ادب کی مختصر تاریخوں سے متعلق تنقید کا محاکمہ'' کے عنوان سے ہے۔رام بابو سکسینہ سے لے کر عصر حاضر تک چھوٹی بڑی مختلف قسم کی کئی ادبی تاریخیں معرض وجود میں آچکی ہیں۔ان میں بعض ادبی تاریخیں ایسی ہیں جن میں پورے اردو ادب کا جائزہ لیا گیا ہے،اور بعض ایسی ہیں جو کسی خاص پہلو یا ایک حصے پر مشتمل ہیں۔مثلاً اصناف سے متعلق تاریخیں ،مختلف علاقوں کے اردو ادب کے جائزے پر مبنی تاریخیں،اسی طرح مختلف ادوار، رجحانات یا تحریکات سے متعلق تاریخیں وغیرہ۔چوں کہ میرے تحقیقی مقالے کا موضوع اردو ادب کی مختصر تاریخ کے جائزے پر مبنی ہے اس لیے زیر بحث باب میں صرف ان نمائندہ ادبی تاریخوں کو شامل کیا گیا ہے جن میں خاصی حد تک تاریخی تسلسل کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے،اور ادب کے دونوں پہلوؤں یعنی شاعری اور نثر کو مساوی اہمیت دے کر ان کا اجتماعی جائزہ لیا گیا ہے۔لہٰذا اس باب میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں۔

تاریخ ادب اردو- رام بابو سکسینہ

اے ہسٹری آف اردو لٹریچر- گراہم بیلی

مختصر تاریخ ادب اردو- ڈاکٹر سید اعجاز حسین

اردو ادب کی تاریخ-نسیم قریشی

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ- ڈاکٹر سلیم اختر

اردو ادب کی مختصر تاریخ- ڈاکٹر انور سدید

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ-سید احتشام حسین

تاریخ ادب اردو(ادارہ ادبیات اردو،حیدر آباد)

رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب پہلی ایسی کتاب ہے جسے ناقدین نے باضابطہ ادبی تاریخ کہا ہے۔ یہ کتاب رام بابو سکسینہ نے انگریزی زبان میں ''اے ہسٹری آف اردو لٹریچر'' کے نام سے لکھی تھی، جو پہلی بار رام نرائن لال پریس۔الہ آباد سے ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ دو سال بعد ۱۹۲۹ء میں اس کتاب کا اردو ترجمہ مرزا محمد عسکری نے کیا اور ترجمہ نول کشور پریس سے اسی سال شائع ہوا۔آغا محمد باقر نے ۱۹۳۳ء مذکورہ کتاب کی تلخیص کی جو''تاریخ نظم ونثر اردو'' کے نام سے شیخ مبارک علی سنز،لاہور سے شائع ہوئی۔

رام بابو سکسینہ کی انگریزی کتاب کے ترجمے اور تلخیص کی اشاعت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع،مواد،مواد کی ترتیب و پیش کش اور تنقیدی نوٹ کے اعتبار سے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔اس کتاب میں پہلی بار نظم اور نثر دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔رام بابو سکسینہ نے تمہید میں جو دعویٰ کیا ہے کہ یہ تاریخ مکمل طور پر ادبی تاریخ کے اصول وضوابط پر پوری اترتی ہے اور اس میں محض کسی زمانے کے واقعات کا ایک ذخیرہ نہیں، بلکہ ان خیالات وخصوصیات کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کا اثر اس زمانے پر تھا۔ان کا یہ دعویٰ کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں۔یہ تاریخ آب حیات سے قدرے بہتر ضرور ہے ،مگر اس میں زیادہ زور سوانحی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے اسے پرکھنے پر دیا گیا اور ان کی تقسیم بھی غیر سنجیدہ ہے۔کہیں زمانے کو ملحوظ رکھا ہے تو کہیں علاقے کو۔اس کے علاوہ اس میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ہر دور کی شاعری اور نثر کا ذکر یکجا نہیں کیا گیا ہے بلکہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ایک حصہ شاعری کی

تاریخ پر اور دوسرا حصہ نثر کی تاریخ پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ کتاب میں کچھ خامیاں بھی ہیں جن کی نشان دہی بزرگ محقق ڈاکٹر مختارالدین آرزو نے اپنے ایک پر از معلومات تحقیقی وتنقیدی مقالے ''تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ'' مشمولہ ادبی دنیا، لاہور بابت دسمبر ۱۹۴۰ء میں کی ہے۔اس طویل مقالے کے پہلے حصے میں ڈاکٹر آرزو نے ان اغلاط سے بحث کی ہے جو کتاب پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی کھٹکنے لگتی ہیں ۔انہوں نے صرف اغلاط کی نشان دہی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی تصحیح بھی کی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مجموعی حیثیت سے آج جب اس کتاب کو دیکھا جائے تو اس کے اندر وہ تمام چیزیں نظر آتی ہیں جو ایک ادیب کی معلومات کے لیے سرمایۂ ناز ہیں۔

گراہم بیلی کی تاریخ ''اے ہسٹری آف اردو لٹریچر'' انگریزی زبان میں تاریخ ادب اردو کے ضمن میں پہلی کوشش ہے، اور اولین کوشش کے حوالے سے اس کتاب کی اہمیت بذات خود بڑھ جاتی ہے۔گراہم بیلی کے علاوہ دوسرے مستشرقین نے بھی مختلف شعرا و ادبا پر مضامین لکھے ہیں جن کے ذریعے اردو کے قارئین جدید ادبی تاریخ کے تصور سے متعارف ہوئے ،مگر گراہم بیلی کا شمار ان چند مستشرقین میں کیا جاتا ہے جنھوں نے پوری ایمان داری کے ساتھ برصغیر کے ادب ،لسانیات اور بالخصوص اس کی تاریخ کو اپنی زبان میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔''اے ہسٹری آف اردو لٹریچر'' اسی نوعیت کی ایک تصنیف ہے، جس کی تاریخی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۲ء میں منظر عام پر آئی ۔اس کتاب کا اردو ترجمہ اردو ادب کی تاریخ کے نام سے ۱۹۹۳ء میں ترقی اردو بیورو، دہلی سے شائع ہوا، جس کے مترجم و مرتب سید محمد عصیم ہیں۔ جائزے کے لیے میرے پیش نظر یہی کتاب رہی۔

بیلی کی یہ تاریخ انتہائی مختصر ہے اور اس کے مختصر ہونے کی وجہ اس کتاب کے مترجم اپنے مقدمے میں یہ بیان کرتے ہیں کہ گراہم بیلی نے یہ کتاب آکسفورڈ پریس کی ''ہیری ٹیج آف انڈیا سیریز'' کے لیے لکھی تھی، چوں کہ اس سلسلے کے تحت اختصار پر ترجیح دی جاتی تھی ،اس لیے گراہم بیلی نے اردو زبان و ادب کی تاریخ کو ایک سو بیس صفحات میں محدود کر دیا۔ظاہر ہے کہ اتنے کم صفحات میں اردو ادب کی تقریباً چھ سو سالہ تاریخ اور روایت کے ایک طویل تسلسل کا احاطہ کر لینا ناممکن نہیں مگر مشکل ضرور ہے۔اسی اختصار کی وجہ سے بیلی کی تاریخ کو چشم کم سے دیکھا گیا، لیکن اس کی کثرت مواد کو دیکھا جائے تو یہ دو، تین سو صفحوں کی

کتاب سے کم نہیں۔

سید اعجاز حسین کی کتاب ''مختصر تاریخ ادب اردو'' خاص طور پر طلبا کی ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی۔ لیکن ان کی دقیق بینی نے سہل انگاری کی راہ سے انہیں دور رکھا۔ انہوں نے مختصر، مگر جامع انداز میں مختلف ادوار کی تقسیم کر کے سماجی و سیاسی محرکات اور شاعری کے محاسن پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں منظر عام پر آیا۔ بعد ازاں کتاب کی مقبولیت کے سبب اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس کتاب کی ترتیب تقریباً وہی ہے جو رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب کی تھی۔ مثلاً نظیر اکبر آبادی کے لیے الگ باب مختص کرنا ، ناول، صحافت اور تنقید وغیرہ کے عنوانات قائم کرنا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری ترتیب رام بابو سکسینہ کے زیر اثر تشکیل پائی۔ بہر حال اعجاز حسین کی تاریخ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ترمیم شدہ ۱۹۶۴ء والے ادیشن میں اس وقت تک کے اکثر مشہور شاعروں اور نثر نگاروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت وافادیت اس دور میں چھپنے والی دوسری تاریخی کتابوں سے زیادہ ہے۔

نسیم قریشی کی کتاب ''اردو ادب کی تاریخ'' کا پہلا ایڈیشن آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ بعد میں اس کی اشاعت کی ذمہ داری فرینڈس بک ڈپو، علی گڑھ نے سنبھالی۔ کتاب کی ابتدا میں چند سطروں کا دیباچہ ہے جس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ''یہ کتاب خاص طور پر طالب علموں کی ضرورت کو نگاہ میں رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ اس مختصر تاریخ میں نہ ادبی رجحانات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی اور نہ تمام قابل لحاظ ارباب فن کا تذکرہ ہے۔ یہ تاریخ ادب ۱۹۵۵ء میں نصابی ضروریات کے لیے یقیناً کافی رہی ہوگی، مگر آج کے دور میں یہ نصابی ضروریات کو بھی پورا نہیں کر سکتی۔ اس تاریخ کا انداز تذکروں جیسا ہے، یعنی شاعر یا نثر نگار کے نام کے بعد مختصراً ان کے کام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کسی ادیب یا شاعر کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا ہے، اور نہ ہی کسی کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ البتہ کہیں کہیں مصنف نے ادوار پر مجموعی تبصرہ کرتے ہوئے اس دور کے سیاسی و سماجی پس منظر کو مد نظر رکھا ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب تاریخ ادب کے زمرے میں شامل ہو جاتی ہے، لیکن محققین کے لیے یہ تاریخ کسی نوعیت کے اضافے کا باعث نہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کا پہلا ایڈیشن ستمبر ۱۹۷۱ء میں سنگ میل

پبلی کیشنز اردو بازار، لاہور سے شائع ہوا۔اس کے بعد تقریباً بارہ ایڈیشن اسی ادارے سے شائع ہوئے، اور ہر ایڈیشن میں مصنف کچھ حذف و اضافہ کرتے رہے۔اس کا آخری ایڈیشن سنگ میل پبلی کیشنز سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔اس ایڈیشن کے بعد مصنف نے اپنی کتاب میں کوئی ترمیم و اضافہ نہیں کیا۔ چنانچہ اس آخری ایڈیشن کے بعد پچھلے تمام ایڈیشن غیر اہم ہو جاتے ہیں۔تبصرے کے لیے میرے پیش نظر یہی آخری ایڈیشن ہے جو کتابی دنیا، دہلی سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔اس تاریخ کا خاکہ روایتی تاریخوں سے تھوڑا مختلف ہے۔ پہلے پانچ ابواب تمہید کے طور پر ہیں جن میں لسانی مباحث کا جائزہ اور اصناف کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ جب کہ چھٹے باب سے مصنف اپنی سہولت کے مطابق تقسیم کر کے اردو ادب کے با قاعدہ جائزے کا آغاز کیا ہے، جس میں ادوار بھی ہیں، جیسے جنوبی ہند میں اردو ادب، شمالی ہند میں اردو ادب، علاقائی رنگ بھی ہے جیسے لکھنؤ کا دبستان شاعری، دہلی کے نامور شعرا، پاکستان میں اردو ادب وغیرہ۔تحریکیں بھی ہیں جیسے سرسید تحریک، ترقی پسند ادب کی تحریک، اسی طرح اصناف کا ذکر مثلاً اردو نثر کا ظہور، داستاں سرائی (جس میں تمام مشہور و معروف داستانوں کا ذکر ہے۔) مرثیہ عہد بہ عہد وغیرہ۔ یوں چار صدیوں کی پوری تاریخ کو مختلف حصوں میں بانٹ کر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ کتاب مقبول عام ہونے کے ساتھ ساتھ بقول مصنف متنازع تاریخ بھی رہی ہے۔اس میں جہاں ابتدائی ادوار کا جائزہ لیا گیا ہے وہیں معاصر ادب کا بھی مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے، اور غالباً یہی وجہ کتاب کے متنازع ہونے کی رہی۔ معاصر ادب اور ادبی رویوں پر لکھنا یوں بھی مشکل کام ہے، بلکہ ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔اس لیے وہ خود کو داد کا مستحق سمجھتے ہیں۔انھوں نے بڑی جرأت و ہمت سے اس مشکل کام کو سرانجام دیا ہے۔اس سے پہلے لکھی جانے والی تمام تاریخیں صرف کلاسیکی ادب کے جائزے پر مبنی ہیں، اور سبھی تاریخ نگاروں نے معاصر ادب کا بھاری بھر کم بوجھ دیکھ کر چھوڑ نے دینے میں ہی عافیت محسوس کی۔مگر یہ بوجھ کسی نہ کسی کو تو اٹھانا ہی تھا، اور اس کی ابتدا سلیم اختر نے کی۔اس کتاب میں کچھ کمیاں اور خامیاں بھی ہیں، مگر ان کی وجہ سے کتاب کی اہمیت وافادیت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' پہلی بار مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد سے

١٩٩١ء میں شائع ہوئی۔اس کے بعد اس کتاب کے کئی اور ایڈیشن منظر عام پر آ چکے ہیں۔میرے پیش نظر اس کتاب کا پہلا ایڈیشن رہا ہے، جسے سامنے رکھ کر کتاب کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔کتاب ١٣/ ابواب پر مشتمل ہے اور یہ تمام ابواب زیادہ تر زمانی دور کے مطابق ہیں۔مورخ ادب کے ساتھ بڑا مسئلہ یہ رہا ہے کہ تاریخ کے ابواب دور کے اعتبار سے دیئے جائیں ،تحریکات یا رجحانات کے اعتبار سے دیئے جائیں یا اصناف کے اعتبار سے۔ان میں سے کسی ایک کو ملحوظ خاطر رکھیں تو دوسرے تقاضے مسخ ہو جاتے ہیں۔زیر بحث تاریخ میں مصنف نے زمانی تسلسل کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے ،مگر ہر زمانی دور میں انہوں نے جو تقسیم کی ہے اس میں کہیں رجحانات ، کہیں تحریکات اور کہیں اصناف کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔یوں ایک زمانی دور میں موجود اصناف اور ان کے حوالے سے مشہور افراد کا جائزہ سامنے آ جاتا ہے۔اس کتاب میں جہاں چند خامیاں ہیں وہیں کچھ خوبیاں بھی ہیں۔مثلاً انور سدید کسی دور، واقعہ یا شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو ساتھ ہی اس پر اپنی رائے یا تبصرہ بھی پیش کرتے ہیں ،جس سے کسی بھی واقعے یا ادوار کو سمجھنے میں قارئین کو مدد ملتی ہے۔کتاب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں معاصر ادب پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے جس کا فائدہ یہ ہے کہ آئندہ مورخین کے لیے سماجی حالات میں نئی تاریخ رقم کرنے کے لیے اچھے خاصے مواد مل جائیں گے۔

''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' یہ کتاب سید احتشام کی وفات (١٩٧٢ء) سے قبل تیار ہو چکی تھی ،لیکن اس کی اشاعت ان کی وفات کے دس سال بعد ہوئی۔اس کا پہلا ایڈیشن ترقی اردو بیورو، دہلی نے ١٩٨٣ء میں شائع کیا،اور دوسرا ایڈیشن ١٩٨٨ء میں۔مزید دو اور ایڈیشن اس ادارے سے شائع ہوئے۔٢٠٠٤ء میں اس کا پانچواں ایڈیشن قومی کونسل سے شائع ہوا۔٢٠١١ء میں اس کا آٹھواں ایڈیشن اسی ادارے سے شائع ہوا،اور جائزے کے لیے یہی ایڈیشن میرے پیش نظر ہے۔کتاب چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔جس میں مختلف عنوانات کے تحت مصنف نے اردو زبان و ادب کی ابتدائی تاریخ ،شمالی و جنوبی ہند کے سماجی ، سیاسی ، تاریخی اور ادبی حالات کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

یہ کتاب دیگر ادبی تاریخوں سے کافی حد تک مختلف ہے۔اگر چہ کتاب کا خاکہ،ابواب کی تقسیم روایتی تاریخوں کے مطابق ہے ،مگر حالات و واقعات کا بیان اور ان کے نتائج روایتی تاریخوں سے خاصے الگ ہیں۔احتشام حسین نے حالات و واقعات کو بیان کرنے میں سادہ بیانی کے بجائے تنقیدی انداز اپناتے

ہوئے ادبی تخلیقات پر سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے اثرات کو بیان کیا ہے۔اس کتاب کے مختلف ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ موضوع کے اعتبار سے یہ تنقیدی تاریخ ہے اور اس میں پہلے سے معلوم تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے۔لہٰذا اس میں کسی نئی معلومات یا گمشدہ کڑیوں کا سراغ نہیں ملتا۔

پانچواں باب ''اردو ادب کی طویل تاریخوں سے متعلق تنقید کا محاسبہ'' کے عنوان سے ہے۔اردو میں زبان وداب کی تاریخ کی ایک درجن سے زائد کتابیں لکھی گئی ہیں۔رام بابو سکسینہ سے لے کر ڈاکٹر تبسم کاشمیری تک جو تاریخیں لکھی گئی ہیں وہ زبان وادب کی تاریخ کو سمجھنے میں بڑی معاون ہیں۔بعض مورخین نے طلبا کے معیار و مزاج کے مطابق مختصر ادوار کی تاریخیں لکھی ہیں تو بعض نے مفصل۔پچھلے باب میں اردو ادب کی مختصر تاریخوں سے متعلق تنقید کا محاکمہ کیا گیا تھا۔اس باب میں اردو ادب کی طویل تاریخی کتابوں کا محاسبہ بہ اعتبار سنین پیش کیا گیا ہے۔یوں تو اردو ادب کی طویل تاریخوں کی بھی ایک طویل فہرست ہے،مگر اس باب میں ان سب کا احاطہ ممکن نہیں،ان میں سے چند اہم ادبی تاریخیں مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اردو'' (مکمل جلدیں) پروفیسر سیدہ جعفر و پروفیسر گیان چند جین کی ''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک'' (مکمل جلدیں) اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ''اردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک'' اس باب میں شامل ہیں،جن کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔

''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' کی پہلی جلد ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔اس تاریخ میں کل سات باب ہیں،جن میں ۱۲۰۰ء سے لے کر ۱۷۰۰ء تک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔کتاب کے آغاز میں پروفیسر آل احمد سرور کی تحریر کردہ تمہید ہے،جس میں وہ تاریخ ادب کے مکمل منصوبے کی تفصیلات بیان کرتے ہیں۔اس تمہید کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۹۵۵ء میں شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کو ''تاریخ ادب اردو'' تحریر کرنے کا ایک منصوبہ بھیجا جو ۱۹۵۶ء میں منظور ہو گیا اور اس کے لیے معقول رقم عطا کی گئی۔ مارچ ۱۹۵۷ء میں ایک کمیٹی بلا کر پانچ جلدوں کی اسکیم بنائی گئی اور اس کے مختلف ابواب،مختلف مشاہیر ادب کے سپرد کیے گئے۔اس وقت کے صدر شعبہ رشید احمد صدیقی ڈائرکٹر اور نذیر احمد اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔یکم مئی ۱۹۵۸ء کو رشید احمد صدیقی کی سبک دوشی کے بعد آل احمد سرور صدر شعبہ اور اسکیم کے ڈائرکٹر

مقرر ہوئے ۔اگست ۱۹۵۸ء میں نذیر احمد اپنا کام انجام دے کر اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدے سے الگ ہو گئے ۔نومبر ۱۹۵۸ء میں مجنوں گورکھ پوری اس اسکیم کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر مقرر ہوئے ۔ یہ تاریخ ایک ضخیم منصوبے کا حصہ تھی ، جو بہت سی وجوہ کی بنا پر مکمل نہیں ہوسکی ،اور اس پہلی جلد کو بھی رشید حسن خاں کے جارحانہ تبصرے کی وجہ سے مارکیٹ سے اٹھالیا گیا۔ یہ کتاب ایک مصنف کا کارنامہ نہیں بلکہ اس کے اجزا مختلف ماہرین نے لکھے ہیں۔تحقیق میں اختلاف رائے جائز ہے۔ایک محقق کسی واقعے کا جو سنہ قرار دیتا ہے دوسرے کی رائے میں کوئی اور سنہ درست ہوسکتا ہے۔ ہر باب یا جز کے ساتھ اس کے مصنف کا نام درج ہے ۔اس کے ہر بیان کی ذمہ داری اس کے مصنف پر ہے۔اگر ڈائرکٹر یا اسسٹنٹ ڈائرکٹر مضمون نگار کی تحریر میں ترمیم کرتے تو وہ تحریف قرار دی جاتی۔قاری کو آزادی ہے کہ وہ کسی سنہ وفات کے بارے میں دو مضمون نگاروں کی دی ہوئی مختلف تاریخوں میں سے جسے چاہے قبول کرے۔البتہ ادارے کے ذمہ داروں کو چاہیے تھا کہ اختلافی بیانات کے نیچے فٹ نوٹ میں اپنی رائے دے کر آخر میں صراحت کر دیتے۔

’’علی گڑھ تاریخ ادب اردو‘‘ تقریباً ۴۰ سال قبل شائع ہوئی تھی۔لہٰذا اس میں اپنے دور تک کی ہی معلومات شامل ہوں گی جو یقیناً اب اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد نئی معلومات کی روشنی میں اپنی حیثیت و اہمیت کھو بیٹھی ہے۔اس لیے اسے آج سے تقریباً ۴۰ سال پرانے معیار کی روشنی میں ہی پرکھنا چاہیے اور اس میں در آئے تسامحات کی سخت گرفت نہیں کرنی چاہیے۔کتاب میں جو غلطیاں طباعت کی تھیں ،انہیں بھی رشید حسن خاں نے محققین کے نامۂ اعمال میں درج کر دیا۔ بہرحال اس تاریخ کو بازار سے اٹھا لینے کے بجائے بہتر ہوتا کہ اس کے اگلے ایڈیشن میں وہ تمام خامیاں دور کر دی جاتیں تا کہ تاریخ ادب کے قارئین اس سے استفادہ کر سکتے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی ’’تاریخ ادب اردو‘‘ چار جلدوں پر مشتمل ہے۔اس باب میں چاروں جلدوں کا باری باری جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اس تاریخ کی پہلی جلد جو آغاز سے لے کر ۱۷۵۰ء تک کے قدیم ادب کے جائزے پر مبنی ہے ، پہلی مرتبہ ۱۹۷۵ء میں مجلس ترقی ادب اردو، لاہور سے شائع ہوئی ،اور یہی جلد ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،دہلی سے پہلی مرتبہ ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔جلد دوم ۱۹۸۲ء میں ،جلد سوم ۲۰۰۶ء میں مجلس ترقی ادب، لاہور سے شائع ہوئی۔جلد چہارم انیسویں صدی کے نصف آخر کے جائزے

پر مبنی ہے۔ یہ جلد دو حصوں میں پہلی مرتبہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوئی۔

ان جلدوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کے علم و فضل، دیدہ ریزی اور محنت و لگن کا جو احساس ہوتا ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ جو کام بڑے بڑے ادارے، انجمن اور بورڈ نہیں کر پائے ،جمیل جالبی نے وہ کام تن تنہا سرانجام دیا ہے۔اس کام کے لیے انہیں کن دشوار مراحل سے گزرنا پڑا اس کی تفصیل انہوں نے پہلی جلد کے پیش لفظ میں بیان کی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تاریخ میں صرف سیاسی پس منظر یا ادبی پس منظر بیان نہیں کرتے بلکہ ہر دور کا سیا سی ،تہذیبی ،معاشرتی پس منظر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی پس منظر پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں۔کسی دور کے ادب پر اس دور کے سیاسی ،معاشرتی حالات و واقعات کے کیا اثرات مرتب ہوئے اس کا بیان جمیل جالبی بڑی وضاحت سے کرتے ہیں۔انہوں نے تاریخ لکھنے کے طریق کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نے بہت سے مخطوطات اور نایاب کتابوں کی تلاش و تحقیق کے بعد شعرا وا دبا کا تعارف پیش کیا ہے۔اس تلاش و جستجو کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا ہے کہ وہ درست اور غلط روایات میں امتیاز بر قرار رکھنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ساتھ ہی عہد پارینہ کے ادبی فن پاروں کے تعارف و تبصرے میں گہری تنقیدی بصیرت کی مدد سے اس فن پارے اور اس کے تخلیق کار کے مزاج و آہنگ کو پیش کرتے ہیں اور اس دور کی شعری روایت کا تفصیلی جائزہ بھی لیتے ہیں۔جالبی کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بالعموم تقابلی جائزہ لینا پسند کرتے ہیں۔مختلف شعرا و ادبا کے اسلوب اور فن پاروں کی فنی و لسانی خصوصیات کا ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے ان کی مشترک خصوصیات ،اختلافات اور اہمیت بیان کرتے ہیں،جس کی وجہ سے پوری صورت حال سامنے آجاتی ہے،اور ادبی روایت میں ان کی قدر و قیمت کا تعین آسان ہو جاتا ہے۔یہ خصوصیت دیگر ادبی تاریخوں میں موجود نہیں ہے۔

یہ مفصل ،مکمل اور مستند تاریخ فرد واحد کی کامیاب کوشش کا بہترین نتیجہ ہے۔ایسی ضخیم اور مستند تاریخ کئی سالوں کی محنت شاقہ کے بعد اور کئی لوگوں کی مدد سے تشکیل پاتی ہے،لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ جمیل جالبی نے تن تنہا اس مشکل امر کو انجام دیا ہے۔اس تاریخ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے حتی الامکان اصل ماخذ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔اصل متون اور مخطوطے تلاش کر کے ان سے

معلومات حاصل کیں اوران سے اپنی تاریخ کو معتبر بنایا ہے۔ بقول ڈاکٹر گیان چند جین کوئی محقق ایسا نہ ہوگا جسے اس کے مطالعے سے متعدد نئی معلومات نہ ملیں، کوئی نقاد ایسا نہ ہوگا جسے اس کے تنقیدی بیانات سے رہبری وروشنی نہ ملے۔

پانچ جلدوں پر مشتمل ''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک'' دو مورخین یعنی پروفیسر سیدہ جعفر اور پروفیسر گیان چند جین کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے جو ۱۹۹۸ء میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس تاریخ میں بظاہر بارہ ابواب ہیں اوران بارہ ابواب میں اردو کے آغاز سے لے کر ۱۷۰۰ء تک کے ادب کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ابرار عبدالسلام نے اپنے طویل مقالے ''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک ...... تحقیق کے آئینے میں'' مذکورہ مصنفین کی تاریخ کی پانچوں جلدوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اوراس میں موجود تحقیقی تضادات، غلط منصوبات، تحقیقی تسامحات اور سنین کے اغلاط کی نشان دہی اور تصحیح کی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے صرف پہلی جلد سے سنین کے اغلاط کی ۱۳۶ مثالیں پیش کی ہیں۔ علاوہ ازیں سینکڑوں تحقیقی تسامحات، تضادات، متنی اور تاریخی اغلاط کی بھی نشان دہی کی ہے۔

زیر بحث تاریخ کے ہر باب کے ابتدا میں سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر بیان کیا گیا ہے، کہیں کہیں یہ پس منظر بہت طویل ہوگیا ہے جو ایک تاریخی کتاب کے حسب حال نہیں، مگر اس سے اس دور کے ماحول با لخصوص دکنی ماحول اور ادب کو سمجھنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر سیدہ جعفر جہاں ادبی پس منظر بیان کرتی ہیں وہیں ادبی روایات کا ذکر بھی تفصیل سے کرتی ہیں جس سے سارا ادبی ماحول سامنے آجاتا ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحبہ کا اسلوب بھی منطقی اور سلجھا ہوا ہے۔ وہ اپنی بات بہت ہی سادہ اور دل نشیں انداز میں پیش کرتی ہیں جس سے قاری کو ان کی بات سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آتی۔ وہ تاریخی مغالطوں کو ٹھوس دلائل کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کرتی ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں تحقیق کا ذوق بھی ہے اور شوق بھی، اور یہی ذوق وشوق کتاب کی اہمیت افادیت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ''اردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک'' پہلی مرتبہ ۲۰۰۳ء میں سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کا پہلا ہندوستانی ایڈیشن ۲۰۰۶ء میں ایم.آر پبلی کیشنز، نئی دہلی سے

شائع ہوا۔تین سال کے وقفے کے بعد ۲۰۰۹ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن ایم.آر پبلی کیشنز سے ہی شائع ہوا۔راقم کے پیش نظر یہی تیسرا ایڈیشن ہے۔ یہ کتاب ۸۹۲صفحات اور ۱۹/ ابواب پر مشتمل ہے جو تقریباً ساڑھے آٹھ سو سالہ ادوار کو محیط ہے۔ابتدا میں پیش لفظ ہے جس میں اردو زبان و ادب کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔نیز بیسویں صدی میں تاریخ نگاری میں جو تبدیلیاں رونماں ہوئی ہیں اس بابت بھی اہم گفتگو کی گئی ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی یہ تاریخی کتاب اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے۔اس میں روایتی تواریخ ادب کا رنگ بہت کم ملتا ہے۔البتہ ابواب بندی میں یہ کتاب اپنے ماقبل لکھی گئی تاریخی کتابوں جیسی ہی ہے۔مگر ان ابواب کے بیان کا انداز جداگانہ ہے۔اس تاریخ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تاریخ کے زمانی تسلسل کو مختلف ادوار کی اکائیوں میں تقسیم نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ایک خاص ترتیب و تنظیم اس کی خاکہ بندی میں بروئے کار لائی گئی ہے۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی شاعر یا اس کے فن پارے کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس سے متعلق تفصیل سے یہ معلومات فراہم کرتے ہیں کہ وہ کب منظر عام پر آیا اور کس محقق کی تلاش وجستجو کا نتیجہ ہے اور تنقید ادب میں اس کا کیا مقام ہے۔علاوہ ازیں کسی شاعر یا ادیب کا مرتبہ متعین کرتے ہوئے اس کے متعلق پہلے سے موجود معلومات و آرا کا بھی تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اور ساتھ ہی اپنی ذاتی رائے بھی دیتے ہیں جو حسب حال ہوتی ہے۔اکیسویں صدی کے ادب کے لیے یہ تاریخ اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر قابل قدر ہے جس سے ہر قاری کے علم میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوگا۔

مختصر یہ کہ ادبی تاریخ کو نہ محض ادبی فن پاروں کی جمالیاتی کیفیت یا سوانحات کا مجموعہ ہونا چاہیے نہ تنقیدی مضامین کا،اور نہ یہ صرف بدلتے ہوئے مذاق سخن کی دستاویز ہو، بلکہ اسے ایک فعال اور متحرک فن کی داستان ہونی چاہیے۔اس بے جان چیز میں روح ڈالنے کے لیے مورخ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ زبان و ادب کی نشو ونما کے ساتھ ان کے پیچھے بدلتے ہوئے حالات ومحرکات بھی پیش کرے۔ادب میں کسی تخلیق یا تخلیق کار کا مقام متعین کرنا چاہے تو اس کے ثقافتی اور تہذیبی پس منظر کو سامنے رکھ کر تجزیہ کرے اور یہ دیکھنے کی کوشش کرے کہ مختلف سیاسی،سماجی،تہذیبی یا علمی اداروں نے تخلیق کار یا اس کی تخلیق پر کیا اثر ڈالا ہے۔مورخ اگر بیسویں یا انیسویں صدی کی تاریخ لکھ رہا ہے تو اسے نہ صرف متعلقہ دور بلکہ اس سے

پہلے ادوار کی تمام تر ادبی، سیاسی، سماجی اقدار کے بارے میں معلومات ہونی چاہیے۔یعنی ان ادوار کے سماجی و معاشی حالات کیا تھے؟ ان مختلف ادوار میں مختلف اصناف کی اہمیت کیا تھی۔اسی طرح یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ مورخ بھی اپنے دور، اپنے ماحول اور اپنے سماج کے رجحانات سے متاثر ہوتا ہے۔وہ اپنے آپ کو غیر جانب دار رکھنے کی لاکھ کوشش کرے مگر ادیب اور اس کی تحقیق کی معیار بندی میں وہ اپنے دور کے رجحانات اور نظریات سے متاثر ہو کر ہی تاریخ لکھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ادبی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت ہم ایک ساتھ کئی دور کے ذہنوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔اس میں ایک دور تو وہ ہے جس کی تاریخ بیان کی جارہی ہے اور جس کے ادبی کارناموں اور ادبی زبان و بیان میں اس کے ذہن اور اس کے دور کی عکاسی ہوتی ہے۔دوسرا دور مورخ کی تاریخ بیان کررہا ہے۔مورخ کی پسند ناپسند، اس کے اپنے دور اور معاشرہ کی سوچ، زبان و اصطلاحات کی عکاسی اس کی تاریخ کے آئینے میں ہوتی ہے۔ مورخ کے دور میں کن اقدار کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، وہ کن شاعروں اور نثر نگاروں کو زیادہ پسند کرتا ہے اور کیوں؟ ادبی تاریخ انہیں سوالوں کا جواب خوبصورت اور مربوط انداز میں پیش کرتی ہے۔ہمارے کئی اہم مورخین نے ادبی تاریخ نویسی کے تقاضوں کو حسن وخوبی کے ساتھ پورا کیا ہے۔

○

مندرجات

باب اول

تاریخ اور ادبی تاریخ کے چند مباحث

ماضی کے حالات و واقعات معلوم کرنے اور اس کے مطالعے کا شوق دیگر علوم کے مقابلے میں زیادہ پرانا ہے۔ انسان جب لکھنا پڑھنا نہیں جانتا تھا اس وقت سے ماضی کا متلاشی ہے۔ انسان کو اپنے گردوپیش کے حالات سے اس وقت سے دلچسپی ہے جب کہ وہ جنگلوں میں وحشیانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ جوں جوں انسان نے تہذیب وثقافت سے واقف ہوتا گیا اس کا ماضی کے حالات دریافت کرنے کا شوق بڑھتا گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انسان کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ آنے والی نسلیں کہیں ان کے قیمتی تجربات سے محروم نہ رہ جائیں، ان قیمتی تجربات کو محفوظ کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں اور تحریر کا فن ایجاد ہوا۔ پہلے تو قیمتی تجربات سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے، اس کے بعد پتھروں، درختوں کی چھالوں، جانوروں کی کھالوں، پتوں اور پھر صفحۂ قرطاس پر اتارے جانے لگے۔ سبطِ حسن بعض علمائے عمرانیات (ہربرٹ اسپنسر اور گرانٹ ایلین) کا ذکر کرتے ہوئے اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''......کہ مظاہر قدرت کو دیوی دیوتا کا روپ دینے کے لیے جو ذہنی شعور درکار ہوتا ہے ابتدائی انسان اس سے محروم تھا۔ وہ اگر شعور رکھتا تھا تو فقط اپنے اسلاف کا۔ وہ اسلاف ہی کے حقیقی اور فرضی کارناموں سے واقف تھا اور ان کو یاد کرتا رہتا تھا۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ان اسلاف کی حقیقی شخصیتیں روایتوں کے انبار تلے دب گئیں۔ رفتہ رفتہ حقیقت پر خرافات کی اتنی تہیں جم گئیں کہ لوگ اسلاف کی اصل شخصیتوں کو بھول گئے اور افسانوی شخصیتوں کو دیوتا سمجھ کر ان کی پرستش کرنے لگے۔''[۱]

بہرحال اسلاف کی عظمتوں کے افسانوں نے دیوتا کا روپ دھار لیا ہو یا مظاہر قدرت کی فعالی

اورصاحب ارادہ شخصیتوں کا تصور دیوتاؤں کے پیکر میں ڈھل گیا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ ماضی تاریخ بننے سے پہلے اور تاریخ تحقیق بننے سے پہلے محض داستان تھی۔ گزرے ہوئے زمانوں، گزرے ہوئے واقعات، گزرے ہوئے لوگوں کی داستان۔ کچھ کردار حقیقی تھے، کچھ افسانوی، ان دیکھی فوق الفطرت طاقتوں کے کارنامے زیب داستان ہوتے تھے جس کا آج موجودہ دور میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ داستانیں قدیم مصری تہذیب کا اثاثہ تھیں جس میں انسانوں کا ذکر تھا بھی تو ان کی حیثیت ثانوی تھی۔ تاریخ کو تحقیق کے معنی میں استعمال کرنے والا اور انسان اور اس کے ماضی کو موضوع بنا کر تاریخ لکھنے والا پہلا یونانی مورخ ہیروڈوٹس ہے، جسے علم تاریخ کا بانی کہا گیا ہے۔ سید جمال الدین اپنی کتاب ''تاریخ نگاری'' میں لکھتے ہیں:

> ''ہیروڈوٹس پہلا یونانی مورخ ہے جس نے تاریخ کو 'تحقیق' کے معنی میں استعمال کیا اور انسان اور اس کے ماضی کو موضوع بنا کر تاریخ لکھی اور واضح کر دیا کہ داستان اور تاریخ میں بنیادی فرق ہے۔ اول الذکر 'فسانہ' ہے اور آخر الذکر 'تحقیق' فسانہ میں مصنف کی اولین کوشش تاثیر پیدا کرنا ہوتی ہے اور تحقیق طریقۂ فکر ہے اور محقق کا مرکزی خیال یہ بتانا ہوتا ہے کہ اصل میں کیا ہو۔''[۲]

جب دورِ وحشت کا خاتمہ ہوا اور انسانی معاشرہ وجود میں آیا تو لوگوں میں محدود دائرے سے نکل کر وسیع پیمانے پر سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی اور جب باہمی ضروریات کے لیے ایک دوسرے سے ملے تو انسانی تاریخ کا آغاز ہوا۔

تاریخ ایک سبق آموز داستان ہے جس میں ماضی کا بیان، حال کا تجزیہ اور مستقبل کی روشنی ہوتی ہے۔ یہ صرف روایت پسند اور نقوشِ پارینہ کا خزانہ نہیں بلکہ ہمارے ذہنی وفکری، جذباتی وتہذیبی، معاشرتی وثقافتی سفر کی ارتقائی داستان ہے، جس کے آئینے میں قومی واجتماعی زندگی کے ہر پہلو کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایسا علم ہے جو پوری زندگی کو محیط ہے۔ فکری، عملی، ادبی، مالی، ملکی، سیاسی، اقتصادی غرض انسانی حیات کا کوئی شعبہ نہیں جس کی روداد تاریخ نہ کہلائے۔ دیومالائی شخصیتوں سے لے کر مفکروں، سیاست دانوں اور سائنسدانوں کے افکار ونظریات کے علم کا منبع ومخرج بھی یہی ہے۔ اسی بنیاد پر تاریخ کو ''ام العلوم'' تصور کیا جاتا ہے۔

تاریخ کا لفظ بنیادی طور پر عربی کا لفظ ہے جس کا مادہ ''ارخ'' ہے۔ اس کا مطلب ہے ''وقت کا بیان کرنا''، 'علم التاریخ' سے مراد ایسا علم جس میں واقعات مع تاریخ بیان کیے جائیں۔[۳]

اردو میں تاریخ کا لفظ متعدد معنوں میں مستعمل ہے، لیکن ہمیں یہاں ہر قسم کے معنی سے سروکار نہیں۔ بطور ایک علمی اصطلاح کے اردو میں لفظ تاریخ کا مفہوم کسی چیز کے ظہور کا وقت، کسی امر عظیم کے وقت کا تعین، اس فن کا نام جس میں واقعات گذشتہ سے بحث کی جاتی ہے، لیا جاتا ہے۔[۴]

انگریزی میں تاریخ کے لیے "History" کا لفظ مستعمل ہے، جس کا تعلق لاطینی لفظ "Histo" یا "Historia" سے ہے، اس سے مراد کسی واقعے کی تفتیش و تحقیق کرنا ہے۔ عام طور پر لفظ ہسٹری (History) سے مراد کسی قوم، معاشرے اور ادارے کے وقائع خاص کا صحتِ وجوہات کے ساتھ ترتیب وار تحریری ریکارڈ ہے۔[۵]

یونانی زبان میں لفظ 'تاریخ' انڈ نئے "EIDENAI" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، جس سے مراد کسی واقعے کی بصیرت وادراک حاصل کرنا ہے اور فرانسیسی زبان میں یہ لفظ ہسٹر (ISTOR-HISTOR) کے طور پر استعمال ہوا ہے، جس سے مراد ماضی کی کسی چیز یا واقعے کے بارے میں جاننا اور معلومات رکھنا ہے۔[۶]

مختلف دانشوروں نے علم تاریخ کی تعریف کرتے ہوئے اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کی ہے:

مورخ جی.ہوزنگ کے نزدیک ''تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے، جس سے ماضی کی تہذیب کا عکس نظر آتا ہے۔ کروچے کہتا ہے کہ تاریخ انفرادی واقعات کا نام ہے اور ان واقعات کا بیان اور ان کی وجوہات تاریخ میں فکر پیدا کرتی ہیں۔ برٹرینڈ رسل کے خیال میں ''تاریخ صرف اس بات کا جواب ہے کہ اس کائنات میں واقعات کیسے رونما ہوئے۔'' ٹائن بی کے مطابق ''تاریخ حقائق کی تحقیق اور ان کو ضابطۂ تحریر میں لانے کا فن ہے۔''[۷]

ایک فرانسیسی مورخ لوسین فیبر ے نے اس بات پر زور دیا کہ انسان کی کوئی فطرت نہیں ہوتی اس کی صرف تاریخ ہوتی ہے۔ اس لیے اگر انسان کو پہچاننے یا جاننے کی کوشش کی جائے تو یہ کام صرف تاریخ کر سکتی ہے۔[۸]

ان تعریفوں میں ایک بات جو مشترک ہے وہ یہ کہ مغربی مورخین اسے صرف واقعات کی کھتونی نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت علم سمجھتے ہیں، جو زندگی کے ہر پہلو کو محیط ہے۔ کوئی قوم یا معاشرہ ایک خاص وقت یا ایک خاص دور میں کس طرح رہتا تھا، کیا سوچتا تھا، روایات کیا تھیں، انداز تعمیر کیا تھا؟ ان سارے سوالات کا

جواب صرف تاریخ دے سکتی ہے۔

اسی طرح جب ہم مسلمان مورخین کے نظریات وخیالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ بھی اس علم کو بے مقصد یا قصہ کہانی نہیں سمجھتے ہیں۔ مسلمان مورخین کا نقطۂ نظر قرآن کریم سے متاثر ہے اور قرآن کریم میں خود یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر تم قوموں کے عروج وزوال اور عزت وذلت کا حقیقی سبب معلوم کرنا چاہتے ہو تو تاریخ کی ورق گردانی کرو، اور تم سے پہلے جو قومیں گزر چکی ہیں ان کا حال معلوم کرو۔

اولم یسیرو فی الارض فینظرو کیف کان عاقبة الذین من قبلھم. کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے پہلوں کا کیا انجام ہوا جو ان سے قوت میں بہت زیادہ تھے۔

تلک امة قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم. گزری ہوئی امتوں کے لیے وہ تھا جو انھوں نے حاصل کیا اور تمہارے لیے وہ ہوگا جو تم حاصل کروگے۔[9]

قرآن بار بار لوگوں کو ماضی کی طرف دیکھنے، اس پر غور کرنے، اسے سمجھنے اور ان سے سبق سیکھنے پر زور دیتا ہے تاکہ احقاق حق اور ابطال باطل کی قوت پیدا ہو سکے۔

چودھویں صدی کے مایہ ناز مورخ علامہ ابن خلدون نے اپنی کتاب کے مقدمے میں تاریخ کی اہمیت اور اس کے مقاصد پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''تاریخ حکمتوں کا ایک خزانہ ہے اور تاریخی معلومات کی ایک بہترین پوٹلی ہے......اگر گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو تاریخ میں تحقیقی نظریات بھی ہیں اور کائنات کے لطیف علل ومبادی بھی اور اسی طرح واقعات کی کیفیات و اسباب کا گہرا علم بھی ہے۔ اسی لیے تاریخ کی دنیائے فلسفہ میں گہری جڑیں ہیں اور وہ اس لائق ہے کہ علوم حکمت میں شمار کی جائے۔''[10]

مورخ البدر حسین الاھدال اپنی کتاب ''تحفۃ الزمن فی تاریخ سادات الیمن'' نے تاریخ کی اہمیت کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

> ''یہ بڑا مفید علم ہے۔ اس کے ذریعہ خلف کو اسلاف کے حالات معلوم

ہوتے ہیں اور راست باز لوگ غلطیوں سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔ مطالعہ کرنے والے کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ عبرت حاصل کرتا ہے اور گذشتہ لوگوں کی عقل و دانش کی قدر کرتا ہے۔''[۱۱]

علامہ شبلی نعمانی نے علم تاریخ کی تعریف کچھ اس طرح سے کی ہے:

''آج دنیا میں جو تمدن، معاشرت، خیالات مذاہب موجود ہیں سب گذشتہ واقعات کے نتائج ہیں۔ جو خواہ مخواہ ان سے پیدا ہونے چاہئے تھے۔ اس لیے ان گزشتہ واقعات کا پتہ لگانا اور ان کو اس طرح ترتیب دینا جس سے ظاہر ہو کہ موجودہ واقعہ گذشتہ واقعات سے کیونکر پیدا ہوا، اسی کا نام تاریخ ہے۔''[۱۲]

پروفیسر محمد مجیب کا خیال ہے کہ:

''تاریخ انسانیت کی عقل نہیں ہے صرف اس کی آنکھ ہے۔ جس میں یہ صفت ہے کہ وہ اسی چیز کو نہیں دیکھتی جو کہ موجود ہو بلکہ جستجو اور تحقیق، قیاس اور تخیل کا سرمہ لگا کر ایسی دوربیں ہو جاتی ہے کہ موت اور نیستی کا بھاری آنچل بھی اس سے کچھ چھپا نہیں سکتا اور ایک زمانہ جو کہ کب کا گزر چکا ہے اس کے سامنے تصویر بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔''[۱۳]

وہ تمام عملی مطالبے جو کسی تاریخی فیصلے کے بین السطور میں ہوتے ہیں، تاریخ کو عصری تاریخ کے کردار میں بدل دیتے ہیں کیوں کہ کوئی بھی واقعات زمانے کے اعتبار سے کتنا ہی بعید کیوں نہ ہو فی الحقیقت موجودہ ضروریات سے متعلق ہوتے ہیں، اس لیے یہ کہا گیا ہے کہ ''**الماضی اشبه بالآتی من الماء بالماء**'' عہد گزشتہ عہد آئندہ سے اس قدر مشابہ ہے کہ پانی، پانی سے بھی اس قدر مشابہ نہیں۔''[۱۴] تاریخ ایک ایسا مضمون ہے جو زندگی کے ہر پہلو کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے، جس کے مطالعے کے لیے بڑے گہرے تجربے کے ساتھ ساتھ پختہ عقل اور غور و فکر کی ضرورت ہے کیوں کہ اس کا مطالعہ جہاں ہمیں یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ ماضی میں کسی قوم کے افکار و نظریات کیا تھے؟ وہ نظریہ یا ایجاد کن مرحلوں،

راستوں اور دشواریوں سے گزر کر پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ وہیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ہم دوسروں کے تجربے سے سیکھیں کیوں کہ تاریخ میں ایک لامحدود انسانی تجربہ ہوتا ہے جو کہ انفرادی تجربہ سے زیادہ وسیع اور مختلف اقسام کا ہوتا ہے۔ یہ تجربات یا انسانی ذہن کو اس وقت تک مکمل طور پر نہیں سمجھا جا سکتا جب تک بکھری ہوئی کڑیوں کو ملایا نہیں جائے گا اور یہ کام صرف تاریخ ہی کر سکتی ہے۔

یوں تو ابتدا میں ہر قوم صرف اپنی تاریخ میں دلچسپی لیتی تھی اور اسے محفوظ کرنے کی کوشش کرتی تھی لیکن جب تجارتی اور سفارتی تعلقات نے قوموں کو ایک دوسرے کے قریب کیا تو ان میں ایک دوسرے کو جاننے کا شوق پیدا ہوا۔ باوجود اس کے کہ ہر قوم کی تاریخ جدا ہوتی ہے اس میں ایک تاریخی تسلسل برقرار رہتا ہے۔ وہ تسلسل تہذیب و تمدن کی شکل میں ہو یا تخلیقات و ایجادات کی شکل میں کیوں کہ ایک قوم جو چھوڑ کر جاتی ہے وہ باقی رہتا ہے اور اس کی بنیاد پر دوسری قومیں مزید تعمیر کرتی ہیں اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے، جس سے پوری انسانیت فائدہ اٹھاتی ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

> ''تاریخ میں کوئی قوم یا تہذیب اکیلی اور تنہا نہیں رہ سکتی، اس کا دوسری قوموں اور تہذیبوں سے اشتراک ہوتا ہے۔ اس اشتراک کو مضبوط کرنے میں قوموں کی ہجرت، جنگیں، سفارتی تعلقات، تجارت اور مذہبی مشن مدد دیتے ہیں جو تہذیبی اور ثقافتی روابط پیدا کر کے اجنبیت کی دیواریں توڑتے ہیں۔''۱۵

پروفیسر محمد مجیب کا خیال بھی ڈاکٹر مبارک علی سے ملتا جلتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہم میں دوسری قوموں کے مذاق کی قدر کرنے یا نئے اثرات قبول کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو ہمارا اپنا معیارِ حسن، خواہ وہ کتنا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو رفتہ رفتہ پیائش کا آلہ بن جائے گا۔ تخلیق کا شوق اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب نئے خیال کو نئے طریقے پر برتنے کا امکان ہو۔''۱۶

بہر حال قوموں کا آپس میں لین دین کا سلسلہ کل بھی جاری تھا اور آج بھی جاری ہے۔ چاہے وہ تہذیب کی شکل میں ہو یا تخلیقات و ایجادات کی شکل میں یا کوئی اور شے ہو۔ یہ بات سچ ہے کہ اگر تاریخ

کا علم نہ ہوتا تو اس صورت میں پچھلی قوموں کے ایجاد یا فن کی اہمیت ختم ہو جاتی اور وہ سب راز بن کر رہ جاتی۔ یہ تاریخ کا کمال ہے کہ اس نے بہت سے رازوں کا پردہ فاش کیا ہے اور جیسا کہ اوپر کہا گیا کہ آج پوری دنیا اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔

انیسویں صدی میں تاریخ میں ایک بڑی تبدیلی اس وقت آئی، جب سائنس کی تعلیم اور سائنسی طرز فکر کی ہمہ گیر اہمیت زندگی کے ہر شعبہ میں محسوس کی جانے لگی تو اس رجحان نے تعلیم کے میدان میں بھی دور رس اثرات مرتب کیے۔ جس کا اثر تاریخ اور مورخ دونوں پر پڑا۔ اب تاریخی واقعات کی اصلیت اور صداقت معلوم کرنے کے لیے تحقیق و جستجو کے سائنسی طریقے کام میں لائے جانے لگے جس کی وجہ سے وہ شخصیتیں جن کا مقام تاریخ میں اس لیے اہم تھا کہ ان کے اردگرد کراماتیں اور معجزے تھے، ان کی اصلی اور تاریخی حقیقت جس میں چھپی تھی، ایک ایسے معاشرے میں تو موثر ہو سکتی ہیں جس کی ذہنی ترقی نہیں ہوئی تھی یا جو چیزوں کو عقلی اور سائنسی بنیاد پر نہیں سمجھ پاتے تھے، اس لیے وہ واقعات کی وجوہات تلاش نہ کر کے ان پر یقین کر لیتے اور اسے مافوق الفطرت قوتوں سے منسوب کر دیتے تھے۔ آج جب سائنسی طریقے پر ان واقعات کو جانچا گیا تو ان کی تاریخی اہمیت کم ہوگئی اور جب تاریخی اہمیت کم ہوگئی تو ان کے عمل اور کردار سے انسان کچھ سیکھنے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کرتا ہے۔ کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ انسان صرف انسان سے سیکھ سکتا ہے جو انسانی درجے سے بلند ہوں ان کی صفات حاصل کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ خلیل الرب نے اپنی کتاب ''تدریس تاریخ'' میں انیسویں صدی کی تاریخ سے متعلق لکھا ہے:

> ''اب تاریخ کے میدان میں بھی تحقیق کا سلسلہ شروع ہوا، جو مسائل سامنے آئے ان کا تجزیہ ہونے لگا اور بحثیں سامنے آئیں کہ تاریخ کا صحیح منصب کیا ہے اور وہ کیسے لکھی جائے۔ انہیں مباحث نے تاریخی تنقید کو جنم دیا اور نشاۃ ثانیہ کے مورخین نے اس موضوع پر اپنی ذہنی تابناکی کا مظاہرہ کیا۔ دراصل تاریخی تنقید کا یہی رچا ہوا شعور تھا جس نے تاریخ کے سائنٹفک تصور کی بنیاد ڈالی۔''[۱۷]

جب تک تاریخ نے انیسویں صدی میں قدم نہیں رکھا وہ تحقیق و ترتیب کے اصول سے نا آشنا رہی،

اور تاریخ کے صفحات میں حکمراں طبقے کی تعریف، دلچسپ قصے، داستان اور رزمیہ نظمیں کہانی کی شکل میں لکھی جاتی رہیں۔ انیسویں صدی میں تاریخ کے لیے تحقیق و ترتیب کا اصول مقرر کیا گیا اور اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ تاریخ محض سیاسی واقعات یا چند شخصیتوں کے کارناموں کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں سماجی ومعاشی اور ثقافتی عناصر اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ان سب کی شمولیت ہی تاریخ کو تاریخ بناتی ہے۔

انیسویں صدی سے قبل تاریخ کا دائرہ محدود، واقعات غیر تحقیق شدہ اور مورخ غیر محتاط تھے۔ اسی لیے علامہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے:

''بڑے بڑے مورخین نے مفصل تاریخیں لکھیں اور دنیا کے واقعات پورے پورے قلم بند کیے اور کتابوں میں محفوظ کیے لیکن افسوس بن بلائے ہوئے نالائق مہمانوں نے تاریخ میں جھوٹے اور خودساختہ افسانے ملا دیئے، اوہام خیالات بھر دیئے اور کمزور و منقولہ اور خودتراشیدہ روایات کے خوبصورت حاشیے۔ پھر بعد والے انہیں کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑے لکیر کے فقیر بن گئے اور جو کچھ واقعات انھوں نے سنے تھے وہی بلاکم وکاست ہم تک پہنچا دیئے۔ انھوں نے واقعات کے اسباب پر غور وفکر نہیں کیا اور بے بنیاد اڑائی ہوئی باتیں بھی نہیں چھوڑیں اور نہ ان کا معقول جواب دیا غرض تحقیق برائے نام بھی نہیں کی۔''۱۸

جیسے جیسے حالات بدلے، تاریخ کا دائرہ بڑھا، مورخ کی ذمہ داری بڑھی۔ واقعات کے اسباب پر غور وفکر ساتھ ساتھ ان واقعات کو اصول تحقیق کی روشنی میں جانچا جانے لگا اور یوں تاریخ کو ایسے مورخین سے چھٹکارا ملا جو تاریخ کے صفحات کو اوہام وخیالات وخودتراشیدہ روایات سے بوجھل کرتے تھے۔ اب تاریخ لکھنے کے لیے جس طرح کے مورخ کی ضرورت ہوتی ہے، اس ضمن میں ڈاکٹر مبارک علی لکھتے ہیں:

''مورخ تربیت یافتہ ہو، کیوں کہ تربیت یافتہ مورخ ہی واقعات کی اہمیت اور ان کی روح کو سمجھ سکتا ہے، ایک غیر تربیت یافتہ مورخ کی نظروں میں بہت سے واقعات غیر اہم ہوتے ہیں اور وہ اس قابل نہیں

ہوتا کہ وہ اس کا ادراک کر سکے، کیوں کہ ایک تربیت یافتہ مورخ کی نگاہ
اس قابل ہوتی ہے کہ وہ واقعات کی نوعیت اور حقائق کو دیکھ سکے اور ان کا
تجزیہ کر سکے۔''[۱۹]

اسی طرح کا خیال خلیل الرب نے بھی ظاہر کیا ہے:

''اولاً تو سارے واقعات کا احاطہ کرنا محال ہے دوم یہ غریب واقعات
خود کچھ کہنے سے قاصر ہیں۔ واقعات لا انتہا اور لامحدود ہیں، یہ اپنا
انتخاب خود کر کے کسی مخصوص ترتیب کے تحت خود بہ خود مورخ کے ذہن
میں رونما نہیں ہوتے۔مورخ اپنے فکری عمل کے دوران اہم اور
بامقصد واقعات کو منتخب کر کے ان میں کسی مقصد کے تحت ترتیب دیتا
ہے۔یعنی ایک طرح سے ان کی توجیہ اور وضاحت کرتا ہے۔''[۲۰]

تاریخ مرتب کرنے کے سلسلے میں ایک اہم مسئلہ کسی فرد یا واقعے کے انتخاب میں مورخین کے ذاتی پسند اور ناپسند کا ہے۔ اگر مورخوں کا تعلق مختلف قوموں سے ہوتا ہے تو وہ ایک ہی واقعہ کو اپنی پسندیدہ شخصیت سے منسوب کر دیتے ہیں۔ جیسے فرانسیسی مورخ کے لیے نپولین تاریخ ساز شخصیت تھا۔تو روسی مورخ کے لیے الگزینڈر، بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی قوم کے مورخ واقعات کو علیحدہ علیحدہ نظر سے دیکھتے ہیں مثلاً ٹیر (Thiers) نپولین کو ذہین اور بلند و بالا شخص کے طور پر دیکھتا ہے مگر دوسرا مورخ جو جمہوری اقدار پر یقین رکھتا ہے اس کے لیے نپولین ایک دھوکہ باز اور فریبی تھا''[۲۱] قاری ان متضاد بیانات کی وجہ سے اس قوت کی نشاندہی نہیں کر سکتے ہیں جو قوموں کو متحرک رکھتی ہے۔

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انسان قدرتی طور پر اپنے عقائد، اپنی تہذیب اور اپنی قوم کو دوسروں پر ترجیح دیتا ہے اور ہر چیز کی قدر دوسری چیزوں سے مقابلہ کر کے قائم کرتا ہے۔بعض چیزوں میں تمیز کرنا اسے بچپن سے سکھایا جاتا ہے، بعض اسے اس لیے پسند ہوتی ہیں کہ وہ اس کی طبیعت یا مذاق کے موافق ہوتی ہیں۔ اگر یہ قدرتی میلان مورخ پر حاوی ہو جائے تو اس وقت تاریخ اہم سوالات کا جواب دینے سے گریز کرتی ہے۔ ایک بہتر مورخ ان قدرتی میلان کو قابو میں رکھ کر تاریخ مرتب کرتا ہے، کیوں

کہ تاریخ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ نوع انسانی کی عام ملکیت ہے اگر اسے کسی فرد، قوم یا ملک کی ملکیت سمجھا جائے تو یہ تنگ نظری کا ثبوت ہے۔

ادبی تاریخ

وقت اور معلومات کے بڑھتے ذخیرے کے ساتھ ساتھ تاریخ کے علم کا دامن بھی وسیع ہوتا گیا اور اس کے بہت سے دوسرے شعبے وجود میں آتے گئے، مثلاً معاشرتی تاریخ، معاشی تاریخ، سیاسی تاریخ، قومی تاریخ، مذہبی تاریخ اسی طرح اس کا ایک اہم شعبہ ادبی تاریخ بھی ہے۔

ادب کی تاریخ عام تاریخ کا ایک جزیا شعبہ ہونے کے باوجود بھی اس سے الگ اور منفرد ہے۔ ایک سوال قائم کیا جاسکتا ہے کہ آخر ایسا کیوں؟ وہ کون سی چیز ہے جو ادبی تاریخ کو عام تاریخ سے جدا یا ممتاز کرتی ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ ادبی تاریخ کا تعلق ادب سے ہے۔ اس لیے ہمیں سب سے پہلے یہ جاننے کی ضرورت پڑتی ہے کہ ادب کیا ہے؟ یوں تو ادب کی تعریف ایک جملے میں آسانی سے نہیں کی جاسکتی ہے کیوں کہ ادب کا مفہوم اپنے معنی کے اعتبار سے بہت وسیع ہے کسی نے ادب کو زندگی کا ترجمان کہا ہے تو کسی نے سماج کا آئینہ، کسی نے دستور حیات کہا ہے تو کسی نے تفسیر حیات، کسی نے کہا ہے کہ ادب انسانی زندگی کا نچوڑ ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''ادب زندگی کے اظہار کا نام ہے۔ ادب چونکہ لفظوں کی ترتیب و تنظیم سے وجود میں آتا ہے اور ان لفظوں میں جذبہ وفکر بھی شامل ہوتے ہیں، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ لفظوں کے ذریعہ جذبے، احساس یا فکر وخیال کے اظہار کو ادب کہتے ہیں۔'' [۲۲]

ظفر الحسن لاری ادب کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''ادب اظہار ہے اس فطری احساس کا جو ہر انسان کے قلب میں مخفی ہوتا ہے۔ اس کا مقصد حسن کی تخلیق وتشکیل ہے۔ ہر شخص کا معیار حسن ذاتی ہوتا ہے وہ اپنے معیار حسن میں کسی دوسرے کی شرکت گوارا نہیں کرسکتا۔

وقتاً فوقتاً تاثرات کے لمحوں میں وہ اپنے معیار حسن کو الفاظ کا جامہ پہنانے
کی کوشش کرتا ہے اور یہی کوشش ادبی تخلیق کا ذریعہ بنتی ہے۔''۲۳

نورالحسن ہاشمی نے ادب کی تعریف بڑے دلکش انداز میں کی ہے:

''ادب نام ہے کسی حقیقت کے حسین ترین اظہار کا۔ ادب ایک چمکتا ہوا
سورج ہے، جس میں حرارت اور چمک دونوں ہونا ضروری ہیں۔ بعض
اوقات لوگ محض چمک ہی سے مسحور ہو جاتے ہیں لیکن سچا اور پائیدار
ادب وہی ہے جس میں حرارت بھی ہو ورنہ خالی چمک دمک چاند کی
روشنی کی طرح محض خالی اور شرارہ کی چمک کی طرح وقتی ہوتا ہے۔''۲۴

ان تعریفوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جس طرح ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی ہے اسی طرح ہر چھپی ہوئی تحریر ادب نہیں ہوتی ہے۔ ادب سے مراد ایسی تحریریں ہوتی ہیں جو انسانی دل کے لیے کشش اور تحریک کا باعث ہوں۔ اس میں جذبے اور تخیل کی کارفرمائی کے ساتھ ساتھ اسلوب کی خوبصورتی بھی موجود ہو جس کے ذریعہ انسان اپنے تاثرات یا جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر اپنے فطری احساس کا اظہار کر سکے۔ ادب کی تاریخ انہیں جذبات واحساسات کی تاریخ ہے۔ اگر ادب دستورِ حیات اور تفسیرِ حیات ہے تو ادبی تاریخ وہ آئینہ ہے جس میں انسان کی پوری زندگی کی تصویر نظر آتی ہے۔ اس میں ایک باشعور مہذب معاشرے کے نفیس مزاجوں اور ذہنوں کے ساتھ ساتھ زبان وادب کی پوری داستان دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی تاریخ کو عام تاریخ پر فوقیت حاصل ہے اگر چہ عام تاریخ میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ اس میں معلوماتی ذخیرے کا ڈھیر لگا رہتا ہے لیکن بنیادی فرق یہ ہے جس کی طرف ڈاکٹر سلیم اختر نے اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ادب کی تاریخ کا معاملہ عام تاریخ کے مقابلے میں خاصا نازک اور
پیچیدہ ہے۔ اس لیے کہ یہ تاریخ کے مروج تصور کے مطابق محض ایام
شماری نہیں اور نہ معلومات وکوائف مرتب کرنا ہے۔ اگر چہ تاریخ میں
یہ سب کچھ شامل ہے لیکن بنیادی طور پر یہ تخلیق اور تخلیق کاروں کا
مطالعہ ہے اگر ایک طرف تاریخ ادب سے تخلیق کی معیار بندی ہوتی

ہے تو دوسری طرف تخلیق کاروں کی انسانی اور تخلیقی شخصیت کا مطالعہ بھی
کیا جاتا ہے۔'' ۲۵

ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے کہ:

''تاریخ کا کام صرف یہ نہیں کہ وہ واقعات وحقائق کا محض اندراج
کر دے بلکہ ضروری ہے کہ مختلف سروں کو باہمی ربط دے کر ایک ایسی
تنظیم میں لے آئے کہ یہ تصور پڑھنے والے کے ذہن پر نقش ہو جائے
اور ادب کا حقیقی، تاریخی ارتقا بھی نظروں کے سامنے آ جائے۔'' ۲۶

اور یہ کام عام تاریخ نہیں بلکہ ادب کی تاریخ انجام دیتی ہے۔ وہ ہر تہذیب کے عروج و زوال کے ساتھ ساتھ اس دور میں مروج زبان و ادب کے عروج و زوال کی کہانی بھی پیش کرتی ہے۔ کوئی زبان کس طرح معمولی بولی سے ادبی زبان کا روپ دھارتی ہے۔ کوئی لفظ تہذیب کی بھٹی میں کس طرح کندن بنتا ہے۔ ان سب باتوں کا اندازہ ہمیں ادب کی تاریخ سے ہوتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر علی جاوید لکھتے ہیں:

''ادبی تاریخ کو نہ محض فن پاروں کی جمالیاتی کیفیات یا تنقید قرار
دیا جاسکتا ہے نہ محض بدلتے ہوئے مذاق سخن کی دستاویز بلکہ وہ زبان کے
نشوونما کی داستان بیان کرتی اور ان کے پیچھے بدلتے ہوئے ذوق کی
کہانی بھی کہتی ہے۔'' ۲۷

ادب سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی زندگی کا آئینہ دار رہتا ہے۔ ادبی آئینے میں سب رنگ بہت خوبصورتی سے سچائی کی عکاسی کرتے ہیں۔ نظموں، غزلوں، افسانوں اور ناولوں وغیرہ میں بعض اوقات بہت خوبصورتی سے ماحول اور سماجی و معاشی حالات کی عکاسی ہوتی ہے اور کبھی ڈھکے چھپے انداز میں سیاسی ماحول کو پیش کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی حکومت پر طنز بھی، البتہ ادبی تاریخ یہ کام کرتی ہے کہ انفرادی طور پر ان تمام پہلوؤں کو ایک لڑی میں پرو کر پڑھنے والے کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ ابوالاعجاز صدیقی لکھتے ہیں:

''تاریخ ادب یا تاریخ ادبیات سے مراد وہ تصنیف ہے جس میں کسی
زبان کی مختلف اصناف ادب اور ان اصناف میں قابل ذکر انجام دینے

والے اشخاص نمایاں اسالیب، معنی خیز واقعات، ادبی رجحانات، عہد آفریں تحریکات اور نمائندہ تخلیقات سے زمانی ترتیب اور ادوار کے تعین کے ساتھ سماجی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کے پس منظر میں بحث کی جائے تا کہ ادبیات کا عہد بہ عہد ارتقا علت و معلول کے منطقی رشتوں سمیت ایک مربوط کہانی کی صورت میں سامنے آ جائے۔''۲۸

عبدالقادر سروری کا یہ خطیبانہ انداز بھی ملاحظہ فرمائیں:

''آئندہ ادبی تاریخ لکھنے والے کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ادبی مظاہر کو سیاسی، معاشی، سماجی اور فنی ماحول میں پیش کرنے کی کوشش کرے۔ ہماری سیاسی تاریخ تو مدون ہے لیکن معاشی، سماجی اور فنی تاریخ اتنی مرتب نہیں ہے کہ اس کا مسالہ ایک چھوٹی سی کتاب میں آسانی سے فراہم کیا جا سکے اور اس کے ساتھ ادبی مظاہر کی نشو و نما کو جوڑ کر سب کے عمل اور رد عمل کو نمایاں کیا جا سکے۔''۲۹

بہر حال ادبی تاریخ شیشے کے مانند وہ سمندر ہے جو ان سارے مطالبات کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، جس میں ہم زبان اور اس کے بولنے اور لکھنے والوں کی اجتماعی و تہذیبی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ ادب میں سارے فکری، تہذیبی، سیاسی، معاشرتی اور لسانی عوامل ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک وحدت ایک اکائی بناتے ہیں اور ادبی تاریخ ان سارے اثرات، روایات، محرکات، خیالات اور رجحانات کا آئینہ بن جاتی ہے، جس کی مدد سے ہم کسی بھی قوم کے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور تاریخی عوامل کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ ادیبوں، فلسفیوں، مفکروں، شاعروں اور عالموں کو جان یا پہچان سکتے ہیں۔ کسی معاشرے کی اخلاقی اقدار، روایات اور ثقافتی ادارے کس طرح تبدیلی کا شکار ہوئے ان سب کا صحیح اندازہ ادبی تاریخ کے مطالعے سے ہی ہوتا ہے۔ مظفر علی سید لکھتے ہیں:

''اصل میں تاریخ ادب کا مطالعہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب پڑھنے والے کی توجہ ادب سے براہ راست کچھ سیکھنے کے بجائے یہ جاننے

پر مرکوز ہو کہ فلاں فلاں تحریری کارنامے کب وجود میں آئے، انھیں کس
نے لکھا، وہ کب سے کب تک زندہ رہا اس وقت اس کے ملک وقوم اور
اس زبان پر کیا بپتا پڑی ہوئی تھی اور اس نے اس سلسلے میں کیا کارہائے
نمایاں انجام دیے جن کو یاد رکھنا ضروری ہے۔''۳۰؎

تاریخ ادب کے مطالعے کے سلسلے میں خلیل الرحمٰن اعظمی وضاحتی انداز میں لکھتے ہیں:

''ہم تاریخ ادب کا مطالعہ کرتے وقت اپنے ذہن میں یہ بات رکھیں کہ
اس کے ذریعے ہمیں اپنی معلومات میں اضافہ نہیں کرنا ہے نہ ہر دور کے
زیادہ سے زیادہ ادیبوں کے نام، ان کے سن پیدائش و وفات یا ان کی
تصنیفات کی مکمل فہرست یاد کرنا ہے بلکہ اس مطالعے کے ذریعے ہمیں
اپنے ادبی ذوق کی تربیت کرنی ہے اور ادب کا صحیح اور متوازن شعور پیدا
کرنا ہے۔ ماضی کے ادب کو آج کے ادب کے رشتے میں دیکھ کر ادب
کی نامیاتی وحدت، اس کا ارتقائی تسلسل، اس کی حرکت اور اس کے
امکانات کا صحیح ادراک کرنا ہے تاکہ ہم خود اپنے زمانے کی روح سے
شناسائی حاصل کر سکیں۔''۳۱؎

یہ حقیقت ہے کہ تاریخی مطالعے کا مقصد صرف اپنی معلومات میں اضافہ کرنا نہیں ہوتا ہے بلکہ اپنے ادبی ذوق کی تربیت کرنی ہوتی ہے۔ حال کو ماضی کے حقائق کے ذریعے سوچنے سمجھنے کی کوشش ہوتی ہے۔ عام طور پر ادب کا قاری ادب کا مطالعہ صرف ذہنی تسکین کی خاطر کرتا ہے، اس لیے وہ صرف اپنے دور کے ادبی فن پاروں تک محدود رہتا ہے۔ مگر ادب کا سنجیدہ قاری صرف اپنے دور تک محدود رہنا نہیں چاہتا بلکہ وہ اپنے دور تک آنے والی ادبی روایت اور اس کی روح سے بھی آشنا ہونا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دور کے ادب کی ذہنی، فکری اور لسانی روایتوں کو جاننا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں کو جاننے کے لیے یا اسے سمجھنے کے لیے ان ادبی شہ پاروں کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ تبھی جا کر یہ مقاصد پورے ہو سکتے ہیں۔

مغربی نظریات

ادبی تاریخ کے سلسلے میں مغربی مورخوں اور نقادوں کے درمیان خاصا اختلاف رہا ہے۔ اس کے باوجود ان کے نظریات کو اس لیے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ادبی تاریخ کا تصور دراصل ہمیں مغرب سے ہی ملا ہے۔ وہاں کچھ لوگ ادبی تاریخ کو اجتماعی تاریخ سمجھتے ہیں یا افکار کی تاریخ جس میں فن پاروں پر محاکمہ بھی شامل ہوتا ہے۔ ٹامس وارٹن کے نزدیک ادبی تاریخ اپنے دور کی خصوصیات بے کم وکاست پیش کرتی ہے۔ ہنری مارلے اسے ایک طرح کی قومی سوانح عمری کہتا ہے۔ سینٹس بری نے اسے ادیبوں کے کارناموں کا جائزہ سمجھا ہے، جس میں ان کارناموں کی بازآفرینی ہو۔ کزامیاں کا خیال ہے کہ انگلستان کی ادبی تاریخ اس کی قومی روح کے اخلاقی آہنگ کا زیروبم ہے۔ کچھ لوگ اسے فن کی تاریخ سمجھتے ہیں جس میں دلچسپی کے لیے مصنفین کی سوانح عمریاں اور کچھ منفرد فن پاروں کی قدر شناسی شامل ہو۔ ٹی ایس ایلیٹ ادبی تاریخ کا کچھ ایسا قائل نہیں اس کے نزدیک فن پارے کی اہمیت اس میں ہے کہ وہ ماضی بن سکے۔ جے اے سمنڈس ادبی اصناف پر زور دیتا ہے اور یہ اعلان کرتا ہے کہ ادبی اصناف کا ارتقا ادبی تاریخ کا سب سے اہم جز ہے کیوں کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ کچھ ادبی اصناف مرجھانے کے ساتھ ہی ختم ہوجاتی ہیں۔ بعض جرمن اور امریکی فلسفیوں نے اس وجہ سے ادب کے ارتقا کو حیاتیات کی روشنی میں دیکھا ہے اور اس مطالعے سے ادب کے مطالعے کے لیے اصول اخذ کیے ہیں۔[۳۲]

ادبی تاریخ لکھنے کے سلسلے میں یہ اختلاف ادیبوں اور دانشوروں کو ایسی جگہ لا کھڑا کردیتا ہے جہاں ایک گروہ وہ ہے جو ادب کی سماجی افادیت کی وکالت کرتا ہے۔ وہ ادبی تاریخ لکھنے کا قائل ہے۔ دوسرا وہ گروہ جو ادب اور سماج کو الگ الگ کر کے دیکھنے کا قائل ہے۔ وہ ادبی تاریخ کی مخالفت کرتا نظر آتا ہے۔ ایسا نہیں کہ ان دونوں گروہوں میں بالکل اختلاف رہا ہو بلکہ مختلف لوگوں نے ادبی تاریخ نویسی کو الگ الگ طرح سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

مغربی ادب میں سترہویں صدی تک شاعروں کی سوانح عمریاں، اردو تذکروں کی طرح مرتب کی جاتی رہی ہیں البتہ ۱۷۷۴ء میں لکھی گئی ٹامس وارٹن (Thoms Warton) کی "History of

"English Poetry" انگریزی میں پہلی ادبی تاریخ مانی گئی ہے، جس میں شعرا کا بیان تاریخی ترتیب سے کیا گیا ہے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی ابتدا میں ادبی تاریخ کے موضوع پر مغربی ادب میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ رینے ویلک (Rene welke) نے اپنی کتاب "Theory of Literature" میں اس موضوع پر بہت وضاحت سے لکھا ہے۔ اس کے مطابق اگر انگریزی ادبی تاریخوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ بیشتر ادبی تاریخیں یا تو سوشل یا سماجی تاریخیں ہیں یا پھر وہ افکار کی تاریخیں ہیں جنھیں ادب کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے، یا پھر وہ مخصوص فن پارے یا ادبی محاکمے ہیں جنھیں سلسلہ وار یا تاریخ وار مرتب کیا جاتا رہا۔ اس کے مطابق ٹامس وارٹن (Thoms Warton) جو انگریزی ادب کا پہلا باقاعدہ مورخ ہے، وہ قدیم ادب کے مطالعے کا اس لیے قائل ہے کہ یہ گزرے ہوئے دور کا سچا ریکارڈ ہے، جس میں اس دور کی سبھی خوبصورت و رنگین تصاویر موجود ہوتی ہیں۔ ۳۳؎ ہنری مارلے ادبی تاریخ کو قومی تذکرہ (National Biography) اور انگریزی ذہن کی کہانی سمجھتا ہے۔ ۳۴؎ ہیگل نے یہ کہا کہ انسان اپنی محنت کا مظہر ہے اور اس محنت کے نتیجہ میں جو کچھ ظاہر ہوتا ہے اور تخلیق ہوتا ہے وہ تاریخ کی تشکیل کرتا ہے۔ تاریخ انسانی معاشرے کی اس لے ایک ضرورت بن گئی ہے کہ یہ اس کے ماضی اور گزرے ہوئے زمانہ کو محفوظ رکھتی ہے۔ ۳۵؎

اسپلر کا یہ کہنا ہے کہ ہر نسل کو اپنی تاریخ خود لکھنی چاہیے۔ یہ نہیں کہ ماضی بدل جاتا ہے۔ یہ نہیں بدلتا بلکہ انسان ہی ایسی مخلوق ہے جو اپنے علم، اپنی قوت تشریح اور ماضی کے متعلق اپنے فیصلے کو اپنے حال کو بہتر طریقے پر سمجھنے اور مستقبل کو زیادہ عقل مندی سے تشکیل دینے کے کام میں لاتا ہے۔ ادبی تاریخ کے یہی فوائد ہیں۔ ۳۶؎

ادبی تاریخ ہمہ جہت چیز ہے اور ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اہمیت کی حامل ہے۔ کیوں کہ ادبی فن پارے کو پڑھ کر جہاں ہم اس کی تحسین کرتے ہیں وہاں بہت سے سوالات بھی سر اٹھاتے ہیں۔ ان سوالات کو حل کرنے کے لیے گزشتہ ادبی روایات کو سمجھنا ہوتا ہے۔ پھر شاعر یا ادیب اپنے فن پارے میں جو زبان استعمال کرتا ہے، اس میں بہت سے استعارے، تشبیہات یا تراکیب ایسی ہوتی ہیں جو صرف اس کے دور ہی سے مخصوص ہوتی ہیں لہٰذا ان کو سمجھنے کے لیے پورے ادب کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے جو تاریخ ادب کے بغیر ممکن نہیں۔ اس طرح ہم دیکھیں تو ادبی تاریخ میں مختلف ادوار کی مختلف روایات کو ایک لڑی

میں پرو کر پیش کیا جاتا ہے جس سے روایات کی باضابطہ تاریخ سامنے آجاتی ہے اور یوں ادبی تاریخ ایک اہم موضوع کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے برعکس مختلف ماہرین کے مطابق ادب کی تاریخ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ تمام ادب پارے ایک لافانی اور زندہ حقیقت کے طور پر موجود ہیں اور کسی زندہ حقیت کو ایک عہد پارینہ کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ ادبی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے میجر پانڈے نے مخالفین اور محاسنین کے بارے میں بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ:

''صرف جانور ہی تاریخی فہم اور تخلیق کی ذمہ داری سے آزاد ہو سکتے ہیں۔ ایسے لوگ جو ادبی تاریخ کے مخالف ہیں وہ بنیادی طور پر ادب میں جمود، ادبی روایات سے آزادی یا مجموعی اعتبار سے ادب برائے ادب کے قائل ہیں لیکن دوسری طرف ادبی تاریخ کے حامی بھی ہیں۔ یہ لوگ ادب کو تاریخ وار سلسلۂ واقعات سمجھ بیٹھتے ہیں اور یہ محسوس نہیں کرتے کہ ادب کا تہذیبی روپ بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے ادبی اثرات اور سارے سماج کو سامنے رکھ کر اس کا تجزیہ ضروری ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں نے ادبی تاریخ نویسی کو صرف حقائق یکجا کرنے تک محدود کر دیا اور انھیں بنیاد پر تاریخ نویسی کے مخالفین نے ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا۔''[۳۷]

رینے ویلک اپنے مضمون The Fall of Literary History میں وضاحت کرتا ہے کہ مغربی ادب میں تاریخ کے بارے میں ہمیشہ مختلف النوع خیالات رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اسے ایک کارآمد علم سمجھا ہے جبکہ بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ بے کار مشغلہ ہے، جس سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ انیسویں صدی کے ایک معروف مورخ اور تنقید نگار ڈبلیو پی کیر (W.P.Ker) کے نزدیک ادبی تاریخ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ایک بے کار کام ہے کیوں کہ ادبی فن پارے گزرے ہوئے دور سے تعلق رکھنے کے باوجود ماضی کی یادگار نہیں ہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ گزرے ہوئے وقت سے تعلق رکھنے کے باوجود لمحۂ موجود سے بھی ان کا گہرا ناتا ہوتا ہے۔ پس جس چیز کا تعلق حال سے ہو اس کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی۔[۳۸] ٹرگرٹ نے تاریخ نویسی کی مخالفت اس لیے کی کہ اسے ایک شخص لکھتا ہے۔[۳۹] رینے

ویلک نے بہت ہی بنیادی سوال اٹھایا کہ اس طرح تمام علوم کے بارے میں کہا جا سکتا ہے اور علوم کو بکواس کہہ کر رد کیا جا سکتا ہے کیوں کہ لکھنے والا ایک فرد واحد ہوتا ہے۔۴۰

اسی طرح ایف۔آر۔لیوس (F.R.Leavis) بھی ادبی تاریخ کی اہمیت اور ضرورت کا قائل نظر نہیں آتا اور ادبی تاریخ کو مرتب کرنا بیکار سمجھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ادبی تاریخ ایک بالکل بیکار چیز ہے خاص طور پر ادب کے طلبا کے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں کیوں کہ ایک طالب علم ادبی مورخ کی دی گئی ضروری معلومات سے فائدہ اٹھانا نہیں جانتا۔ اس لیے طلبا ان معلومات کو صرف تعلیمی ضروریات کے مطابق ہی فائدہ اٹھانے کے لیے حاصل کرتے ہیں اور اصل ادبی شہہ پاروں کو پڑھنے کی زحمت نہیں کرتے۔ اسی طرح ادبی تاریخ کا قاری عموماً یہ دیکھتا ہے کہ کوئی ادبی شہ پارہ کس جگہ اور کس وقت معرض وجود میں آیا۔ اس وقت ملکی، معاشرتی، معاشی، سیاسی حالات کیا تھے۔ چنانچہ اس کی توجہ اصل ادب اور اس کی خوبیوں کی طرف مبذول نہیں ہو پاتی۔ یوں اس کی تنقیدی صلاحیت صیقل ہونے سے محروم رہتی ہے۔''۴۱

بیٹسن ادبی تاریخ نویسی کی مخالفت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ادبی تاریخ میں ایک چیز دوسرے سے ماخوذ ہوتی ہے اور جبکہ تنقید میں ایک چیز کو دوسرے سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طرح اس خیال کے مطابق پہلے تو مختلف حقائق کی روشنی میں ادب کا تجزیہ ہوتا ہے اور پھر نظریات اور اعتقادات کا دخل ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں غیر جانب داری حقائق نہیں ہوتے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ غیر جانب داری حقائق ہوتے ہیں تو یہ حقائق تاریخ، عنوان یا سوانحی واقعات تک محدود ہوتے ہیں جن سے ادب کی تاریخی اسناد کی تدوین تو ہو سکتی ہے لیکن ادبی تاریخ لکھنے کے لیے صرف یہی چیزیں درکار نہیں ہوتیں۔ تاریخ نویسی کے سلسلے میں بہت سی خام خیالیوں کا ذکر کرتے ہوئے رینے ویلک نے لکھا ہے کہ ایسے لوگ جو ادبی تاریخ نویسی میں تنقید کی مخالفت کرتے ہیں وہ اپنے آپ میں نادانستہ طور پر خود بھی نقاد ہوتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن پر روایتی معیار کی چھاپ اور آج کے دور میں ان کی حیثیت ایسے موخر رومانیوں Belated Romanticists کی ہے، جنھوں نے تمام ادب اور خصوصاً جدید ادب کی فہم سے منھ موڑ لیا ہے یا سوچنا بند کر دیا ہے۔۴۲

رینے ویلک اپنی تصنیف "Theory of Literature" میں بیٹسن کے اس نظریہ سے بحث

کرتا ہے کہ ادبی تاریخ اورادبی تنقید کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس میں حقائق ایک دوسرے سے ماخوذ ہوتے ہیں یا ایک چیز کو دوسری سے بہتر ثابت کیا جاتا ہے۔رینے ویلک نے بجاطور پر یہ ثابت کیا ہے کہ دونوں صورتوں میں تنقیدی شعور کا عمل دخل لازم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نقاد اپنے دور کے مطابق قدیم ادبی شہ پاروں کو پرکھتا اور جانچتا ہے جبکہ ادبی مورخ کے سامنے ادبی شہ پارے کا زمانہ ہوتا ہے۔تنقید کا رشتہ حال سے زیادہ گہرا ہوتا ہے اورادبی تاریخ کا ماضی سے، ادبی مورخ کوصرف اپنے زمانے ہی کی میزان پر شہ پاروں کو پرکھنا نہیں ہوتا بلکہ تاریخ کے آئینے میں بھی شہ پارےاورادبی تاریخ کو دیکھنا ہوتا ہے۔[۴۳]

اسپلر نے مورخ کے حوالے سے یہ بات کہی ہے کہ ادبی مورخ کونظریےاورتنقیدی تجزیے کا کام دوسروں پر چھوڑنا ہوگا۔ دوسرے موقع پر وہ تنقیدنگار ہوسکتا ہے لیکن فی الحال اس کا دوسرا رول زیر بحث ہے۔ادبی تاریخ کا موضوع ادب ہےاس لیے یہ ادبی انداز میں لکھی جانی چاہیےاور چونکہ یہ ادب کی ایک صنف ہےاس لیے یہ آرٹ ہے،تاریخ کی طرح سائنس نہیں۔ادبی تخلیق کا اپنے خالق کی ذات کے علاوہ اس کی ثقافت، دوسری ثقافتوں اور قارئین سے بھی تعلق ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ایک تخلیق کا دوسری تخلیق سے بھی رشتہ ہوتا ہے۔ پھر اسپلر آگےسوال قائم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان رشتوں کو کیوں کراور کس حد تک واضح کیا جائے؟اس کے جواب میں اس نے چار رویے یا نظریے پیش کیے ہیں:

(۱) ادبی مورخ کے لیےصرف ادبی اثرات اہم ہیں۔اس کا کام ماضی کی ادبی تخلیقات کے ماخذ اور تحریکات کی تلاش کرنا ہے نیز ان تخلیقات کے بعد میں آنے والی تخلیقات پر جو اثر پڑے ان کی نشاندہی کرنا ہے۔

(۲) ادبی مورخ کے لیےصرف ادبی اثرات اہم ہیں۔اس کا کام ماضی کی ادبی تخلیقات کے ماخذ اور تحریکات کی تلاش کرنا ہے نیز ان تخلیقات کے بعد میں آنے والی تخلیقات پر جو اثر پڑے ان کی نشاندہی کرنا ہے۔

(۳) ادبی عوامل کے ساتھ تخلیق کار اور اس کا کلچر، نیز قارئین اور ان کے کلچر کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ''اسپلر کے نزدیک یہی بہتر نظریہ ہے۔''

(۴) چوتھا نظریہ یہ ہے کہ اسپلر وقت کو سیدھی لکیر نہیں مانتا بلکہ ایک نفسیاتی تصور،ایک دائرہ قرار دیتا ہے۔

اس چوتھے نظریے کے مطابق گیان چند جین کا یہ کہنا ہے کہ اس میں ادب پر دیومالا، اساطیر، علامتوں اور اقدار وغیرہ کے اثرات کو دیکھا جاتا ہے اور ساتھ ہی یہ واضح کیا ہے کہ دراصل یہ نقاد کا میدان ہے۔ دیومالا ادب نہیں بلکہ اس مواد کا حصہ ہے جس کے زیر اثر ادب وجود میں آتا ہے۔''۴۴؎

مختصر یہ کہ ادبی تاریخ کو نہ محض ادبی فن پاروں کی جمالیاتی کیفیت یا سوانحات کا مجموعہ ہونا چاہیے نہ تنقیدی مضامین کا اور نہ صرف بدلتے ہوئے مذاق سخن کی دستاویز، بلکہ اسے ایک فعال اور متحرک فن کی داستان ہونی چاہیے۔ اس بے جان چیز میں روح ڈالنے کے لیے مورخ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ زبان و ادب کے نشو ونما کے ساتھ ساتھ ان کے پیچھے بدلتے ہوئے حالات کی کہانی بھی پیش کرے۔ ادب میں کسی تخلیق یا تخلیق کار کا مقام متعین کرنا چاہے تو اس کے ثقافتی اور تہذیبی پس منظر کو سامنے رکھ کر تجزیہ کرے اور یہ دیکھنے کی کوشش کرے کہ مختلف سیاسی، سماجی، تہذیبی یا علمی اداروں نے تخلیق کار یا اس کی تخلیق پر کیا اثر ڈالا ہے۔ مورخ اگر بیسویں یا انیسویں صدی کی تاریخ لکھ رہا ہے تو اسے نہ صرف متعلقہ دور بلکہ اس سے پہلے ادوار کی تمام تر ادبی، سیاسی، سماجی اقدار کے بارے میں معلومات ہونی چاہیے۔ یعنی ان ادوار کے سماجی و معاشی حالات کیا تھے؟ ان مختلف ادوار میں مختلف اصناف کی اہمیت کیا تھی۔ اسی طرح یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ مورخ بھی اپنے دور، اپنے ماحول اور اپنے سماج کے رجحانات سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو غیر جانب دار رکھنے کی لاکھ کوشش کرے مگر ادیب اور اس کی تحقیق کی معیار بندی میں وہ اپنے دور کے رجحانات اور نظریات سے متاثر ہوکر ہی تاریخ لکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت ہم ایک ساتھ کئی دور کے ذہنوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس میں ایک دور تو وہ ہے جس کی تاریخ بیان کی جارہی ہے اور جس کے ادبی کارناموں اور ادبی زبان و بیان میں اس کے ذہن اور اس کے دور کی عکاسی ہوتی ہے۔ دوسرا دور مورخ کی تاریخ بیان کررہا ہے۔ مورخ کی پسند ناپسند، اس کے اپنے دور اور معاشرہ کی سوچ، زبان و اصطلاحات کی عکاسی اس کی تاریخ کے آئینے میں ہوتی ہے۔ مورخ کے دور میں کن اقدار کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، وہ کن شاعروں اور نثر نگاروں کو زیادہ پسند کرتا ہے اور کیوں؟ ادبی تاریخ انہیں سوالوں کا جواب خوبصورت اور مربوط کہانی کی شکل میں پیش کرتی ہے۔

○

حواشی:

(۱) ماضی کے مزار، سبط حسن، ناشر: ملک نورانی، مکتبہ دانیال، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی، آٹھواں ایڈیشن ۱۹۸۷ء ص:۱۰۳

(۲) تاریخ نگاری قدیم وجدید رجحانات (سید جمال الدین) مکتبہ جامعہ نئی دہلی، اشتراک قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سنہ اشاعت ۲۰۱۲ء، ص:۱۳

(۳) مصباح اللغات، مرتبہ: ابوالفضل مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، مکتبہ قدوسیہ اردو بازار لاہور، ناشر: ابوبکر قدوسی، اشاعت جولائی ۱۹۹۹ء ص:۳۵

(۴) فرہنگ آصفیہ (جلد اول) مولفہ مولوی سید احمد دہلوی، ترقی اردو بیورو (نئی دہلی) ۱۹۸۷ء ص:۵۹۱
۲-نوراللغات (جلد دوم) تالیف مولوی نورالحسن نیر، جنرل پبلشنگ ہاؤس (کراچی) ۱۹۵۹ء، ص:۲۱۳

(۵) اردو ادب کی تاریخوں کا تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو) مقالہ نگار: سیدہ افشاں زوار، نگراں ڈاکٹر محمد فخرالحسن نوری، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ص:۲

(۶) انسائیکلو پیڈیا تاریخ عالم (جلد اول) تالیف ولیم ایل لینگر، ترجمہ مولانا غلام رسول مہر، الوقار پبلی کیشنز (لاہور) ناشر سید وقار معین، سال اشاعت ۲۰۱۰ء، ص:۱۰

(۷) اردو ادب کی تاریخوں کا تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)، مقالہ نگار: سیدہ افشاں زوار، ص:۲/۳

(۸) تاریخ کے بدلتے نظریات، ڈاکٹر مبارک علی، پبلشرز، فکشن ہاؤس، ۱۸مزنگ روڈ لاہور، اشاعت، ۱۹۹۷ء ص:۳۸

(۹) اسلام کا نظریۂ تاریخ، محمد مظہر الدین، رفیق ادارہ ثقافت اسلامیہ، مطبوعات ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور (پاکستان) ۱۹۵۱ء ص:۱۵

(۱۰) مقدمہ ابن خلدون (حصہ اول) ترجمہ مولانا راغب رحمانی، طبع یازدہم ۲۰۰۱ء، ناشر نفیس اکیڈمی، اردو بازار، کراچی، ص:۱۱۳

(۱۱) اردو ادب کی تاریخوں کا تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)، مقالہ نگار: سیدہ افشاں زوار، ص:۴

(۱۲) الفاروق (حصہ اول) مولفہ علامہ شبلی نعمانی، باہتمام مولوی مسعود علی ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ میں چھپی، مطابع اول، سنہ اشاعت ندارد، تمہید میں ۱۸۹۸ء لکھا ہے، ص:۹/۱۰

(۱۳) تاریخ تمدن ہند، پروفیسر محمد مجیب، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۹ء ص:۱۷،

(۱۴) برہان اقبال، پروفیسر محمد منور، ناشر پروفیسر محمد منور، اقبال اکیڈمی، لاہور، پاکستان، طبع ثانی ۱۹۸۷ء ص:۵

(۱۵) تاریخ کے بدلتے نظریات، ڈاکٹر مبارک علی، ص:۷۷

(۱۶) تاریخ کے بدلتے نظریات، ڈاکٹر مبارک علی، ص:۷۱

(۱۷) تدریس تاریخ، خلیل الرب، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۶ء ص:۲۲

(۱۸) مقدمہ ابن خلدون (حصہ اول) ترجمہ مولانا راغب رحمانی، ص:۱۱۲

(۱۹) تاریخ کے بدلتے نظریات، ڈاکٹر مبارک علی، ص:۱۰۳

(۲۰) تدریس تاریخ، خلیل الرب، ص:۲۲

(۲۱) بدلتی ہوئی تاریخ، ڈاکٹر مبارک علی، پبلشر: فکشن ہاؤس، ۱۸مزنگ روڈ لاہور، اشاعت ۱۹۹۷ء ص:۲۱

(۲۲) ادب کیا ہے (مضمون) ڈاکٹر جمیل جالبی۔ www.urduweb.org

(۲۳) ادبی تاریخ کے اصول (مضمون) ظفر الحسن لاری، مشمولہ، اردو کی ادبی تاریخیں (نظری مباحث) مرتب سلمان احمد (پرویز احمد) قیصر الادب حیدر آباد ۱۹۹۹ء، ص:۳۵

(۲۴) ادب کا مقصد، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ہندوستان کتاب گھر، لکھنؤ، سن اشاعت ندارد، تعارف میں ۱۴/ اکتوبر ۱۹۵۶ء لکھا ہے،

ص:۱۳/۱۴

(۲۵) تاریخ ادب- مقاصد و حرکات (مضمون) ڈاکٹر سلیم اختر، مشمولہ، اردو کی ادبی تاریخ (نظری مباحث) مرتب سلمان احمد، ص:۱۵۷

(۲۶) تاریخ ادب اردو (جلد دوم) ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی، اشاعت ۲۰۱۳ء ص:۸/۷

(۲۷) برطانوی مستشرقین اور تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر علی جاوید، ثمر آفسیٹ پریس، نئی دہلی، اشاعت ۱۹۹۲ء ص:۲۳

(۲۸) اصناف ادب، ابوالاعجاز صدیقی، سنگت پبلشرز لاہور، ۲۰۱۲ء، ص:۳۲۴

(۲۹) اردو کی ادبی تاریخ، عبدالقادر سروری، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار مینار (حیدرآباد) ۱۹۵۸ء (پیش لفظ)

(۳۰) تاریخ ادب کا تنقیدی مطالعہ (مضمون) مظفر علی سید، مشمولہ، اردو کی ادبی تاریخیں (نظری مباحث) مرتب سلمان احمد، ص:۶۶

(۳۱) مضامین نو، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، اشاعت اول ۱۹۷۷ء، ص:۱۴۲

(۳۲) علی گڑھ تاریخ ادب اردو (تمہید) آل احمد سرور، ص: ج/د، پہلی جلد ۱۲۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک، شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

(۳۳) افشاں زوار، اردو، ص:۱۱

(۳۴) برطانوی مستشرقین اور تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر علی جاوید، ص:۱۹

(۳۵) تاریخ کے بدلتے نظریات، ڈاکٹر مبارک علی، ص:۲۷

(۳۶) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، انجمن ترقی اردو پاکستان، ڈی ۱۵۹، بلاک نمبر ۷، گلشن اقبال، کراچی ۵۳۰۰، سال اشاعت ۲۰۰۰ء ص:۲۶

(۳۷) برطانوی مستشرقین اور تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر علی جاوید، ص:۲۰

(۳۸) اردو ادب کی تاریخوں کا تنقیدی جائزہ (اردو)، افشاں زوار، ص:۱۱

(۳۹) برطانوی مستشرقین اور تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر علی جاوید، ص:۲۰

(۴۰) برطانوی مستشرقین اور تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر علی جاوید، ص:۲۰

(۴۱) اردو ادب کی تاریخوں کا تنقیدی جائزہ (اردو)، افشاں زوار، ص:۱۱/۱۲

(۴۲) برطانوی مستشرقین اور تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر علی جاوید، ص:۲۱

(۴۳) ایضاً، ص:۲۲

(۴۴) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:۲۳

باب دوم

ادبی تاریخ کے ابتدائی نقوش

(تذکروں کے حوالے سے)

تاریخ ادب کی ابتدائی اور بیاض کی ترقی یافتہ شکل کا نام تذکرہ ہے۔ گذشتہ زمانے میں انتخاب اشعار کے بڑھتے ہوئے شوق نے بیاض نگاری کی بنا ڈالی، بیاض نگاری نے آگے چل کر تذکرۃ الشعرا کی صورت اختیار کر لی اور پھر تذکرے نے تاریخ کی۔ بقول شیمہ رضوی: بھلا ہو بیاضوں اور کشکولوں کا جو ذاتی شغف کی بنا پر تیار کئے گئے اور مرور ایام کا سامنا کرتے ہوئے ہم تک پہنچ گئے[۱]۔ ان میں بعض بیاضیں اپنے مرتبین کے حسن انتخاب کی بدولت غیر معمولی شہرت واہمیت حاصل کر چکی ہیں اور بعض اس بنا پر اہم ہیں کہ ان کے ذریعے ایسے بے شمار شاعروں کے کلام اور ان کے ذہنی افکار ہم تک پہنچتے ہیں جن کے نہ تو دیوان شائع ہو سکے ہیں اور نہ ہی ان کا ذکر کسی تذکرے یا تاریخ کی کتاب میں ملتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بیاض میں انتخاب اشعار اور نام کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا تھا مگر انہیں بیاضوں میں جب انتخاب اشعار کے ساتھ ساتھ شعرا کے مختصر حالات کا اضافہ کیا گیا تو اس نے تذکرے کی شکل اختیار کر لی۔

پروفیسر حنیف نقوی لکھتے ہیں کہ:

> ''بیاض میں صرف پسندیدہ اور منتخب کلام ہی یکجا کیا جاتا ہے۔ ان بیاضوں میں علی العموم ہر شاعر کے نام و تخلص اور کبھی کبھی اس کے وطن اور سلسلۂ تلمذ کی بھی وضاحت کر دی جاتی ہے۔ لیکن تذکرہ نگاری کی طرح بیاض نویس پر تمام شاعروں کے مختصر تعارف کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔''[۲]

تذکرے میں مختصر تعارف اور مختصر تبصرے کے ساتھ ساتھ شعرا کے نام اور تخلص میں بھی خاص ترتیب پیدا کی گئی۔ کہیں ابجدی ترتیب ملحوظ رکھی گئی اور کہیں تہجی ترتیب کو ترجیح دی گئی۔ اس طرح تذکرہ بیاض سے آگے بڑھ کر نیم تاریخی، نیم تنقیدی اور نیم سوانحی فضا میں داخل ہو گیا۔ وقت اور ماحول کے

تقاضوں کے تحت تذکروں پر ادبی تاریخ، تنقید اور سوانح نگاری کا رنگ گہرا ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ تین رنگوں کا یہی آمیزہ تذکرہ کا فن قرار پایا۔

اردو شاعری کے تذکروں کی عام روش کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ:

''اردو شعرا کے تذکرے نہ تو شعرا کے حالات اور سوانح ہیں۔ نہ ان کے کلام کی تنقید ہیں اور نہ اردو ادب کی تاریخ کا کوئی جز ہیں۔ تذکرہ نگار شاعر کا نام اور تخلص، مختصر سا کچھ حال اور آخر میں کلام کا انتخاب لکھ دیتا ہے۔ ان میں کچھ شاعر ایسے ہیں جن سے وہ ذاتی طور پر واقف ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کا تھوڑا بہت حال دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا۔ بعض اوقات صرف نام یا تخلص پر اکتفا کیا ہے، تاہم ان میں کہیں کہیں ایسے اشارے ایسے جملے یا عبارتیں مل جاتی ہیں جن سے اس زمانے کے ادبی ذوق اور تنقید کلام کی روش یا شاعری کے بعض حالات کا پتہ چل جاتا ہے۔''[۳۳]

مولوی عبدالحق صاحب کے مذکورہ بیان سے ایک بات یہ نکل کر سامنے آتی ہے کہ تذکرے تاریخ ادب کا جز نہیں ہیں۔ لیکن نقوی صاحب کا یہ کہنا ہے کہ تذکرے تاریخ ادب کا ایک جز بھی ہیں اور اس کی بنیاد بھی۔ انھوں نے بلا استثنا تمام مورخین ادب کے لیے تحقیق و تلاش کی ظلمتوں میں چراغ راہ کا کام دیا ہے۔ ان کے متفق علیہ بیانات سے حقائق کے عرفان اور واقعات کی تعبیر میں مدد ملتی ہے اور اختلافی مباحث نے ارباب نظر کے ذوقِ تجسس کو بیدار کر کے تحقیقی شعور کی پرورش اور نشو و نما کے کے مواقع فراہم کئے ہیں[۳۴] تذکروں کا یہی وہ بنیادی کردار ہے جو ہر صائب الرائے شخص کو اس کی غیر معمولی اہمیت کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

تذکروں کی طرح تاریخ ادب میں نثر نگاروں کے ساتھ ساتھ شعرا کے احوال و آثار سے بحث کی جاتی ہے بس فرق یہ ہے کہ تذکرہ نگار شعرا کے تعارف میں تفصیل سے سروکار نہ رکھتے ہوئے محض ابتدائی قسم کی ضروری معلومات فراہم کرتے ہیں اور مورخ زبان و ادب کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کا جائزہ لے کر ادب پر ان کے اثرات کو واضح کرتا ہے۔ اس لحاظ سے ادبی تاریخ کا دائرہ

تذکروں کی بہ نسبت زیادہ وسعت کا حامل ہو جاتا ہے۔ شعرا کے مختصر حالات، کلام پر سرسری تبصرہ اور اشعار کا انتخاب تذکرے کے فنی عناصر ہیں اور تذکرہ نگار اسی محدود سی دنیا میں اپنے جوہر دکھاتا ہے اور مورخ کو اس کی جانب لوٹنے پر مجبور کرتا ہے۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی لکھتے ہیں کہ:

''اردو شعر و ادب کے تاریخی اور تحقیقی مطالعے کے لیے تذکرے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان تذکروں کے مطالعے کے بغیر نہ قدیم شعر و ادب کے فکری میلانات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ نہ اس عہد کے تنقیدی شعور کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے فنی معیاروں کو پرکھنے کی کوشش ہی کامیاب ہو سکتی ہے۔''[۵]

مختصر یہ کہ عہد ماضی کی یہ یادگاریں ہی تاریخ ادب کی پہلی منزل اور اس کی بنیاد ہیں۔ ادبی مورخین ابتدائی معلومات انہیں تذکروں سے حاصل کرتے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں اسے اپنی تاریخوں کا حصہ بناتے ہیں۔ قدیم اردو شاعری کے نمونے فراہم کرنے ہوں یا کسی شاعر کے سوانحی حالات کا بیان ہو، انہیں تذکروں سے مدد لی جاتی ہے۔ ان تذکروں میں مختلف اشارات کی صورت میں زبان و ادب کے ارتقاء کی جو داستان ملتی ہے یا قدیم شعرا کے کلام پر جو ذاتی رائے نما تنقید نظر آتی ہے وہ ادبی تاریخوں میں جا بہ جا دیکھی جا سکتی ہے۔

اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت

اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت دوسری اصناف ادب کی طرح فارسی کے واسطے سے داخل ہوئی۔ یہاں اس میدان میں ارباب قلم کی کاوشوں کے اولین نمونے ۱۱۶۵ھ/۵۲-۱۷۵۱ء کے قریب منظر عام پر آئے۔ اس وقت سے لے کر ''آب حیات'' کی اشاعت تک اردو شعرا کے کئی تذکرے مرتب کیے گئے لیکن ان میں بعض تذکرے نایاب ہیں مثلاً محمد یار خاں خاکسار، محمد رفیع سودا، سراج الدین علی خاں آرزو اور سید امام وغیرہ کے تذکرے کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا بلکہ ان میں سے بعض کا وجود بھی مشتبہ ہے۔ اس لیے ان کے آغاز و انجام یا نوعیت و کیفیت کے متعلق کوئی گفتگو لا حاصل ہے۔ ہاں قدیم ترین دستیاب تذکروں کو سامنے رکھ کر ان کی تقدیم و تاخیر کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اردو کے قدیم ترین تذکروں میں مندرجہ

ذیل کے نام لیے جاتے ہیں۔

۱۔نکات الشعرا	میر تقی میرؔ	۱۱۶۵ھ
۲۔گلشن گفتار	حیدر اورنگ آبادی	۱۱۶۵ھ
۳۔تحفۃ الشعرا	افضل بیگ قاقشال	۱۱۶۵ھ
۴۔ریختہ گویاں	فتح علی حسینی گردیزی	۱۱۶۶ھ
۵۔مخزن نکات	قیام الدین قائم	۱۱۶۸ھ ۷

سید عبداللہ نے تذکروں کو الگ الگ خصوصیات کی بنا پر تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ان کے مطابق اردو تذکرہ نویسی اپنے ارتقائی سفر میں تین اہم مراحل سے گزرتی ہے۔میر تقی میرؔ کا تذخرہ ''نکات الشعرا'' پہلا بڑا سنگ میل ہے۔دوسرا دور ''گلزار ابراہیم'' سے شروع ہوتا ہے جس میں تذکرہ نویسی پر جدید اثرت کا پرتو پڑتا ہے۔اس لیے یہ کتاب کسی حدتک جدید ماحول میں لکھی جاتی ہے اور اس میں بعض ایسی خصوصیات نظر آتی ہیں جو سابقہ تذکروں میں مفقود تھیں۔کریم الدین کے تذکرہ ''طبقات الشعرا'' کی اشاعت سے تذکرہ نویسی میں لٹریری ہسٹری کا رجحان پیدا ہوا ہے۔۸ اگر ڈاکٹر سید عبداللہ کے قائم کردہ ادوار کا مختصراً جائزہ لیں تو اردو تذکروں کا پہلا دور میر تقی میرؔ کے ''تذکرہ نکات الشعرا'' (مولفہ ۱۱۶۵ھ/۵۲-۱۷ء) سے لے کر اسد علی خاں اورنگ آبادی کے تذکرہ ''گل عجائب'' (مولفہ ۹۶-۱۱۹۴ھ/۸۲-۱۷۸۰ء) تک محیط نظر آتا ہے۔یہ دور حمید اورنگ آبادی (گلشن گفتار) سید فتح علی حسینی الگردیزی (تذکرہ ریختہ گویاں) قائم چاند پوری (مخزن نکات) اور میر حسن (تذکرہ شعرائے اردو) وغیرہ کا دور ہے۔اس دور میں لکھے جانے والے تذکرے کو اولین ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔یہ تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں ذکر اردو شعرا کا کیا گیا ہے اس لیے انتخاب کلام بھی اردو زبان ہی میں درج ہے۔اس دور کی واضح خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب تذکرے مختصر ہیں۔کیوں کہ اس دور میں صرف انتخاب کلام کا رجحان تھا۔ان تذکروں میں شعرا کی تعداد سو سے لے کر تین سو کے قریب تک پہنچتی ہے جس میں میر تقی میرؔ کا تذکرہ ''نکات الشعرا'' کلام پر تبصرہ اور آرا کے اعتبار سے سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔

اس کے بعد تذکرہ نگاری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں تمام قابلِ ذکر شعرا کو جگہ دی گئی ہے

اس لیے اسے جامعیت کا دور کہا جاتا ہے۔ یہ دور علی ابراہیمؔ کے تذکرہ ''گلزار ابراہیم'' مرقومہ ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء سے شروع ہو کر قطب الدین باطن کے تذکرہ ''گلستان بے خزاں'' مرقومہ ۶۵-۱۲۶۱ھ/ ۴۹-۱۸۴۵ء تک پھیلا نظر آتا ہے۔ اس دور میں لکھے جانے والے اہم تذکرے ''عیار الشعرا'' خوب چند ذکاؔء، مولفہ ۲۶-۱۲۳۱ھ/ ۱۸۱۲-۱۷۹۹ء، اعظم الدولہ سروؔر کا لکھا ہوا تذکرہ ''عبدہ منتخبہ'' مولفہ ۴۴-۱۲۱۶ھ/ ۲۹-۱۸۰۱ء اور قدرت قاسم کا تذکرہ ''مجموعہ نغز'' مولفہ ۱۲۶۱ھ/ ۷-۱۸۰۷ء ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی تذکرے لکھے گئے ہیں مثلاً گلشنِ ہند (بہ زبانِ اردو) گلشنِ بے خار، دستور الفصاحت اور خوش معرکۂ زیبا وغیرہ۔ اس دور میں لکھے جانے والے تذکروں میں شعرا کی تعداد چھ سو سے لے کر پندرہ سو تک ملتی ہے۔ اسی ضخامت کی وجہ سے بعض تذکروں میں کچھ خامیاں در آئی ہیں مثلاً تکرار کی کیفیت اور ناقص معلومات پر مبنی باتیں۔ بہر حال ''عیار الشعرا'' کو اس دور کا ضخیم ترین تذکرہ کہا جا سکتا ہے کیوں کہ اس میں تقریباً پندرہ سو شعرا کا ذکر ملتا ہے۔ معلومات کے اعتبار سے ''مجموعہ نغز'' کو ایک بہترین کوشش کہا جا سکتا ہے۔

تیسرے دور میں صرف انہی شعرا کے حالات و واقعات کا ذکر ملتا ہے جو اہم سمجھے جاتے ہیں۔ نیز تذکروں میں حالات و واقعات کے صحت وسند کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ یہ دور کریم الدیؔن کے تذکرہ ''طبقات الشعرا ہند'' مولفہ ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء سے لے کر مولانا محمد حسین آزاد کے تذکرہ ''آب حیات'' مولفہ ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء تک پھیلا نظر آتا ہے۔ اس کے بعد جو تذکرے لکھے گئے اس سے متعلق ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ:

> ''آب حیات کے بعد حقیقتاً تذکرہ نگاری کا دور ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ مغرب کے زیر اثر تنقید، تاریخ اور سوانح نگاری لے لیتی ہے۔ خود آب حیات طرز قدیم کے تذکروں سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اس میں اردو زبان کی تاریخ، لسانی مسائل، مختلف ادوار کی خصوصیات اور شعرا کی شخصیت و کلام پر رائے زنی کا وہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو تاریخ، سوانح کا خاصہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ اردو زبان و ادب کے تقریباً سارے ناقدین آب حیات کو اردو ادب کی پہلی تاریخی وتنقیدی کتاب خیال

کرتے ہیں.....اس سے انکار نہیں کہ آب حیات کے بعد بھی تذکرے
کے طرز پر متعدد کتابیں لکھی گئیں..."۹

گویا تذکرہ نگاری کی قدیم روش میں تبدیلی آئی اور دستاویزی شہادتوں کی بدولت مستند مواد پیش کیا جانے لگا۔ علاوہ ازیں شعری ولسانی روایات کی عہد بہ عہد ترقیوں کو ایک تاریخی دستاویز کی صورت میں منضبط کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان محرکات کی روشنی میں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ تذکرہ نگاری کا فن وقت اور حالات کے تقاضوں کا ردّعمل ہے۔ انسان کی ارتقا پذیر قوت فکر کی کرشمہ سازیاں، ماحول اور زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ان تقاضوں کی نوعیت اور ان کے نتائج کو ہر لحاظ سے نئے آب و رنگ سے آشنا کرتی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود ہر نسل کے فن کار اپنی راہ کے تعین اور کامیابی کے لیے بڑی حد تک اسلاف کے قدیم نقوش سے ہی رہنمائی حاصل کرتے ہیں اس لیے ان کے کارناموں کی اہمیت کبھی زائل نہیں ہوتی۔ تذکروں کا بھی یہی حال ہے۔ آج عملاً تاریخ ادب ان کی جگہ لے چکی ہے اور ان اغراض و مقاصد کی صورت گری کے لیے جن کی تکمیل کے ساتھ ان کی افادیت و مقبولیت کا دامن وابستہ تھا، علم و تحقیق کی وسیع تر شاہراہیں کھل گئی ہیں۔ تاہم کوئی انصاف پسند اور ذمہ دار مورخ یہ جرأت نہیں کر سکتا کہ ماضی کے اس عظیم ورثے کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر آگے بڑھ جائے۔۱۰ کیوں کہ انہیں تذکروں کی مدد سے حال کا رشتہ ماضی سے جوڑا جا سکتا ہے اور آئندہ بھی جب کسی ادبی گتھی کو سلجھانا ہوگا یا کوئی خلا پر کرنا ہوگا تو ان کی مدد سے ہی ایسے مراحل طے کیے جا سکیں گے۔ لہٰذا یہاں چند ایسے تذکروں کا مختصر تعارف پیشِ خدمت ہے جن میں تاریخ نگاری کا ابتدائی شعور نظر آتا ہے۔

نکات الشعرا:

میر تقی میرؔ (متوفی ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) نے فارسی نثر میں تین کتابیں "نکات الشعرا"، "ذکر میر" اور "فیضِ میر" یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں جو شہرت اور مقبولیت نکات الشعرا کے حصے میں آئی ہے وہ کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں۔ تذکرے کا صحیح سال تکمیل حنیف نقوی کے مطابق ۱۱۶۵ھ/۵۲-۱۷۵۱ء ہے۔ اسی درمیان چند اور تذکرے لکھے گئے۔ ان میں "گلشن گفتار" مولفہ حمید اورنگ آبادی اور "تحفۃ الشعرا" مؤلفہ

افضل بیگ قاقشال وغیرہ شامل ہیں، یہ تذکرے اسی سال مکمل ہوئے جس سال ''نکات الشعرا'' کی تکمیل ہوئی۔ تاہم محققین ''نکات الشعرا'' کو دوسرے تذکروں پر مقدم سمجھتے ہوئے اسے اولیت کا شرف عطا کرتے ہیں۔ یہ تینوں تذکرے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔مگران میں ''نکات الشعرا'' نے نہ صرف اپنے معاصر تذکرہ نگاروں بلکہ بعد میں آنے والے تذکرہ نگاروں کو بھی متاثر کیا ہے۔نقوی صاحب نے ''نکات الشعرا''، کو''گلشن گفتار''پر ترجیح دینے کی جو وجہ بیان کی ہے وہ یہ کہ:

''ہمارے یہاں تذکرہ نگاری کے موضوع پر بیشتر کام شمالی ہند میں ہوا ہے اور میر صاحب نے اپنے بعد آنے والے تذکرہ نگاروں کی زیادہ بہتر انداز میں رہنمائی کی ہے اس لیے بہ لحاظ ترتیب ان کے تذکرے کو ''گلشن گفتار''پر ترجیح دی گئی''۔[۱۱]

اس لحاظ سے ''نکات الشعرا'' ہماری ادبی تاریخ کا نقش اولین سمجھا جاتا ہے۔ اس میں کم وبیش (۱۰۴) شعرا کے حالات زندگی اوران کے کلام کا انتخاب موجود ہے۔لیکن یہ انتخاب میؔر نے نہ تو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا ہے اور نہ ہی موضوع یا زمانے کے اعتبار سے ڈاکٹر محمود الٰہی کے بقول:

''میؔر نے یہ تذکرہ بڑی رواروی میں لکھا۔ان کے سامنے شعرا کی ترتیب کا کوئی اصول نہ تھا۔انھوں نے نہ تو شعرا کی تقسیم طبقات کے لحاظ سے کی اور نہ ان کا ذکر حروف تہجی یا حروف ابجد کی ترتیب سے کیا۔شعرائے دکن کا ذکر یکا یک ایک مختصر سی تمہید کے ساتھ وسط کتاب میں آجاتا ہے اور پھر اس کے بعد کسی تمہید کے بغیر شمالی ہند کے شعرا جگہ پاجاتے ہیں۔''[۱۲]

اپنی کتاب کے مقدمے میں میؔر نے جہاں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس زبان (ریختہ) میں آج تک ایسی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی جس سے اس فن کے شاعروں کا حال صفحہ روزگار پر باقی رہے وہیں شمالی ہند کے شعرا سے اپنے تذکرے کی ابتدا کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ ''ریختہ دکن سے تعلق رکھتی ہے مگر چوں کہ اس مقام سے ایک بھی مربوط شاعر نہیں اٹھا اس لیے ان کے ناموں سے شروع نہیں کیا گیا اور اس ناقص

(یعنی مصنف) کی طبیعت اس طرف یوں بھی مصروف نہیں ہے کہ ان میں سے اکثر کا احوال ملول کرتا پھر بھی ان میں سے بعض کا احوال لکھا جائے گا...''۱۳؎ اس صراحت کے فوراً بعد امیر خسرؔو، مرزا عبدالقادر بیدلؔ اور مرزا معزفطرت موسویؔ وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ سب سے آخر میں قدرت اللہ، یکدلؔ اور پھر میرؔ نے اپنا ذکر کیا ہے۔ باقی پندرہ صفحے میں میرؔ کا انتخاب کلام ہے جس میں غزل کے اشعار، قطعات اور رباعیات سبھی شامل ہیں۔ اس کے بعد ایک صفحے کا خاتمہ ہے۔ اس خاتمے میں میرؔ نے ریختہ کی تعریف کی ہے۔ آخر کی چند سطروں میں دو ترقیمہ ہے۔ ایک ''ترقیمہ انجمن'' کے نام سے اور دوسرا ''ترقیمہ پیرس'' کے نام سے (صفحے کی تعداد اور ترقیمے ''نکات الشعرا'' مترجم ڈاکٹر حمیدہ خاتون کے حوالے سے دیا گیا ہے) تذکرے میں شعرا کے حالات اور ان کے زندگی کی واقعات کا بیان بہت مختصر ہے۔ علاوہ ازیں ولادت، وفات اور اہم واقعات کا ذکر بھی نہیں ہے جس کی وجہ سے ''نکات الشعرا'' کا تاریخی پہلو کمزور نظر آتا ہے۔ باوجود اس کے یہ کتاب اپنی بہت سی دوسری خصوصیات اور حاصل شدہ معلومات کی بدولت آج بھی اہم سمجھی جاتی ہے۔ پروفیسر حنیف نقوی رقم طراز ہیں:

> ''میر صاحب کے کمال فن اور نکات الشعرا کی شہرت و مقبولیت کا راز دراصل سیرت و شخصیت کے ان مرقعوں کی جاذبیت و جامعیت میں پنہاں ہے جو اچھی خاصی تعداد میں تذکرے کے اوراق پر جا بجا پھیلے ہوئے ہیں۔ الفاظ کے تاروپود سے بنائی ہوئی یہ تصویریں پرکشش بھی ہیں اور زندگی سے بھرپور بھی...''۱۴؎

''نکات الشعرا'' میں اس دور کی تہذیبی و معاشرتی زندگی، تخلیقی رجحانات اور لسانی معاملات واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میر کے معاصرین اور ان کے سماجی ماحول کے متعلق ایسی بہت سی معلومات ملتی ہیں جو کسی اور ذریعے سے نہیں مل سکتی تھیں۔ اسی طرح تذکرے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس دور میں بھی ادبی گروہ بندیاں بھی موجود تھیں، جس کے متعلق ڈاکٹر جمیل جالبی کا یہ کہنا ہے کہ میرؔ نے ان شعرا کے ذکر میں جانب داری برتی ہے جو ان کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں وہ شعرا بھی شامل ہیں جو آرزؔو سے وابستہ ہیں یا میرؔ سے جن کے ذاتی تعلقات اچھے ہیں یا جو میرؔ کے محسن اور رشتہ دار ہیں اور

ان شاعروں کو کم تر دکھایا ہے۔ جو مرزا مظہرؔ سے تعلق رکھتے ہیں۔'' ۱۵ اس ضمن محمود الٰہی کا خیال یہ ہے کہ میرؔ نے جس زمانے میں دہلی کو اپنا وطن ثانی بنایا۔ اس زمانے میں وہاں کے شعرا ذہنی طور پر دو الگ الگ حلقوں میں تقسیم ہو رہے تھے۔ ۱۶ غالباً یہی وجہ ہے کہ میرؔ بھی اس گروہ سے وابستہ ہو گئے جس کا ذکر اوپر کیا گیا، اور پھر میرؔ نے جب تذکرہ لکھا تو مرزا مظہرؔ سے وابستہ انعام اللہ خاں یقینؔ اور حزیںؔ کے بارے میں صرف یہ لکھا کہ یہ مرزا مظہر کے شاگرد ہیں اور اپنے استاد اور پیر و مرشد کے بارے میں جو لکھا وہ یہ ہے کہ:

> '' آب و رنگِ باغ نکتہ دانی، چمن آرائے گلزار معانی۔ بلاغت کہ جس کے لیے (بڑی) قوت درکار ہے۔ کے ملک کا فرمانروا، فصاحت کے میدان کا شہ زور شاعر، صفائے گفتگو سے (دل کو) باغ باغ کر دینے والوں (کے سلسلہ) کا چراغ (یوں ہی) روشن رہے۔۔۔ ہندوستان جنت نشان میں ان جیسا زبردست قادر الکلام شاعر، عالم و فاضل آج تک پیدا نہیں ہوا ہے۔ بلکہ یہ بحث ایران تک چلی جاتی ہے....'' ۱۷

اس بیان سے یہ واضح کرنا مقصود نہیں کہ اس میں کتنی صداقت ہے اور نہ ہی یہ دکھانا مقصود ہے کہ میرؔ نے جس کی تعریف کی وہ اس کے لائق نہ تھے یا جن کی تعریف نہیں کی وہ لائق تحسین تھے بلکہ یہ دکھانا مقصود تھا کہ اس طرح کی تحسین و تنقیص کا محرک صحیح جذبہ تنقید نہیں۔

پروفیسر محمود الٰہی کے بقول: یہ تذکرہ محض معاصرانہ چشمک کی وجہ سے منصۂ شہود پر آیا۔ ورنہ میرؔ کی تنقیدی بصیرت ایسی نہیں تھی کہ وہ میاں جگن اور میر گھاسیؔ کی تعریف کرتے اور بندرابن راقمؔ اور قدرت اللہ قدرتؔ کی تنقیص۔ نکات الشعرا میں شمالی ہند کے چند شعرا ملتے ہیں جن کی میرؔ نے تحسین کی ہے لیکن سبب تحسین واضح طور پر نہیں معلوم ہو سکا یا جن کی تنقیص کی گئی مگر محرک تنقیص کا پتہ نہیں چلتا..۱۸

ان خامیوں کے باوجود ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ ایک علمی نوعیت کی کتاب ہے جس کے مندرجات سے اختلاف تو ممکن ہے مگر اس کی افادیت سے انکار نہیں۔ تنقید سے قطع نظر اگر نکات الشعرا کا مطالعہ سوانحی اور تاریخی اعتبار سے کیا جائے تو اس کے ذریعے صرف یہ نہیں کہ میر کی زندگی اور شخصیت کے بعض اہم اجزا ہمارے سامنے آتے ہیں بلکہ جن شعرا کا ذکر میرؔ نے کیا ہے ان پر اور ان کے حالات پر بھی

اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں کہ:

''میر نے اپنے تذکرے میں ایک سو ساٹھ شاعروں کے قلمی چہرے پیش کیے ہیں لیکن ان رنگا رنگ صورتوں میں خود ان کے چہرے کی بھی اصلی جھلک موجود ہے۔ میر نے بعض صفات پر بہت زور دیا ہے اور ان کو اکثر شاعروں کی صورت میں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔''۱۹

ڈاکٹر سید عبداللہ کے نزدیک ''نکات الشعرا'' کا شاندار ترین وصف اس کی سیرت نگاری ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''میر نے سیرتوں کے جو خاکے پیش کیے ہیں ان میں سے بعض اپنے اختصار کے باوجود اتنے جامع اور پر معنی ہیں کہ ان سے ان اشخاص کی پوری پوری سیرت خیال میں آجاتی ہے۔ مثلاً یار باش، خوش اختلاط، ہنگامہ گرم کن مجلسہا، چسپاں اختلاط، خالی از دردمندی نبود، دیر آشنا، آشنائے بیگانہ وغیرہ وغیرہ سے سیرت کے بعض پہلو کتنی عمدگی سے روشن ہو جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں حد درجے کا اختصار ہے مگر ایک تذکرے میں اس سے زیادہ تفصیل نہ ممکن ہے نہ مناسب ہے۔''۲۰

مخزن نکات:

قائم چاند پوری (متوفی ۱۱۹۴ھ/۹۳۔۱۷۹۳ء) کے تذکرے کا نام ''مخزن نکات'' تاریخی ہے۔ جس سے تذکرے کا سال ترتیب ۱۱۶۸ھ/ ۵۵۔۱۷۵۴ء برآمد ہوتا ہے۔ سید عبداللہ کے مطابق ''یہ دبستان میر کا دوسرا تذکرہ ہے'' ۲۰ قائم نے تذکرۂ میر کے وجود سے بے خبری کا اظہار کرتے ہوئے اپنے تذکرے کے اولین ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ حالاں کہ تذکرے میں ریختہ کی تعریف اور اس کی ابتداء کے بارے میں جو حالات دیئے گئے ہیں وہ میر کے بیانات سے ملتے جلتے ہیں اور تحقیق یہ ہے کہ میر کا تذکرہ ''مخزن نکات'' سے کم و بیش تین سال پہلے مکمل ہو چکا تھا۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی لکھتے ہیں:

''قائم نے پہلے اپنا تذکرہ بیاض کی صورت میں مرتب کیا تھا۔اس بیاض کے آغاز کے بارے میں سب سے پہلی تاریخ ۱۱۵۷ھ/۴۴۔۱۷۴۴ء ملتی ہے۔ اس وقت اردو گو شاعروں کا کوئی تذکرہ مرتب نہ ہوا تھا۔ ۱۱۶۷ھ/۵۴۔۱۷۵۳ء میں احمد شاہ کے معزول ہوجانے اور عالم گیر ثانی کے تخت نشین ہونے کے بعد اس بیاض نے تذکرے کی شکل اختیار کرلی اور مصنف نے اس کا تاریخی نام ''مخزن نکات'' رکھا۔ جس سے ۱۱۶۸ھ برآمد ہوتے ہیں۔''[۲۱]

اس حساب سے اگر بیاض کے آغاز والی تاریخ (۱۱۵۷ھ/۴۴۔۱۷۴۴ء) کو تذکرے کی ابتدائی تاریخ مان لی جائے تو قائم اپنے دعوے میں حق بجانب ہوں گے۔ کیوں کہ میر کے تذکرے کا سال تکمیل ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء ہے۔

''مخزن نکات'' اس دور کے رواج کے مطابق فارسی زبان میں ہے اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں پہلی دفعہ اردو شاعری کے ادوار مقرر کیے گئے ہیں۔جس سے کہ قائم کے تاریخی شعور کا پتا چلتا ہے۔اگرچہ تذکرہ ''نکات الشعرا'' میں بھی کچھ نیم تاریخی سی ترتیب موجود ہے مگر قائم نے اس معاملے میں اصول بندی سے کام لیا ہے اور ہر دور کے شروع میں اس دور کی خصوصیات بھی بیان کی ہیں۔ڈاکٹر سید عبداللہ نے ''مخزن نکات'' کی اسی خصوصیت کے پیش نظر یہ لکھا ہے:

''تذکرہ نگاری میں یہ تاریخی احساس ''لٹریری ہسٹری'' کی طرف رجحان کا پہلا قدم ہے جو آگے چل کر آب حیات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔''[۲۲]

قائم نے مختلف ادوار کی ادبی ولسانی روایتوں کے فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے تذکرے کو تین طبقات میں تقسیم کیا ہے:

(۱) طبقۂ اول: در بیان اشعار شعرائے متقدمین

(۲) طبقۂ دوم: در ذکرِ کلام سخنواران متوسطین

(۳)طبقۂ سوم: در بیان اشعار واحوال سخن طرازان متاخرین

طبقۂ اول سعدؔی و امیر خسرؔو سے شروع ہو کر میر جعفر زٹلی کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔ طبقۂ دوم کا آغاز آبرؔو اور آرزؔو کے ذکر سے شروع ہوتا ہے اور کمترین پر انجام کو پہنچتا ہے اور طبقۂ سوم میں سب سے پہلے شمس الدین فقیر کا ذکر ہے اور سب سے آخر میں مولف نے اپنا ذکر کیا ہے۔ پہلے طبقے میں ۲۹ دوسرے میں ۳۲ اور تیسرے طبقے میں ۶۰ شاعروں کا ذکر ہے۔ قائم نے تذکرے میں شعرائے دکن کے حالات فراہم کرنے میں خاص اہتمام کیا ہے اور شاید یہی وہ وجہ ہے جس کی بنا پر ڈاکٹر اقتدا حسین نے یہ لکھا کہ:

> ''اس تذکرے کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اس میں شعرائے دکن کی ایک خاصی تعداد کو پہلی بار شمالی ہند سے متعارف کروایا گیا ہے۔ تذکرہ گردیزی میں دکنی شعرا کا ذکر ہے لیکن تعداد کم ہے اور معلومات محدود، میر کے ہاں نسبتاً زیادہ شعرا جگہ پاتے ہیں لیکن بیان احوال اور انتخاب اشعار تشنگی کی حد تک مختصر ہے، قائم کے ہاں مقابلتاً دکنی شعرا کی تعداد بھی زیادہ ہے اور ان کے بارے میں موصوف کی معلومات وسیع ترین ہے۔''[۲۳]

اس تذکرے میں چند خامیاں بھی ہیں۔ شعرائے دکن کے حالات کی فراہمی میں اگرچہ قائم نے اپنے معاصرین کو پیچھے چھوڑ دیا ہے لیکن سنین یا تاریخ وفات رقم کرنے کے سلسلے میں وہ اپنے معاصرین کے ساتھ ہی رہے۔ ''کیوں کہ اس وقت تک شعرائے اردو کے تذکروں میں اس کا التزام بہت کم تھا۔'' البتہ کہیں کہیں شعرا کے ذکر میں ایسے فقرے ملتے ہیں جن سے ان کے تاریخی شعور کا احساس ہوتا ہے اور سنین وغیرہ کے متعلق جاننا آسان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح شعرا کی سیرت نگاری کے ضمن میں قائم صرف توصیف تک ہی محدود رہتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے سیرت نگاری کے معاملے میرؔ کو قائم سے بہتر بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''میرؔ اور قائؔم کے تذکروں میں مواد کے لحاظ سے بہت زیادہ فرق نہیں تاہم سیرت کی خاکہ کشی میں میرؔ کو جو ید طولیٰ حاصل ہے وہ قائم کو نصیب نہیں۔ میرؔ خاکہ بناتے وقت مناسب الفاظ پر غیر معمولی قدرت کا

ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ نہایت جامع اور پر معنی ہوتے
ہیں۔لیکن قائم صرف چند القاب و آداب تک محدود رہتے ہیں جن میں
بے مقصد توصیف ہوتی ہے یا محض لفاظی۔''۲۴

سیرت نگاری سے قطع نظر تنقیدی شعور کی بات کی جائے تو قائم میر سے قدر بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے میرؔ کی طرح کہیں اپنے نشتر کا غلط استعمال نہیں کیا۔ ان کے سامنے نقد و جستجو کے جو بھی معیار تھے ان کی روشنی میں شعرا کے معائب و محاسن پرکھنے کی کوشش کی ہے اور ذاتی اختلافات کو اپنی رائے پر اثر انداز ہونے نہیں دیا۔ اس کے علاوہ تذکرے میں کہیں کہیں سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی اور سوانح نگاری کی بعض خصوصیات کی ترجمانی بھی ملتی ہے۔ بقول پروفیسر حنیف نقوی:

بحیثیت مجموعی ''مخزن نکات'' ایک گراں مایہ اور قابل قدر ادبی دستاویز ہے۔ جس کا مطالعہ اردو شاعری کے ارتقائی مدارج کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے صرف سودمند ہی نہیں ناگزیر بھی ہے۔''

طبقات الشعرا:

قدرت اللہ شوقؔ (متوفی: ۱۸۰۹ء) نے تاریخ عالم کے موضوع پر ''جام جہاں نما'' اور فارسی شعرا پر مشتمل تذکرہ ''تکملۃ الشعرا'' جیسی اہم کتابیں تخلیق کی ہیں لیکن اردو حلقے میں ان کی اصل شہرت و مقبولیت اس کتاب کی وجہ سے ہے جس نے بیاض کے مراحل سے گزر کر تذکرے کی شکل اختیار کر لی اور شوق نے اس کا نام ''طبقات الشعرا'' رکھا۔ اپنے دور کے رواج کے مطابق یہ تذکرہ بھی فارسی زبان میں ہے اور مؤلف نے تذکرے کا سال تکمیل ۱۱۸۸ھ/ ۷۵-۱۷۷۴ء لکھا ہے۔ تاہم محققین کا یہ کہنا ہے کہ تذکرے میں ۱۱۸۸ھ کے بعد بھی وقتاً فوقتاً ترمیم و اضافے ہوتے رہے اور تجدید و توسیع کا یہ سلسلہ ۱۲۱۰ھ/ ۹۶-۱۷۹۵ء کے قریب تک جاری رہا۔

''طبقات الشعرا'' ۲۸۸ شاعروں کے ذکر پر مشتمل ہے۔ جو امیر خسروؔ کے ذکر سے شروع ہو کر مولف تذکرہ قدرت اللہ شوق پر ختم ہوتا ہے۔ پھر ایک صفحے کا خاتمہ ہے اور چند سطروں میں ترقیمہ، خاتمے میں ریختہ کی قسمیں اور اس کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد ۳۵ صفحے کا ضمیمہ دیا گیا ہے (صفحے کی

تعداد نثار احمد فاروقی کی مرتب کردہ کتاب کے حساب سے ہے) جس میں الگ سے ۲۵ شاعروں کا ذکر ملتا ہے۔ اگر اسے بھی شامل کر لیا جائے تو تذکرے میں کل شعرا کی تعداد ۳۱۳ ہو جاتی ہے۔

تذکرے کو چار طبقات میں بانٹا گیا ہے۔ طبقۂ اوّل میں شعرائے دکن اور ان کے بعض معاصرین کا ذکر ہے۔ طبقۂ دوم میں ایہام گو شعرا کو جگہ دی گئی ہے۔

طبقۂ سوم میں شعرائے متاخرین اور بعض نومشق شاعروں کا ذکر ملتا ہے۔ طبقۂ چہارم میں تازہ گو اور نو آموز شاعروں کا تعارف ہے۔ اس آخری طبقے کو شوق نے پانچ مقالوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) پہلے مقالے میں تازہ گویوں کا ذکر ہے۔

(۲) دوسرے مقالے میں بعض سلاطین، وزرا، امرا اور سرکاری عہدہ داران کا ذکر ہے۔

(۳) تیسرے مقالے میں امرائے افغان کا ذکر ہے۔

(۴) چوتھے مقالے میں عزیزوں اور دوستوں کا۔

(۵) پانچویں مقالے میں بعض ایسے دوستوں اور نو آموزوں کا ذکر ہے جن کے پاس شعری سرمایہ زیادہ نہیں۔ البتہ اپنی موزونی طبع کی وجہ سے خود کو شعرا میں شمار کرتے ہیں۔

اسی طرح تذکرے میں شعرا کو ان کی عمر، عہد، مرتبہ، شاعری، استادی، قرابت داری، دوستی اور نومشقی کے لحاظ سے مختلف خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس مفصل اور واضح گروہی تقسیم کا فوری طور پر جو فائدہ ہوتا ہے وہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

> ''طبقات پر نظر ڈالتے ہی مختلف تاریخوں، علمی کتابوں، بیاضوں اور اردو فارسی کے تذکروں کی طرف ہمارا ذہن منتقل ہوتا ہے اور ہمیں کم و بیش اس کا فوری اندازہ ہو جاتا ہے کہ کسی شاعر کی مزید تفصیلات اور کہاں کہاں مل سکتی ہیں۔ یہ تذکرہ اس بات کا سراغ بھی دیتا ہے کہ تذکرے کی تالیف کے وقت کون کون سے شعرا اساتذہ کی صف میں شامل ہو گئے تھے.....غرض کہ اس تذکرے سے شعرا کے متعلق بعض ایسی تفصیلات ملتی ہیں جو سوانحی نقطۂ نگاہ

سے اس تذکرے کو خاصا اہم بنا دیتی ہیں۔'' ۲۵؎

''مخزن نکات'' کی تحریروں میں قائم کی ادبی اور علمی صلاحیتوں کے جن پہلوؤں کی جھلک جا بجا نظر آتی ہے، ان میں سب سے زیادہ نمایاں ان کا مورخانہ شعور ہے جو انھیں ان کے ہم عصر تذکرہ نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اس وصف خاص کا اظہار ان واقعات سے ہوتا ہے جو انھوں نے شعرا کے حالات میں ضمناً نقل کیے ہیں تواریخ و سنین کی کمی شوقؔ کے یہاں بھی موجود ہے لیکن بعض واقعات کی مدت متعین کر کے انھوں نے کسی حد تک اس نقص کی تلافی کر دی ہے۔ دوسری خوبی اس تذکرے کی یہ ہے کہ غزل کے اشعار کے ساتھ ساتھ دیگر اصناف سخن مثلاً قصیدہ، مثنوی، مخمس، رباعی وغیرہ نمونۂ کلام کو منتخب کیا گیا ہے جب کہ اس دور کے دوسرے تذکروں میں عموماً صرف غزل کے اشعار ہی کا انتخاب کیا گیا ہے۔

قدرت اللہ شوق کے بارے میں بعض محققین کی رائے یہ ہے کہ انھوں نے معاصر تذکرہ نگاروں سے اکثر جگہ استفادہ کیا ہے اور اس کا اعتراف اپنے تذکرے میں واضح طور پر کہیں نہیں کیا۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''قائمؔ اور میر حسنؔ کے تذکروں کا شوقؔ نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔ لیکن دونوں کے لیے گمان ہے کہ شوقؔ کے علم میں ہوں گے۔ قائمؔ کے تذکرہ ''مخزن نکات'' اور میرؔ کے تذکرہ ''نکات الشعرا'' سے اخذ و اقتباس کی صریح شہادتیں موجود ہیں....'' ۲۶؎

نقوی صاحب کا بھی یہی کہنا ہے:

> ''بعض قرائن سے اندازہ ہوا ہے کہ شوقؔ نے اس تذکرے کی ترتیب میں ''نکات الشعرا'' اور ''تذکرۂ ہندی'' کے علاوہ کچھ اور تذکروں سے بھی مدد لی ہے..... اور تذکرے کا انداز ترتیب ''مخزن نکات'' سے اثر پذیری کی نشاندہی کرتا ہے۔'' ۲۷؎

مختصر یہ کہ اپنی چند خامیوں کے باوجود یہ تذکرہ قابل قدر ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اردو کے ابتدائی تذکروں میں شامل ہے جس میں اردو زبان اور شاعری کے بارے میں بہت سی مفید اور دلچسپ باتیں ملتی

ہیں۔ پھر اس میں صف دوم وسوم کے بعض ایسے شاعروں کا ذکر ملتا ہے جن کو کسی اور تذکرے میں جگہ نہیں دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ مرتب کرتے وقت مورخ ان میں دی گئی معلومات سے فائدہ اٹھانے کے لیے اس کی طرف رجوع کرتا اور پھر ان معلومات سے ایسے نتائج اخذ کرتا ہے جن سے مروجہ روایات یا نظریات میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔

تذکرہ شعرائے اردو:

میر حسن (متوفی ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۴ء) کے تذکرے کا سال تکمیل ۱۱۹۱ھ/ ۷۸۔۱۷۷۷ء ہے۔ تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور ۳۰۴ شعرا کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اس تذکرے کی ترتیب سے قبل شعرائے اردو کے کئی تذکرے علمی و ادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ ان میں سے اکثر کا ذکر میر حسن نے بھی اپنے تذکرے میں کیا ہے۔ خاص طور پر وہ قائم کے تذکرے ''مخزن نکات'' سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ غالباً اسی تذکرے کی طرزِ ترتیب کی تقلید میں انھوں نے اپنے تذکرے میں متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے علیحدہ علیحدہ طبقات قائم کئے ہیں لیکن قائم کے برخلاف ان کے یہاں شعرا کی یہ گرہ بندی حروف تہجی کے مطابق ترتیب کی تابع ہے۔ یعنی اولاً تمام شاعروں کو تخلص کے حرفِ اول کی رعایت سے ردیف وار مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد ہر ردیف کے تحت متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے حالات و اشعار علیحدہ علیحدہ لکھے گئے ہیں۔ طبقۂ اول میں زیادہ تر دکنی شعرا کا ذکر ہے۔ دوسرا طبقہ ''اواخرِ عہدِ فرح سیر و ابتدائے سلطنت محمد شاہ'' سے متعلق ہے۔[۲۸] تیسرے طبقے میں معاصرین کا ذکر ہے۔ تذکرہ شاہ عالم آفتاب کے ذکر سے شروع ہو کر یاسؔ پر ختم ہوتا ہے۔ شعرا کے حالات اس دور کے رواج کے مطابق یہاں بھی بہت مختصر ہیں۔ لیکن قدما کے سلسلے میں یہ تذکرہ اس لیے مفید ہے کہ میر حسنؔ اپنے معاصرین میں سے اکثر کو ذاتی طور پر جانتے تھے جس کی وجہ سے انھوں نے ان کے متعلق صحیح اور درست معلومات اس تذکرے میں فراہم کی ہیں۔ بقول مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی:

> ''اس تذکرے کے زمانۂ تصنیف کی ایک خاص خوبی ہے اور وہ یہ کہ وہ ایسے زمانہ میں تصنیف ہوا ہے کہ دورِ سوم ختم اور دورِ چہارم شروع ہو رہا

تھا۔اس طرح مولف نے دونوں دور کے شعرا کے چشم دید حالات قلمبند کیے ہیں۔ میر، سودا، خواجہ میر درد اور حضرت مرزا مظہر کو دیکھا اسی کے ساتھ مصحفی، انشاء اور جرأت کو دیکھا...''۲۹

میر حسن نے حالات کی دریافت و تحقیق کے وسیع امکانات کے باوجود شعرا کے تعارف میں سوانحی پہلو کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے صرف سیرت و شخصیت کے بارے میں اظہار خیال اور کلام کے متعلق رائے زنی سے سروکار رکھا ہے۔ بقول حنیف نقوی: ''تذکرے میں نہ تو شاہ فصیح کے سال وفات کے علاوہ کسی دوسرے واقعے کا سنہ مذکور ہے اور نہ عام طور پر معلوم و مشہور باتوں کے علاوہ کسی شاعر کی داستان حیات سے متعلق کوئی خاص مواد ملتا ہے''۳۰ اس لیے سوانحی نقطۂ نظر سے اس دور کے تذکروں میں یہ تذکرہ کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں لیکن سیرت نگاری اور شخصیت کی مرقع کشی کے باب میں میر حسن اپنے عہد کے اکثر تذکرہ نگاروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر دہلی و لکھنؤ کے نامور اساتذہ اور ابھرتے ہوئے فن کاروں کے ذکر میں انھوں نے ان کی سیرت و شخصیت کے امتیازی پہلوؤں کو بڑی خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔

سیرت و شخصیت کے جائزے کی طرح تنقید سخن کے معاملے میں بھی میر حسن نے خوش سلیقگی اور صائب نظری کا ثبوت دیا ہے۔انھوں نے کسی شاعر کے اوصاف ذاتی وصفاتی کی تعریف یا اس کی کوتاہیوں کے بیان میں مبالغے سے کام نہیں لیا ہے۔ بلکہ عام طور پر ان کی رائیں خوش اخلاقی اور اعتدال پسندی پر مبنی ہیں۔بعض تنقیدی اشاروں سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ سنجیدہ ادبی ذوق اور بہترین تنقیدی شعور رکھتے تھے۔اس بارے میں مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی لکھتے ہیں:

''میر حسن صرف ادب اردو کے نقاد نہیں ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ فارسی شعرا کے کلام کی نقادی پر بھی پوری قوت تھی اور ہر ایک کے طرز کا جدا جدا اندازہ حاصل تھا۔ چنانچہ اساتذۂ اردو کے کلام کی طرز کو اساتذۂ فارسی کی طرز سے تشبیہ دیتے جاتے ہیں۔''۳۱

حاصل کلام یہ کہ یہ تذکرہ اپنی بعض خامیوں کے باوجود اردو ادب کی تاریخ میں امتیازی حیثیت کا

حامل ہے۔اس سے شاعری کے درجہ بدرجہ ارتقا کا پتا چلتا ہے اور شعرا کے متعلق بیشتر درست معلومات حاصل ہوتی ہیں جو ادبی مورخین کے کام آتی ہیں۔

گلشن ہند:

اردو ادب اور بالخصوص اردو نثر کے نشو ونما میں فورٹ ولیم کالج نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔اس ادارے کے زیر اہتمام فارسی،عربی اور سنسکرت کی بہت سی کتابیں اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں۔مرزا علی لطفؔ (م ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۳ء) کا تذکرہ ''گلشن ہند'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔یہ تذکرہ دراصل علی ابراہیم خلیلؔ کے فارسی تذکرے ''گلزار ابراہیم'' کا اردو ترجمہ ہے۔فارسی سے اردو میں منتقل کرنے کا کام گلکرسٹ کی فرمائش پر لطف نے ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء میں انجام دیا۔حیدر بخش حیدری کے ''گلشن ہند'' کے بعد شعرائے اردو کا یہ دوسرا تذکرہ ہے جس میں اظہار مطالب کے لیے اردو زبان کو اپنایا گیا ہے۔تذکرے میں صرف ۶۸ شاعروں کے حالات و اشعار درج کیے گئے ہیں۔لطفؔ کے بیان کے مطابق یہ اصل تذکرے کی پہلی جلد یا مجوزہ کام کا ایک حصہ ہے۔۳۲

''گلشن ہند'' کہنے کو تو ''گلزار ابراہیم'' کا ترجمہ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ لطف نے شعرا کے حالات اور کلام میں جا بجا اضافہ کیا ہے۔بالخصوص حکمراں طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کے حالات میں انھوں نے ذاتی معلومات یا تلاش و جستجو کی بنیاد پر جو تفصیلات فراہم کی ہیں اس کی وجہ سے اس تذکرے کی وقعت و اہمیت ''گلزار ابراہیم'' سے کافی بڑھ گئی ہے۔''گلشن ہند'' کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تذکرہ قدیم اردو نثر کا نمونہ اور قیمتی سرمایہ ہے۔مولوی عبدالحق اس تذکرے سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اس کے ذریعہ محقق علم اللسان کو اور نیز ان لوگوں کو جنہیں زبان کا چسکا ہے بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔چنانچہ ایک ظاہر بات جو ہمیں عام طور پر اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوئی،وہ یہ کہ دکن کی زبان میں بعض الفاظ جو روزمرہ بول چال میں آتے ہیں اور ہندوستانیوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔وہ درحقیقت پرانی زبان کی یادگار ہیں...''۳۳

زبان کی طرح شعرا کے سوانح اور تاریخی حالات کے متعلق بھی اس تذکرے سے بعض نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں مثلاً یہ انکشاف کہ ''میر تقی میؔر فورٹ ولیم کالج میں بغرض تالیف وتصنیف برائے ملازمت کرنل اسکاٹ کے روبرو پیش ہوئے لیکن پیرانہ سالی کے سبب وہ منتخب نہ ہو سکے۔'' اول اول اسی تذکرے سے ہوا ہے۔ اسی طرح شاہ عالم آفتاب، ابوالحسن تانا شاہ، آصف الدولہ، امیر خان انجام، قزلباش خاں امید اور سراج الدین علی خاں آرزؔو کے حالات مرزا علی لطف نے بڑی تفصیل سے لکھے ہیں اور اس تفصیل میں بعض ایسی باتیں ملتی ہیں جو اس سے پہلے کے تذکروں میں نہیں ہیں۔ ۳۴ شعرا کی تاریخ پیدائش، تاریخ وفات، سکونت، آبائی وطن اور تلمذ و استادی کی نشاندہی، ساتھ ہی لطف نے بعض جگہ ضمناً اپنے زمانے کے معاشی و معاشرتی حالات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ پروفیسر حنیف نقوی اس کی اہمیت و افادیت کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''تذکرے میں مفید اور معلومات افزا مواد کافی تعداد میں موجود ہے۔ خصوصاً لکھنؤ، عظیم آباد اور کلکتے سے متعلق شعرا کے بارے میں ہمیں اس سے بہت سی اہم اور کارآمد باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ اردو ادب کی تاریخ میں اس اعتبار سے بھی اس تذکرے کی اہمیت کبھی کم نہ ہوگی کہ اپنے موضوع سے متعلق یہ پہلی کتاب ہے جس میں شعرائے اردو کے تعارف کے لیے اردو زبان استعمال کی گئی ہے۔'' ۳۵

غرض کہ اس تذکرے سے قاری کے علم میں اضافہ ہونے کے ساتھ ہی تحقیق کی نئی راہیں بھی وا ہوتی ہیں جن خطوط پر چل کر ریسرچ اسکالر علم و ادب کے میدان میں اہم اضافہ کر سکتے ہیں۔

مجموعہ نغز:

حکیم قدرت اللہ قاسم (م ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۰ء) کا تذکرہ ''مجموعہ نغز'' بہ زبان فارسی ۱۲۲۱ھ/ ۷۔۱۸۰۶ء میں لکھا گیا۔ اس میں کل ۶۹۴ شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان شعرا میں قدیم شاعروں سے لے کر قدرت اللہ قاسم کے معاصرین تک موجود ہیں۔ تذکرے کا آغاز ایک دیباچے سے ہوتا ہے جس میں حمد و

نعت کے بعد اسباب تالیف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کے بعد کلام موزوں کی ابتدا اور فن شاعری کی اہمیت کے متعلق ایک تفصیلی مقدمہ قلم بند کیا گیا ہے۔ بقول پروفیسر حنیف نقوی:

> ''تذکرے کا جامع اور بسیط مقدمہ جن مباحث و مسائل پر مشتمل ہے ان کے ضمن میں قاسم نے کلام موزوں کے لیے اردو کو شرط اولین قرار دیا ہے۔ چنانچہ اگر کسی شخص کی زبان یا قلم سے غیر ارادی طور پر ایسی کوئی عبارت یا جملہ معرض وجود میں آجائے جو وزن و بحر کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو تو ان کے نزدیک اسے شعر کی تعریف میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔'' ۳۶

مقدمے میں شعر کی ابتدا، عربی میں شعر گوئی کا ارتقا، فارسی میں شعر گوئی کی ابتدا اور ارتقا، شاعری کا نثر پر برتر ہونا اور اپنے زمانے میں شعر اور شعرا کی ناقدری وغیرہ کا بیان مختلف عنوانات کے تحت مفصل انداز میں کیا ہے۔

قدرت اللہ قاسم نے مقدمے کے بعد فوراً شعرا کا ذکر شروع نہیں کیا بلکہ جن شعرا کے احوال و آثار اس وقت تک دستیاب ہو چکے تھے ان کا ذکر اجمالی طور پر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ایک ردیف کے تحت کتنے شعرا ہیں۔ ان میں کتنے شعرا ہم تخلص ہیں اور ان کا کلام کس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ شعرا جن کا علم اس وقت حاصل نہیں ہوا تھا ان کا ذکر اخیر میں تکملے کے طور پر کیا ہے۔ تذکرے میں قاسم نے بعض ممتاز شاعروں کے لیے ان کے تخلص کے ہم قافیہ فقروں کی شکل میں کچھ القاب مقرر کر دیئے ہیں جن کی شمولیت کے بغیر وہ ان کا نام لینا سوءِ ادب خیال کرتے ہیں۔ مثلاً مظہرؔ، میرؔ، دردؔ، سوداؔ، سوزؔ، فراقؔ، اور ہدایتؔ وغیرہ کا ذکر اس طور پر آیا ہے:

(۱) سخن سنج ہنر گستر مرزا جان جاناں مظہرؔ

(۲) سخن سنج بے نظیر محمد تقی میرؔ

(۳) مملکت سخن سازی را یکہ تازمرد خواجہ میر دردؔ

(۴) سر آمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سوداؔ

(۵) شاعر فصاحت افروز محمد میر سوزؔ

(۶) دوستدار سراپا وفاق حکیم ثناء اللہ فراقؔ

(۷) استاد صاحب درایت ہدایت اللہ خاں ہدایتؔ ۳۷

اسی طرح تذکرے سے اس زمانے کی ادبی اور سماجی فضا دونوں پر روشنی پڑتی ہے۔ بقول محمود شیرانی:

> ''فتنہ و آشوب کی گھنگھور گھٹائیں ہر وقت چھائی ہوئی تھیں۔ احمد شاہ ابدالی کی آمد اور بعد کے سیاسی واقعات نے مغلیہ سلطنت کے شیرازہ کو درہم برہم کر دیا ہے۔ دہلی ویران ہو رہی اور اس کے فرزند تلاش و معاش میں در بدر اور خاک بسر پریشان حال پھرتے ہیں۔ لیکن راجا سے پرجا تک جس کو دیکھو شعر میں ڈوبا ہوا ہے۔ ذکور و اناث، عامی و عالم، مسلمان و ہند، سلاطین و امرا بلکہ فرنگی زادوں تک میں یہ ذوق سرایت کر گیا ہے..... چنانچہ مجموعہ نغز کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ منیر قلعی گر ہے، محمد امان نثار معمار ہے، حسن بخش بخشی پارچہ فروش ہے، مون سنگھ شگفتہ لوہار ہے، میر صادق علی صادق فیل بان ہے، میر لطیف علی لطیف دلال ہے: محمد ہاشم شائق درزی۔'' ۳۸ وغیرہ وغیرہ

قدرت اللہ قاسم نے تذکرے کو زیادہ سے زیادہ جامع، دلچسپ اور مفید و کار آمد بنانے کی غرض سے شعرا کے تعارف میں حتی الامکان ان کے وطن، مقام پیدائش، حسب و نسب، اخلاق و عادات، مذہبی عقائد، علمی استدلال سلسلۂ تلمذ، مشاغل زندگی اور تصنیفی و تالیفی کارناموں کے متعلق تمام ضروری معلومات یکجا کرنے کی کوشش کی ہے مگر حالات زندگی کی فراہمی کے برخلاف تنقید کلام کے معاملے میں قاسم کا رویہ کوئی خاص نہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ:

> ''اس تذکرے میں حالات مفصل اور انتخاب بہ کثرت ہے لیکن افسوس ہے کہ ضبط سنین کی کوشش نہیں کی گئی اور تنقید بھی کچھ زیادہ نہیں۔'' ۳۹

''مجموعہ نغز'' تقریباً سات سو شاعروں کے حالات اور ہزاروں اشعار پر مشتمل ہے اس لیے اس قسم

کے تذکرے میں معدودے چند غلطیاں اس کی استنادی حیثیت کو متاثر نہیں کرتیں۔ کیوں کہ بہت سی دوسری خوبیوں کی وجہ سے یہ تذکرہ تاریخی اہمیت کا حامل بھی ہے اور مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' کا ماخذ بھی جس کی حیثیت ادب کی تاریخ میں بنیادی کی ہے۔

گلشن بے خار:

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ (م ۱۸۶۹ء) کے تذکرے کا سال تکمیل ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء ہے۔ لیکن یہ تذکرہ تکمیل کے تین سال بعد پہلی مرتبہ ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء میں مطبع دہلی اردو اخبار مولوی محمد باقر کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ شیفتہ کا یہ تذکرہ فارسی زبان میں ہے اور حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس تذکرے میں اردو شاعری کے ابتدائی زمانے سے تیرھویں صدی ہجری کے وسط تک کے ۶۷۶ شعرا کے حالات و اشعار درج ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوراس تذکرے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''گلشن بے خار'' قدیم دکنی شعرا سے لے کر انیسویں صدی کے وسط تک شعری تاریخ پر محیط ہے، اور اردو شاعری کے دو سو سالہ سرمائے کو اختصار کے ساتھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے..... شعرا کے حالات اگر چہ مختصر ہیں لیکن جو کچھ ہیں، قابل اعتبار ہیں۔ خاص طور پر شیفتہ نے غالبؔ مومنؔ، ذوقؔ، آزردہؔ اور شاہ نصیرؔ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ تاریخی اور ادبی دونوں لحاظ سے اہم خیال کیے جانے لائق ہیں۔''[۴۰]

انتخاب اشعار کے سلسلے میں شیفتہؔ کا مطمح نظر اچھے اشعار کا انتخاب تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنے تذکرے میں صرف انہیں شعرا کو جگہ دی ہے جن کا کلام کلی یا جزوی طور پر ان کے معیار پر پورا اترا ہے۔ پروفیسر حنیف نقوی صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''گلشن بے خار'' کی تالیف میں شیفتہؔ کی تمام تر توجہات پسندیدہ اشعار کے انتخاب اور ایک خاص نظم اور سلیقے کے ساتھ ان کی ترتیب پر مرکوز رہی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں انھوں نے تذکرہ نگاری کے دوسرے

مطالبات اور تقاضوں کو بنیادی طور پر نا قابل اعتبار تصور کیا ہے۔ اپنے
اس بنیادی نقص کے باوجود شعرائے اردو کے تذکروں میں شہرت و
اہمیت کا جو منصبِ بلند اس تذکرے کو حاصل ہے، وہ ''عیار الشعرا''،
''عمدہ منتخبہ'' اور ''مجموعہ نغز'' جیسے مبسوط تذکروں کو بھی میسر نہیں۔''۴۱

پسندیدہ اشعار کے انتخاب کے ساتھ ساتھ شیفتہ نے ان شاعروں کے کلام پر ناقدانہ رائیں بھی دی ہیں اور ناقدین ادب نے ''گلشن بے خار'' کے اسی پہلو کو سب سے زیادہ سراہا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے شیفتہ ایک اچھے ناقد بھی ہیں اور ان کی رائیں خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

''شیفتہ بہ نسبت شاعر کے ناقد کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔ اپنے
زمانے میں بھی ان کو یہی شہرت حاصل تھی اور اردو اور فارسی شاعری کے
اعلیٰ درجے کے نقاد اور سخن سنج سمجھے جاتے تھے۔ ان کا تذکرہ گلشن بے خار
ایک مبسوط اور مشہور تصنیف ہے اور ہمارے نزدیک وہ پہلا تذکرہ ہے
جس میں انصاف اور آزادی کے ساتھ اشعار کی تنقید کی گئی ہے۔''۴۲

آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''حالی سے پہلے کسی میں اعلیٰ درجے کی تنقیدی صلاحیت اگر ملتی ہے تو وہ
شیفتہ ہیں جن کی پسند کے بغیر غالب بھی غزل کو غزل نہیں سمجھتے۔''۴۳

مذکورہ اقوال کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے شیفتہ نے اپنی تمام تر ناقدانہ صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے بغیر کسی تخصیص کے ہر شاعر کے کلام کے متعلق ایک قطعی اور فیصلہ کن رائے دینے کی کوشش کی ہے اور ان کی یہ رائیں دوسرے تذکرہ نگاروں کی رایوں سے زیادہ جچی تلی اور زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ بقول حنیف نقوی: ''دراصل ''گلشن بے خار'' کے یہی وہ حصے ہیں جن کی بنا پر اسے اچھے تذکروں کی فہرست میں کوئی جگہ دی جا سکتی ہے۔''۴۴ بحیثیت مجموعی تذکرے میں شیفتہ کوئی ایسی بات پیدا نہ کر پائے جسے ان کا امتیازی کارنامہ قرار دیا جا سکے۔

تاریخ ادب ہندوستانی

معروف مستشرق گارساں دتاسیؔ کا تذکرہ ''تاریخ ادب ہندوستانی'' فرانسیسی زبان میں تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد ۱۸۳۹ء میں شائع ہوئی اور دوسری جلد ۱۸۴۷ء میں۔ پھر کچھ اضافے کے ساتھ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء کے درمیان دتاسیؔ نے اپنی تاریخ کا دوسرا ایڈیشن تین جلدوں میں شائع کیا۔ ایک فرانسیسی خاتون سکستان لیلیان نذؔر نے براہ راست فرانسیسی زبان سے اردو میں اس کا ترجمہ کیا اور تنقیدی حواشی و مقدمہ لکھ کر کراچی یونیورسٹی سے ۱۹۶۰ء میں پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اصل کتاب میں گارساں دتاسیؔ نے تین ہزار سے زائد شعرا و ادبا کا ذکر حروف تہجی کے لحاظ سے کیا ہے۔ جس میں سے دو ہزار آٹھ سو شعرا اردو ہندی سے تعلق رکھتے ہیں اور سکستان لیلیان نذر نے انھیں شعرا کا اردو ترجمہ کیا ہے۔[۴۵]

اس کتاب کا بہترین اور اہم ترین حصہ اس کا مقدمہ ہے جس میں اردو زبان کی تحقیق، اس کا ہندی سے تعلق، اردو ہندی شاعری اور اس کی اقسام پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ اس کے علاوہ ''دتاسی نے اردو کی پیدائش، ساخت، مزاج اور رسم الخط کے مسائل پر گفتگو کی ہے... اردو کی مقبولیت، اس کی ترقی کے امکانات اور اس کی وسعت بیان کا جائزہ لیا ہے۔ مسعود سعد سلمان سے لے کر غالبؔ کے عہد تک آٹھ سو سالہ ثقافتی و ادبی رفتار پر تاریخی نظر ڈالی ہے... سب سے آخر میں دتاسی نے تذکرہ نگاری کے طرز پر شعرا و مصنفین کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام درج کیا ہے۔''[۴۶] جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دتاسی نے اس تذکرے کے ذریعے ادبی تاریخ و تحقیق کے کام کو آگے بڑھانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔

اس تذکرے کی چند ایسی خصوصیات بھی ہیں جو اسے اردو زبان کے شاعروں پہ لکھے جانے والے دیگر تذکروں سے ممتاز کرتی ہے۔ سب سے پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ اسے ایک غیر ہندوستانی نے ایک غیر ملکی زبان میں تحریر کیا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دتاسی نے شعرا کے ساتھ ساتھ نثر نگاروں کو بھی جگہ دی ہے تیسری اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف اردو شعرا و ادبا کا ہی ذکر نہیں ہے بلکہ ہندی کے شعرا و ادبا بھی دتاسی کی توجہ کا مرکز بنے ہیں۔ ڈاکٹر رضیہ نور محمد اس تذکرے کے بارے میں لکھتی ہیں:

''گارسیں کی تاریخ ادب اردو تذکرہ نویسی کی تاریخ میں ایک انقلابی

قدم ہے۔ یہاں سے اردو تذکرہ نگاری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔
یہی وہ زمانہ ہے جب تذکرہ نگاری، تذکرہ اور تاریخ ادب کی کڑی بن
گئی۔ گارسیں کی تاریخ کے بعض اجزا کا ترجمہ و تلخیص ہماری تذکرہ
نگاری کی اسی روایت کا آغاز ہے جس کی پہلی کڑی آزاد کی ''آب حیات''
کو قرار دیا جا سکتا ہے۔''۴۷

اس تذکرے سے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ کا یہ کہنا ہے:

''اردوئے قدیم کی تحقیق اور تذکروں کی تنقید کی ابتدا دتاسی سے ہوئی
جس کا ہماری تذکرہ نویسی پر گہرا اثر پڑا، اس کے بعد جو مستند تذکرے
لکھے گئے ہیں ان سب پر اس کا پرتو نظر آتا ہے۔ ''ادب کی تاریخ'' کے
رجحان کا آغاز بھی تذکرۂ دتاسی سے ہوتا ہے۔''۴۸

دتاسی کے تذکرے میں واقعات کی غلطیاں اور ساتھ ہی علمی و ادبی بحثوں میں بہت سی کمزوریاں بھی ہیں لیکن اس کے باوجود بھی تذکرے کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، کیوں کہ ہندوستان سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر جس جگہ اور جس زمانے میں یہ ضخیم تذکرہ مرتب کیا گیا ہے اس جگہ اور اس وقت اس سے بہتر تالیف کی صورت آسان نہ تھی۔ بقول سید عبداللہ:

''اسے دتاسی کا کارنامہ خیال کرنا چاہیے کہ ہندوستان سے اس قدر دور ہونے
کے باوجود وہ ہندوستانی زبانوں کے متعلق اتنی مستند معلومات جمع کر سکا۔''۴۹

طبقات شعرائے ہند

''طبقات شعرائے ہند'' کے مؤلف کی حیثیت سے جہاں کریم الدین کا نام آتا ہے وہاں مسٹر فیلن اور گارساں دتاسی کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ اس کے سرورق پر انگریزی اور اردو میں یہ عبارتیں ملتی ہیں:

A HISTORY OF URDU POETS
CHIEFLY TRANSLATED FROM
GARCAN DE TASSY'S HISTORIES DE LA
LITERATURE HINDUSTANIE
BY

F.FALLON ESQR AND MOULVEE KAREEMUDDEEN
WITH ADDITION DEHLIE COLLEGE 1848

''شعرائے اردو کا مسٹر فیلن صاحب بہادر اور مولوی کریم الدین نے
گارساں دتاسی کے تاریخ سے ۱۸۴۸ء میں ترجمہ کیا اور نو سو چونسٹھ
شاعروں اردو گو کی اشعار اور حال بھی دواوین مختلفہ سے منتخب کر کے اس
میں مندرج کیا گیا۔'' ''کذا''

مذکورہ عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ تذکرے کا سال تکمیل ۱۸۴۸ء ہے لیکن اندرونی اندراجات سے پتا چلتا ہے کہ کریم الدین نے اسے ۱۸۴۷ء کے آخری ایام میں مکمل کیا اور اگلے سال ۱۸۴۸ء میں یہ چھپنا شروع ہو گیا۔ اس طرح ۱۸۴۷ء کو اس کا سال تصنیف اور ۱۸۴۸ء کو سال طباعت خیال کرنا چاہیے۔''۵۰ سرورق کی عبارت سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ یہ گارساں دتاسی کی تاریخ جلد اول کا (اردو) ترجمہ ہے لیکن اشعار کے انتخاب اور اپنے معاصرین کے حالات کے بیان میں مولف نے جا بہ جا اضافہ کیا ہے جس کی وجہ سے یہ گارساں کی تاریخ کا ترجمہ نہیں بلکہ مولف کی ذاتی کتاب معلوم ہوتی ہے اور خود گارساں دتاسی نے اپنے پانچویں خطبے (۴ دسمبر ۱۸۵۴) میں یہ لکھا ہے کہ:

''یہ درحقیقت میری تاریخ کی پہلی جلد سے حذف و اضافے کے ساتھ
تالیف کی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ ایک نئی کتاب ہو گئی ہے اور استفادہ
کے لیے کار آمد ہے۔ اضافہ تقریباً تمام کا تمام یا تو خاندان تیموری کے
شاہزادوں کے حالات کا ہے جو اپنا وقت بہلانے کے لیے اردو شاعری
کیا کرتے تھے یا دہلی کالج کے پروفیسروں سے متعلق ہے۔ پروفیسروں
کا ذکر دلچسپ ہے ایک تو اس لیے کہ اہل علم و فضل کا ذکر ہے۔ دوسرے
اس وجہ سے کہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔''۵۱

تذکرے کے آغاز میں ایک قابل قدر مقدمہ ہے۔ یہ مقدمہ بھی بقول فرمان فتح پوری ''دراصل گارساں دتاسی کے مقدمے سے ماخوذ ہے۔'' جس میں خاصی تفصیل سے تذکرہ اور تاریخ کا فرق بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اردو کی ابتدا، تذکروں کی تنقید نیز دکنی اور برج کا حال لکھا ہے۔ مقدمے کے بعد

حروف تہجی کے لحاظ سے شعرا کا ذکر ہے۔

کریم الدین نے کتاب کو قسم اول، قسم دوم اور تکملہ کے نام سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔جس کی تفصیل مؤلف کے الفاظ میں اس طرح ہے۔

قسم اول: اس میں حال متقدمین کا ہے جو (زبان) ہندی (کے) اکثر مصنف گزرے ہیں۔

قسم دوم: (اس میں چار طبقات قائم کئے ہیں)

طبقۂ اول: ان میں ان شعرا کا ذکر ہے جو بانی اردو کے تھے اور اس زبان اردو کے شیوع میں کوشش بلیغ کی۔

طبقۂ دوم: اس میں ان شعرا کا ذکر ہے جو مصلح اردو اور مروج زبان کے تھے اور انھوں نے الفاظ کریہہ کا استعمال یک قلم زبان ریختہ سے موقوف کیا۔

طبقۂ سوم: اس میں وہ شاعر ہیں جو طبقہ دوم کے شاگرد تھے۔ ان کو الفاظ صحیحہ اور محاورات کے دلچسپ استعمال کرنے کا بہت شوق تھا۔

طبقۂ چہارم: اس طبقے میں وہ شاعر ہیں جو کہ ہم عصر اس بندہ کے ہیں اور ان سے ملاقات بندہ کی ہے یا اکثر جائے پر ان کو دیکھا ہے یا آنکہ ان کا حال سنا ہے اور ملاقات نہیں ہوئی۔

تکملہ: اس میں وہ شاعر ہیں جن کی تاریخ وفات یا حیات کی معلوم نہیں ہوئی گرچہ وہ کسی اور طبقہ کے لائق تھے مگر بہ سبب نہ ملنے ان کی تاریخ کے داخل تکملہ ان کو کر دیا۔''۵۲

اس کے بعد (خاتمہ) کے عنوان سے اردو شاعری کی تاریخ کا اجمالی ذکر ہے اور ہر طبقے کے نامور شعرا کے نام و کام کی دوبارہ نشاندہی کی ہے۔اس طبقاتی تقسیم کے سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا کہنا ہے کہ:

> ''خاتمے میں مصنف نے ہر طبقے کے اکابر شعرا کا ذکر کیا ہے لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ مولوی کریم الدین نے باوجود تاریخی ذمہ داری کے احساس کے بعض شعرا کو غلط جگہ دی ہے۔قلی قطب شاہ کو طبقۂ ثانی میں سجاد اکبرآبادی کو طبقۂ سوم میں۔ ابن نشاطی کو طبقۂ دوم میں شمار کیا ہے .....ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیباچے میں مولف نے جن اصول وقواعد کا اعلان کیا ہے ان پر پورا عمل نہیں ہوسکا۔''۵۳

کریم الدین نے شعرا کے حالات نسبتاً تفصیل سے دیئے ہیں۔ مگر اپنے معاصرین کے حالات کے بیان میں کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ بقول عطاء الرحمان عطا کاکوی: معاصر شعرا کے حالات میں بھی مولف نے کدو کاوش سے کام نہیں لیا بلکہ سہل نگاری اور عدم توجہی کو راہ دی ہے۔'' ۵۴؎ اسی طرح تاریخی حوالوں کے ضمن میں سنین کا التزام بہت کم ہے اور ان کی نوعیت بھی ایک سی نہیں ہے۔ کہیں صرف عیسوی سنہ دیا ہے اور کہیں ہجری جس کی وجہ سے کسی شاعر کے صحیح دور کا اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے البتہ اس تذکرے کی ایک بڑی خوبی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

> ''یہ تذکرہ ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم ماخذ ہے۔ اس کا سوانحی اور تنقیدی لب ولہجہ عام تذکروں سے مختلف ہے۔ اس میں سیاسی و معاشرتی ماحول کی تصویریں بھی ہیں اور مصنفین وشعرا کے متعلق بے لاگ رائیں بھی اس میں مبالغہ وتصنع یا پاس داری ولعن وطعن کا وہ انداز نظر نہیں آتا جو قدیم تذکروں کی خصوصیت ہے۔'' ۵۵؎

اس تذکرے میں بھی مجموعی طور پر بہت سی خامیاں ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ کریم الدین نے دتاسی کے بنائے ہوئے خاکے اور مواد کا استعمال کر کے اپنے تذکرے کو ایک نئی ترتیب اور ایک نیا رنگ دینے کی خاصی کامیاب کوشش کی ہے۔ پروفیسر محمود الٰہی اس تذکرے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''دتاسی کی ادبی تاریخ کا تصور کریم الدین کے ہاتھوں قوت سے عمل میں آیا۔ اس نے اپنی تاریخ کا ایک خاکہ پیش کیا تھا اور کریم الدین نے اسے ایک زندہ حقیقت بنا کر پیش کیا۔ ایک نے اپنی کتاب کو جو نام دیا اس کے ساتھ وہ بوجوہ انصاف نہ کر سکا اور دوسرے نے سچ مچ تذکرے کو تاریخ بنا دیا۔'' ۵۶؎

خلاصہ

گذشتہ صفحات میں مختلف تذکروں کی جن خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرے ہمارے سرمایۂ ادب کا ایک گراں قدر حصہ ہیں جسے نظر انداز کر کے نہ تو ہم اردو شاعری کے مطالعے میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور نہ اپنے ادبی وتنقیدی شعور کے آغاز وارتقا کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں کیوں کہ یہی وہ تذکرے ہیں جن کے ذریعے اکثر شعرا کا سال وفات، تاریخ پیدائش، سکونت، ولدیت، شاگردی، استادی، مزاج، پسندیدہ صنف، طرز ادا اور ان کا شاعرانہ محفلوں، سماجی رسموں اور اخلاقی قدروں کا سراغ بھی ملتا ہے۔ حنیف نقوی کے بقول: ہم نے اکثر اپنے قدیم شاعروں کو انہی تذکروں کے ذریعے جانا اور پہچانا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہماری ناقدانہ بصیرت بھی انھیں تذکروں کی فضا میں پروان چڑھی ہے اور انھیں تذکروں سے ہمارے یہاں سیرت نگاری اور تاریخ نویسی کے فن کا آغاز بھی ہوا ہے۔''۵۷ اگر چہ ان تذکروں میں حالات اور سیرت کے جو نقشے پیش کیے گئے وہ مختصر ہیں لیکن تنقیدی نگاہ ڈالنے میں پس منظر کا کام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں کہ:

> ''...تذکرہ نگار جن الفاظ یا اصطلاحات کو استعمال کرتا ہے، اس کا ایک وسیع پس منظر ہے، اس لیے وہ سہ حرفی یا چہار حرفی لفظ یا چند لفظوں سے بنا ہوا جملہ صرف وہی معنی نہیں دیتا جو اس لفظ کے ظاہری یا لغوی معنی ہیں بلکہ وہ اپنے پورے سیاق وسباق کی ترسیل کرتا ہے اس طرح وہ رائیں جو لفظوں کے استعمال کی وجہ سے مختصر نظر آتی ہیں اتنی مختصر بھی نہیں ہیں۔ مثلاً جدید اصطلاحات میں اگر یہ کہا جائے کہ غالبؔ کے یہاں تفکر ہے، انیسؔ کے کلام میں بڑی بلاغت ہے، فانیؔ قنوطی شاعر ہیں، فیضؔ کی عظمت ان کے نظریۂ حیات میں پوشیدہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ تو ہر جملہ اس شخص کے بارے میں ایک تنقیدی نظریے اور رجحان کو پیش کرتا ہے.....اسی طرح تذکروں میں استعمال کئے جانے والے الفاظ کو بھی دیکھنا ہوگا۔''۵۸

ادبی نکتوں کے ساتھ ان تذکروں میں اس زمانہ کی طرز معاشرت پر بھی روشنی ڈالی جاتی تھی اور جو منظر سامنے آتا ہے اس کا نقشہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے نکات الشعرا کے مقدمے میں یوں کھینچا ہے:

''اس زمانے کی معاشرت کی مضبوطی دیکھو، تمام فطرت ومصائب سے بالاتر ہوکر اپنی وضع اور صفت پر قائم تھی۔ میؔر صاحب کے بیان کوغور سے پڑھو تو صاف عیاں ہو جاتا ہے کہ اس عہد کے شرفا کی خصوصیات یہ تھیں۔ خوبی اخلاق، زندہ دلی، محبت اور محبت کا نباہ، علم وفن کا ذوق اور اس کی خدمت، سپہ گری اور خودداری وضعداری.....فن ادب کی خدمت میں بزرگان دین، شعرا، امرا، طبقہ اوسط۔ اہل قلم اور اہل سیف سب کے سب یکساں توجہ اورانہماک کے ساتھ مصروف تھے۔''۵۹

میر تقی میؔر کا تذکرہ ''نکات الشعرا'' شعرائے اردو کا اہم ترین تذکرہ تسلیم کیا جاتا ہے اس میں میر نے مختلف شاعروں کے حالات زندگی اوران کی سیرت کا بیان اس انداز سے کیا ہے کہ ان شاعروں کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ بقول سید عبداللہ: ''نکات کا شاندار ترین وصف اس کی سیرت نگاری ہے۔''۶۰ نکات الشعرا کے بعد دوسرے تذکرے یا تو میؔر کے جواب میں لکھے گئے یا اس کی نقل میں۔ کچھ دوستوں اور ساتھیوں کی فرمائش پر اور کچھ سرپرستوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے ترتیب دیئے گئے۔ بہرحال ان میں بعض تذکرہ نگاروں نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے اس ضمن میں ''تذکرہ شعرائے اردو'' مولفہ میرحسن کا نام سرفہرست ہے اس میں کافی حد تک تنقیدی رجحان کی عکاسی ملتی ہے اور میرحسن نے اس میں اردو شاعروں کا مقابلہ فارسی کے شاعروں سے کیا ہے۔ ساتھ ہی زبان کی صفائی اور محاورات کی صحت پر بھی زور دیا ہے۔

علاوہ ازیں قائؔم، مرزا علی لطفؔ، شیفتؔہ اور مولوی کریم الدین کے تذکرے بھی تنقیدی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں کہ:

''تذکروں میں ان تنقیدی اشاروں کی بڑی اہمیت ہے۔ دراصل ہماری جدید تنقید کی بنیاد یہی اشارے ہیں۔ تذکروں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ نگار جس شاعر کا ذکر کرتا ہے اس کے کلام پر خود بھی رائے دیتا ہے۔ یہ رائیں تعریف میں زمین وآسمان ایک کردیتی ہیں یا

اعتراض میں عیب چینی تک پہنچ جاتی ہیں۔لیکن بہت سی رائیں محاسن اور معائب کو نگاہ میں رکھ کر دی گئی ہیں۔اس لیے قدیم طرز تنقید میں یہ رائیں بھی کافی اہمیت رکھتی ہیں۔دوسری چیز جو ان تذکروں کے مطالعے سے سامنے آتی ہے یہ ہے کہ بعض تذکروں میں اردو شعرا کا مقابلہ فارسی شعرا سے کیا گیا ہے۔یہ مقابلے مختصر ہونے کے باوجود نہایت اہم ہیں۔''[٦١]

عام طور پر تذکروں میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔شاعر کے مختصر حالات، اس کے کلام پر تبصرہ اور شاعر کے کلام کا انتخاب ان میں بعض ایسے بھی تذکرے شامل ہیں جو کسی خاص زاویۂ نگاہ سے کسی خاص حلقے کی ترجمانی اور کسی خاص مقصد کے تحت لکھے گئے ہیں۔بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی:

''تذکروں میں سب سے پہلی چیز حالات کا بیان ہے جس سے شاعروں کی شخصیت اور ماحول کا تھوڑا سا اندازہ ہوتا ہے۔ہر چند کے یہ بیان بہت ہی مختصر ہوتا ہے اور بہ قول کلیم الدین احمد ''شاعر کی پیدائش، اس کا خاندان، اس کی زندگی کے مختلف واقعات، اس کی تصنیفات، اس کی تعلیم و تربیت، اس کا ماحول، ان میں سے کسی کے متعلق کافی تشفی بخش سامان نہیں ملتا'' لیکن اس مختصر بیان سے اس شاعر کی زندگی اور اس کے ماحول کا ایک دھندلا سا خاکہ ضرور آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ہر چند کہ اس کو ہم مکمل نہیں کہہ سکتے لیکن ساتھ ہی یہ حکم بھی لگانے کی ہمت نہیں ہوسکتی کہ یہ بیان بالکل بے کار ہے۔''[٦٢]

جدید تحقیقات سے ان میں سے بہت سی معلومات ہمارے کام کی نہیں رہتیں یا ان کی اہمیت کم ہو جاتی ہے مگر اس کے باوجود یہ تذکرے اپنی جگہ اہمیت کے حامل رہیں گے۔کیوں کہ جب تک کوئی مستند، مکمل اور جامع ادبی تاریخ نہیں لکھی جاتی۔عہد گذشتہ کی گمشدہ کڑیوں کی تلاش میں ہمیں بار بار ان سے مدد لینی پڑے گی۔بقول پروفیسر حنیف نقوی:

''ہمیں اپنے شعرا اور بالخصوص شعرائے متقدمین کے حالات زندگی کے

سلسلے میں بیشتر معلومات انھی تذکروں سے حاصل ہوئی ہے جو بظاہر
ناقص اور نامکمل نظر آتے ہیں۔ البتہ ان شاعروں کو جن کے متعلق تمام
تذکروں کے مطالعے کے بعد بھی ہمارا علم انتہائی محدود رہتا ہے۔ اس
کلیے سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے لیکن ان مستثنیات کو کسی فیصلے کا معیار نہیں
بنایا جاسکتا۔ کیوں کہ وہ شعرا جن کے حالات کو بیسیوں تذکرہ نگاروں
میں سے کسی ایک شخص نے بھی شرح و بیان کے لائق نہ سمجھا۔ یقیناً کسی
ادبی اہمیت کے لائق نہ ہوں گے۔"[٦٣]

بہر حال بہ حیثیت مجموعی تذکروں میں خوبیاں بھی ہیں اور خامیاں بھی۔ مگر افسوس کہ ان خوبیوں کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے ہاں ان کی خامیوں کو بڑے شد و مد سے بیان کیا ہے اور ان میں قدیم تذکرہ نگار اور جدید ناقدین دونوں شامل ہیں۔"[٦٤] اور ان خامیوں کی وجہ سے تذکرے اور تذکرہ نگاروں پر جو اعتراضات وارد کیے گئے ہیں اس کا خلاصہ سید عبداللہ کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

(۱) تذکرہ نگاروں کا مقصد صداقت اور انصاف نہ تھا بلکہ وہ رعایت سے
کام لیتے تھے۔ جانب داری ان کا شعار تھا اور خودستائی ان کا مقصود۔
(۲) تذکروں میں تحقیق و تنقید نہیں۔ محض انتخاب کلام ہے اور جامعیت
کی کوشش کے پیش نظر خاص و عام میں امتیاز قائم نہیں رکھا۔
(۳) ان میں تاریخیں نہیں ملتیں اور ان کی تدوین میں تاریخ نگاری کے
اصول پر عمل نہیں کیا گیا۔
(۴) ان سے شاعروں کے عہد بہ عہد ارتقا اور نشیب و فراز کا پتہ نہیں چلتا۔
(۵) ان سے مفصل حالات معلوم نہیں ہوتے اور بجنسہٖ تحقیق کے بجائے
نقل در نقل ہوتی ہے اور بعض صورتوں میں ماخذ کا ذکر نہیں ہوتا۔[٦٥]

ان میں بعض اعتراضات کے صحیح ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن یہ اعتراض کہ وہ شاعر کی زندگی کے حالات و واقعات بالتفصیل بیان نہیں کرتے، یہ صحیح نہیں لگتا۔ کیوں کہ اول تو بیشتر تذکرے جس زمانے میں

لکھے گئے ہیں اس زمانے کے محدود وسائل ومعلومات کی بنا پر یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی شخص اپنے تمام معاصرین ہی کے حالات زندگی کی فراہمی میں کامیاب ہو جائے۔ چہ جائے کہ وہ ان لوگوں کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات بہم پہنچائے جو اس سے بہت پہلے گزر چکے ہیں۔ایک اعتراض یہ ہے کہ ان کی تدوین میں تاریخ نگاری کے اصول پر عمل نہیں کیا گیا۔اس سلسلے میں نقوی صاحب کے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ نگاری کے لیے جس باقاعدگی، نظم وضبط اور ربط وتسلسل کی ضرورت ہے وہ اگر تمام تذکروں میں نہیں تو چند تذکروں میں ضرور موجود ہے۔ قائم چاند پوری اور میر حسن اپنے تذکروں میں متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے لیے علیحدہ علیحدہ ادوار قائم کئے ہیں۔قدر اللہ شوق نے شعرا کو ان کے کلام کے معیار و مذاق اور فنی ولسانی خصوصیات کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ درجہ بندی شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا اور وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے رجحانات ومیلانات کی نمائندگی کرتی ہے۔ چنانچہ ان تذکروں کی مدد سے ہی ہم اردو کی لسانی تعمیر وتہذیب اور شاعرانہ روایات کے رد وقبول کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔۶۶ لہٰذا اگر ان میں چند نقائص ہیں بھی تو اس کی بنا پر پوری صنف کو دفتر بے معنی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بقول فرمان فتح پوری:

> ''ہمیں تذکروں پر تنقیدی وتحقیقی قلم اٹھاتے وقت اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ وہ ایک ایسے عہد، ماحول اور ادبی فضا میں لکھے گئے ہیں جن میں نقد شعر اور سخن فہمی کا معیار آج کے معیار سے بالکل مختلف تھا۔ ان تذکرہ نگاروں کے سامنے قدیم فارسی تذکروں کے سوا ادبی تنقید، سوانح اور تنقید کے وہ جدید اصول یا نمونے موجود نہ تھے جن کی آڑ لے کر انھیں مطعون اور کم رتبہ خیال کیا جاتا ہے۔اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے مذاق ادب، طرز تنقید اور انداز تذکرہ نگاری کو بیسویں صدی عیسوی کے نقطۂ نگاہ سے جانچنا کسی طرح مناسب نہیں۔''۶۷

تذکروں کی قدر و قیمت کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کے لیے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ تذکرہ نویسی کا فن نہ تو براہِ راست تاریخ نگاری کے ذیل میں آتا ہے، نہ اسے فن سیرت یا سوانح نگاری

کے تحت رکھا جا سکتا ہے اور نہ اس کا دائرہ کار تنقید کی طرح صرف اچھے برے کی پرکھ تک محدود ہے بلکہ در حقیقت یہ ان تمام فنون یا اصناف ادب کا آمیزہ اور بجائے خود ایک فن یا صنف ادب ہے۔ تذکرہ نگار شاعر کے مختصر حالات زندگی قلم بند کرتا ہے، اس کی شخصیت کی تعمیر میں کارفرما عوامل کا ذکر کرتا ہے، اس کی وضع قطع اور عادات واخلاق کی کیفیت بیان کرتا ہے اور اس کے کلام کی خوبیوں اور خامیوں پر اجمالی انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں بطور نمونہ چند اشعار پیش کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو جاتا ہے۔[۶۸]
اس کے باوجود ان تذکروں کو کم حیثیت یا بیکار نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ جو لوگ ان تذکروں کو آج کے معیار یا اپنے خاص رجحانات ومعتقدات کے تحت دیکھیں گے تو انھیں ضرور مایوسی ہوگی۔ البتہ جو لوگ ان تذکروں کو اس خاص فضا میں لے جا کر دیکھنے کی کوشش کریں گے جن میں وہ لکھے گئے ہیں تو ان تذکروں میں انھیں ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں باتیں کام کی مل جائیں گی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں:

''ان تذکروں سے ان ایام کی معاشرت اور زندگی کے نقشے آنکھ میں پھر جاتے ہیں۔ ان سے ان لوگوں کا معیار اخلاق و معاشرت ہمیں معلوم ہو جاتا ہے۔ ان تذکروں ہی میں ادبی وعلمی حلقوں کے مشاغل اور تفریحوں کا حال ان کی علمی مجلسوں، مشاعروں اور مراختوں کی سرگذشت مل جاتی ہے۔ ان کے اخلاق اور کمزوریاں، ان کی رقابتیں اور کشمکشیں، وضع داریاں اور پاس داریاں، ان کے توہمات وتکلفات اور دید و وادید کے طریقے، باہمی سلوک ومراعات۔ ان کے ردوقبول اور ہماری پسند و ناپسند کے معیار غرض سارے نظام معاشرت کا روشن تصور آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ بلا شبہ یہ تذکرے ہماری ادبی تاریخ کا قیمتی سرمایہ اور ہماری قدیم معاشرت اور تہذیب کی بڑی قابل قدر یادگاریں ہیں ان کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔[۶۹]

حواشی:

(۱) شعرائے اردو کے تذکرے (نکات الشعرا سے گلشن بے خار تک) پروفیسر حنیف نقوی، اتر پردیش اردو اکادمی (لکھنؤ) ۱۹۹۸ء ص:۵
(۲) ایضاً، ص:۲۴
(۳) اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، سیدہ افشاں زوار، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۰۸ء، ص:۳۲
(۴) شعرائے اردو کے تذکرے، حنیف نقوی، ص:۲۴
(۵) رسالہ تذکرات، گارسیں دتاسی، مترجم منشی ذکاء اللہ دہلوی، مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی، سنہ اشاعت و مطبع ندارد، ص:۶ (یہ کتاب ریختہ پر موجود ہے)
(۶) شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، ڈاکٹر سید عبداللہ، مکتبہ خیابان ادب لاہور، طبع ثانی، ۱۹۶۸ء، ص:۱
(۷) اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مجلس ترقی اردو ادب لاہور، طبع اول ۱۹۷۲ء، ص:۲۵
(۸) شعرائے اردو کے تذکرے، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص:۱۱
(۹) اردو شعرا کے تذکرے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص:۴۵
(۱۰) شعرائے اردو کے تذکرے، پروفیسر حنیف نقوی، ص:۳۴
(۱۱) ایضاً، ص:۱۷۹
(۱۲) نکات الشعرا، میر تقی میر، مرتبہ محمود الٰہی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۴ء مقدمہ، ص:۱۵
(۱۳) نکات الشعرا، میر تقی میر، مترجم حمیدہ خاتون، جے کے آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۱۹۹۴ء، مقدمہ مصنف، ص:۱۴
(۱۴) شعرائے اردو کے تذکرے، حنیف نقوی، ص:۱۸۸
(۱۵) ادبی تحقیق، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۱۹۹۴ء، ص:۳۰۸
(۱۶) نکات الشعرا، مرتبہ محمود الٰہی، مقدمہ مرتب، ص:۱۰
(۱۷) نکات الشعرا، مترجم حمیدہ خاتون، ص:۱۶
(۱۸) نکات الشعرا، مقدمہ محمود الٰہی، ص:۱۴
(۱۹) میر تقی میر: حیات اور شاعری، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۱۹۵۴ء، ص:۵۲۶
(۲۰) شعرائے اردو کے تذکرے، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص:۲۷
(۲۱) دستور الفصاحت: حکیم سید احمد علی خاں یکتا، تصحیح مولانا امتیاز علی خاں عرشی، ہندوستان پریس رامپور، ۱۹۳۴ء، دیباچہ مصحح، ص:۵۹
(۲۲) شعرائے اردو کے تذکرے، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص:۳۹
(۲۳) مخزن نکات، قیام الدین قائم چاند پوری، مرتبہ پروفیسر اقتدا حسین، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول ۱۹۷۲ء، مقدمہ مرتب، ص:۳۵
(۲۴) شعرائے اردو کے تذکرے، سید عبداللہ، ص:۳۹
(۲۵) اردو شعرا کے تذکرے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص:۱۴۸
(۲۶) تذکرہ طبقات الشعرا، قدرت اللہ شوق، مرتبہ نثار احمد فاروقی، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول ۱۹۶۸ء، مقدمہ مرتب، ص:۵۷
(۲۷) شعرائے اردو کے تذکرے، حنیف نقوی، ص:۳۰۵
(۲۸) ایضاً، ص:۳۲۵

(۲۹) تذکرہ شعرائے اردو۔ میر حسن، بہ تصحیح وتنقید، مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ۱۹۴۰ء، مقدمہ مصحح، ص:۲

(۳۰) شعرائے اردو کے تذکرے، حنیف نقوی، ص:۳۲۷

(۳۱) تذکرہ شعرائے اردو، میر حسن، مقدمہ حبیب الرحمان خاں شروانی، ص:۱۲

(۳۲) شعرائے اردو کے تذکرے، حنیف نقوی، ص:۶۹۲

(۳۳) تذکرہ گلشن ہند، مرزا علی لطف، کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد، دکن، ۱۹۰۶ء، مقدمہ مولوی عبدالحق، ص:۱۶

(۳۴) اردو شعرا کے تذکرے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص:۲۱۱

(۳۵) شعرائے اردو کے تذکرے، پروفیسر حنیف نقوی، ص:۵۰۸

(۳۶) ایضاً، ص:۶۵۰

(۳۷) اردو شعرا کے تذکرے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص:۲۳۸

(۳۸) مجموعہ نغز، قدرت اللہ قاسم، مرتبہ محمود شیرانی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۳۳ء دیباچہ مرتب، ص: (لح)

(۳۹) شعرائے اردو کے تذکرے، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص:۴۷

(۴۰) اردو شعرا کے تذکرے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص:۲۹۲

(۴۱) شعرائے اردو کے تذکرے، پروفیسر حنیف نقوی، ص:۶۸۲

(۴۲) تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، مترجم مرزا محمد عسکری، مطبع تیج کمار بک ڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ، حضرت گنج لکھنؤ ۱۹۹۹ء، ص:۱۱۱

(۴۳) تنقید کیا ہے، پروفیسر آل احمد سرور، مکتبہ جامعہ (لمیٹڈ) جامعہ نگر، دہلی ۱۹۷۲ء، ص:۱۸۶

(۴۴) شعرائے اردو کے تذکرے، حنیف نقوی، ص:۸۰۷

(۴۵) اردو شعرا کے تذکرے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص:۶۱

(۴۶) ایضاً، ص:۳۰۵

(۴۷) اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ، سیدہ افشاں زوار، ص:۴۰

(۴۸) شعرائے اردو کے تذکرے، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص:۶۱

(۴۹) ایضاً، ص:۶۱

(۵۰) اردو شعرا کے تذکرے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص:۳۵۹

(۵۱) خطبات گارساں دتاسی، مترجم وشائع کردہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) ۱۹۳۵ء، ص:۹۶

(۵۲) طبقات شعرائے ہند، مولوی کریم الدین، اترا پردیش، اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۳ء، ص:۱۴

(۵۳) شعرائے اردو کے تذکرے، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص:۶۴

(۵۴) طبقات شعرائے ہند، ایف فلن و مولوی کریم الدین، مرتبہ عطاء الرحمان عطا کاکوی، ۱۹۶۳ء، (طبقہ چہارم) عرض مرتب، ص: (د)

(۵۵) اردو شعرا کے تذکرے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص:۳۶۴

(۵۶) طبقات شعرائے ہند، مولوی کریم الدین، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۳ء مقدمہ محمود الٰہی، ص: (ذ)

(۵۷) شعرائے اردو کے تذکرے، پروفیسر حنیف نقوی، ص:۱۰۷

(۵۸) جدید اردو تنقید اصول ونظریات، ڈاکٹر شارب ردولوی، مطبوعہ اعلیٰ پریس، دہلی ۱۹۷۴ء، ص:۱۵۷

(۵۹) نکات الشعرا، میر تقی میر، مقدمہ حبیب الرحمان شروانی، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں، سن اشاعت ندارد، ص:۱۷

(۶۰) شعرائے اردو کے تذکرے، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص: ۲۷

(۶۱) جدید اردو تنقید اصول و نظریات، ڈاکٹر شارب ردولوی، ص: ۱۶۰

(۶۲) اردو تنقید کا ارتقا، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۷ء، ص: ۸۸

(۶۳) شعرائے اردو کے تذکرے، پروفیسر حنیف نقوی، ص: ۱۳۷

(۶۴) اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص: ۳۷

(۶۵) شعرائے اردو کے تذکرے، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص: ۸۰

(۶۶) شعرائے اردو کے تذکرے، پروفیسر حنیف نقوی، ص: ۱۳۷

(۶۷) رسالہ نگار (تذکروں کا تذکرہ نمبر) نگار پاکستان، ۳۲ گارڈن مارکیٹ کراچی، مؤلفہ و مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مئی و جون، سالنامہ ۱۹۶۵ء، ص: ۳۲

(۶۸) شعرائے اردو کے تذکرے، پروفیسر حنیف نقوی، ص: ۱۱۷

(۶۹) شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص: ۱۰۴

باب سوم

رام بابو سکسینہ اور اعجاز حسین سے قبل ادبی تاریخ کے نمونے

(الف) آب حیات

(ب) گل رعنا

(ج) شعر الہند

(الف) آب حیات:

اردو کے نامور انشا پرداز، نقاد، مورخ اور ماہر تعلیم محمد حسین آزاد (۱۸۳۰ء-۱۹۰۵ء) دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی، اس کے بعد دہلی کالج میں داخلہ لیا۔ یہ وہی کالج ہے جہاں سے حالؔی، ڈپٹی نذیر احمد، منشی ذکاء اللہ، ماسٹر پیارے لال آشوب جیسے باکمال لوگ پڑھ کر نکلے اور انہوں نے آسمان ادب پر اپنے کمال ہنرمندی اور اپنی معرکتہ الآرا تصانیف کی بدولت اپنی مستحکم شناخت قائم کی۔

آزاد کے والد مولوی محمد باقر کے ذوقؔ سے گہرے مراسم تھے۔ اس لیے آزاد کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ذوقؔ کی ہمدردیاں بچپن ہی سے حاصل تھیں۔ شعر و سخن کا مشغلہ بھی استاد ذوقؔ کے زیر سایہ پروان چڑھا اور انہوں نے باقاعدگی کے ساتھ ان کی شاگردی اختیار کی۔ ذوقؔ کی وفات کے بعد حکیم آغا جان عیشؔ سے اصلاح لینے لگے۔ ۱۸۵۷ء کی خونی واردات کے بعد آزاد دہلی سے لکھنؤ پہنچے، وہاں شعری محفلوں میں شرکت کی، لیکن بہت جلد آزاد نے لکھنؤ کو بھی خیر باد کہا اور وہاں سے عروس البلاد ممبئی پہنچے۔ یہاں اپنے قیام کے دوران انہوں نے فارسی زبان و ادب کے مطالعہ و تحقیق کے شوق میں پارسیوں کے مذہبی صحیفے اور زبان کا بھی بہ غور مطالعہ کیا۔ بمبئی میں بھی آزاد کا قیام بہت مختصر رہا اور جلد ہی بمبئی کو خیر باد کہہ کر پنجاب پہنچے۔[۱] یہاں کا قیام محمد حسین آزاد کی علمی و ادبی زندگی کے لیے سازگار ثابت ہوا۔ دراصل یہی وہ جگہ ہے جہاں پہنچ کر آزاد کے تخلیقی اور تصنیفی جوہر نکھر کر سامنے آئے۔ تصنیف و تالیف کا بیشتر کام انہوں نے یہیں کیا۔ نصابی کتب کے علاوہ متعدد علمی و ادبی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ ان کی تصانیف میں 'آبِ حیات، سخن دانِ فارس، دربارِ اکبری اور 'نیرنگِ خیال' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بقول مسعود حسن رضوی ادیب:

''یہ گویا چار ستون ہیں کہ حضرت آزاد کی شہرت کا قصر رفیع انہیں پر قایم ہے۔ان میں بھی جو شہرت ''آبِ حیات'' کو حاصل ہے وہ کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں......اردو زبان یا اردو شاعری کی ابتدا اور ارتقا کے متعلق جب کوئی کچھ لکھنا چاہتا ہے تو اس کے لیے آبِ حیات کا مطالعہ ناگزیر گزرتا ہے۔''۲

''آبِ حیات'' اردو شاعری کے ارتقا کی ایسی تنقیدی دستاویز اور اس سے بڑھ کر ایک ایسا صحیفہ ہے جس میں زندگی کی پوری گہما گہمی، ہلچل اور تڑپ موجود ہے۔اس بنا پر یہ کتاب آج بھی حیات آفریں ہے۔آب حیات کو ''آبِ حیات'' آزاد کے ایک خاص طرح کے مزاج نے بنایا، جو بیک وقت تنقیدی بصیرت کی حامل بھی ہے اور اپنی لطیف اور نازک خصوصیات کے ساتھ پورے طور پر مشرقی بھی۔اس مزاج کا تجزیہ حقیقت میں آزاد کی تنقید کا تجزیہ ہے۔

آزاد کی یہ شہرۂ آفاق کتاب پہلی مرتبہ کس سنہ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی اس سلسلے میں محققین کی مختلف آرا ہیں۔ڈاکٹر محمد صادق، مظفر حنفی اور مرتضٰی حسین فاضل کا خیال ہے کہ ''آبِ حیات'' پہلی مرتبہ ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئی۔۳ جب کہ حافظ محمود شیرانی، اسلم فرخی اور آغا محمد باقر ۱۸۸۰ء کو درست قرار دیتے ہیں۔۴ حافظ محمود شیرانی اپنے اس خیال کی تائید میں پنڈت دھرم نرائن کا ایک خط مورخہ ۲۱/ فروری ۱۸۸۱ء پیش کیا ہے، جس میں پنڈت جی نے باضابطہ آزاد سے کتاب کا تقاضہ کیا ہے۔۵ محمود شیرانی کے خیال کی تصدیق حالی کے ایک خط سے ہوتی ہے۔حالی نے یہ خط ۱۷/ستمبر ۱۸۸۰ء کو آزاد کے نام لکھا تھا جس میں حالی نے ''آبِ حیات'' کی چھپائی شروع ہونے پر مسرت کا اظہار کیا ہے اور ریویو لکھنے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔۶ آب حیات کے سنہ اشاعت سے متعلق سب سے بڑی شہادت اس کا وہ سرورق ہے جس کی خبر امتیاز علی عرشی نے دی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''آبِ حیات' کے پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ کتاب خانہ عالیہ رام پور میں محفوظ ہے۔یہ ۱۸۸۰ء (۱۲۹۷ھ) میں لاہور کے وکٹوریہ پریس میں سید رجب علی شاہ کے اہتمام سے چھپا تھا۔''۷

''آبِ حیات'' کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۳ء میں شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن ۱۸۸۷ء، چوتھا ۱۸۹۰ء اور پانچواں ایڈیشن ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد بھی آب حیات کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے اور ان میں اکثر آج بھی دستیاب ہیں۔

''آبِ حیات'' سے متعلق محمد حسین آزاد کا یہ بیان ''الحمدللہ کہ چند روز میں جس قدر پریشان خیالات تھے بہ ترتیب جمع ہو گئے، اسی واسطے سے اس مجموعے کا نام ''آبِ حیات'' رکھا ہے۔[۸] جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب آزاد کے چند دنوں یا چند ہفتوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ آزاد کے ذہن میں یہ کتاب لکھنے کا خیال بہت پرانا تھا۔ اگر چہ یہ کتاب ۱۸۸۰ء میں منظرِ عام پر آئی، اس سلسلے میں ڈاکٹر مظفر حنفی لکھتے ہیں:

> ''۱۸۷۶ء سے آزاد باقاعدگی کے ساتھ اس موضوع پر مواد حاصل کرنے لگے تھے، اور اپنے احباب و اعزہ سے اس سلسلے میں مسلسل خط و کتابت کرتے رہے۔ اس طرح پانچ، چھ برسوں کی محنت شاقہ کا نتیجہ ''آبِ حیات'' کی صورت میں سامنے آیا۔''[۹]

ڈاکٹر اسلم فرخی کا خیال ہے کہ ''آزاد کی یہ تالیف کم و بیش پندرہ برس کی ریاضت اور محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔''[۱۰] لیکن درگا پرشاد نادر کے خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے ''آبِ حیات'' کو لکھنے کا باقاعدہ آغاز ۱۸۷۴ء یا اس سے پہلے کیا تھا۔ کیوں کہ درگا پرشاد نادر نے اپریل ۱۸۷۴ء میں آزاد کے نام ایک خط لکھا جس میں ''آبِ حیات'' کے لیے قطعۂ تاریخ لکھ کر بھیجا تھا، اور یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اسے تذکرے میں شامل کیا جائے۔[۱۱] ڈاکٹر محمد صادق نے اس کڑی کو ۱۸۵۷ء سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''غدر سے پہلے ہی ان کی خواہش تھی کہ شاعروں کے حالات تمام و کمال جمع کیے جائیں، چنانچہ استاد ذوقؔ سے ان کے حالات کرید کرید کر پوچھتے اور ان جگہوں کو دیکھتے جاتے جہاں مشاہیر شعرا کا جمگھٹا ہوا کرتا تھا یا جہاں ان کے بڑے بڑے معرکے ہوا کرتے تھے۔ غدر کے بعد جب یہ پرانی صحبتیں گلدستۂ طاقِ نسیاں ہو گئیں تو

ان کا ارادہ اور مستحکم ہو گیا اور اس کام نے ایک مذہبی صورت اختیار
کر لی۔ غدر کے بعد جب وہ خانما اور سراسیمگی کی حالت میں مارے
مارے پھر رہے تھے وہ اپنا فرض نہیں بھولے، چنانچہ ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ
میں شعرا کے حالات جمع کرتے رہے۔ پنجاب آ کر انہوں نے یہ مواد
ان لیکچروں کی صورت میں پیش کیا جو انہوں نے انجمن پنجاب کے
اجلاس میں پڑھے۔ یہ لیکچر 'آبِ حیات' کا نقشِ اوّلین تھے اور
نہایت مختصر اور ادھورے، لیکن آہستہ آہستہ ان میں اضافہ ہوتا گیا،
یہاں تک کہ انہوں نے 'آبِ حیات' کی صورت اختیار کر لی۔'' ۱۲؎

''آبِ حیات'' جب پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آئی تو اس میں بعض ایسی کمزوریاں تھیں جس کی وجہ سے اس پر سخت تبصرے ہوئے، خاص طور پر مومنؔ جیسے ممتاز غزل گو شاعر کو نظر انداز کر دینے اور ذوقؔ کو سارے شاعروں سے افضل و برتر ثابت کرنے کے نتیجے میں آزاد کو ہدف ملامت بنایا گیا۔ اس بابت ڈاکٹر صادق لکھتے ہیں:

''صادق الاخبار'' مورخہ ۱۰/ مارچ ۱۸۸۸ء میں ایک مضمون مشتمل بہ 'احوالِ مومنؔ' شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ۲۴/ مارچ کو ایک مختصر سا خط اس اخبار میں شائع ہوا جس میں مولانا آزاد کو بدین وجہ ہدف و ملامت بنایا گیا تھا کہ انہوں نے 'آبِ حیات' میں مومنؔ کا ذکر نہیں کیا۔ ۱۳؎ مضمون میں آزاد پر تعریض کی صورت یہ ہے۔

''مولوی محمد حسین آزاد نے...... ایسے جواہر زواہر کو خزف ریزہ جان
کر پھینک دیا، اور اپنی کتاب 'آبِ حیات' میں جو ان کے خیال میں
ہوگی، دیگر شعرائے قدیم کے ساتھ نہ لکھا...... حضرت آپ افسردہ
خاطر نہ ہوں، بھلا اجتماع ضدین کہیں ہو سکتا ہے۔...... مومنؔ تو نام
پایا اور مذہب سنی...... مولوی آزاد کو کیا پڑی تھی کہ ایسے جنتی مومنؔ کا
حال زندگی لکھ کر اور اس کو زمرہ استادوں میں شمار کر کر آپ بھی اس
کے پیرو ہوتے اور اپنی برادری میں سے خارج کیے جاتے اور اہل تشیع

کی نظروں میں سبک بنتے ۔ پس آپ صبر کریں، تعصب کی شان کو بہ غور
تکتے رہیں ۔ فرمائیے تو سہی، جن شعرا کا ذکر کتاب '' آبِ حیات ''
میں ہے ان میں سے کسی نے بھی ایک رباعی اصحاب ثلاثہ کبار کی
شان میں کہی ہے ۔ ''[۱۴]

غالباً حالی اسی مضمون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آزاد کو لکھتے ہیں:

'' یہ خیال اکثر کو ہے کہ آپ نے مذہبی تعصب کے سبب مومنؔ کا حال
نہیں لکھا، مگر اس سے بڑھ کر نحیف اور پوچ خیال نہیں ہوسکتا......
آپ لوگوں کی یاوہ سرائی پر کچھ التفات نہ کیجیے......اور اپنا کام کیے
جائیے، نکتہ چینوں کے خوف سے مفید کام بند نہیں کیے جاسکتے، اگر دو
نکتہ چیں ہیں تو ہزار مداح اور ثنا گو بھی تو ہیں ۔ ''[۱۵]

آخر کار آزاد کو '' آبِ حیات '' پر نظر ثانی کرنی پڑی، اور ۱۸۸۳ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن بہت سے اضافوں اور ترمیم کے ساتھ شائع کرایا، جس کی تفصیل اسلم فرخی نے اپنی کتاب '' محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف '' کی جلد دوم میں صفحہ ۱۴ تا ۱۹ میں دی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ میر ضاحکؔ، میر حسنؔ، خلیقؔ، مومنؔ، دبیرؔ اور انیسؔ کے حالات پہلی بار دوسرے ایڈیشن میں پیش کیے گئے ۔ اسی طرح ناسخؔ اور ذوقؔ کے حالات از سر نو لکھے گئے، جن اغلاط کی طرف لوگوں نے اشارہ کیا تھا انہیں دور کیا اور نئی معلومات کا اضافہ کیا، جن میں بعض اہم اضافے یہ ہیں ۔

جرأت کی نابینائی کے سلسلے میں طبع اوّل میں بعض روایات کو مشکوک قرار دیا گیا تھا۔ طبع ثانی میں اسے یقینی بنایا گیا۔ انشاؔ کی وفات پر بسنت سنگھ نشاط کا مشہور قطع تاریخ دیا۔ 'رانی کیتکی کی کہانی' کا اضافہ کیا۔ انشاؔ کے بارے میں شیفتہؔ کا مشہور فقرہ نقل کیا۔ 'ہیچ صنف را بہ طریق راسخۂ شعرانہ گفتہ' ناسخؔ کے سلسلے میں رحمیؔ کی بیان کردہ حکایات کا اضافہ کیا۔ سب سے زیادہ اضافے ذوقؔ کے حالات میں کیے، یعنی غلام رسول شوقؔ کے کلام کا نمونہ دیا۔ الٰہی بخش معروف کے مفصل حالات لکھے۔ اس ایڈیشن میں غالبؔ کی پنشن کی تفصیلات دیں ۔ ''[۱۶]

گویا اب یہ کتاب محض شاعری کی تاریخ نہیں، بلکہ توانا متحرک اور زندگی سے لبریز دستاویز ثابت ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی اس وقت تک اردو شعرا کے بے ربط سے تذکروں کو چھوڑ کر شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا اور شعرا کے مفصل حالات پر کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ لہٰذا ایک ایسی کتاب کی سخت ضرورت تھی جس میں شعرا سے متعلق زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کیے گئے ہوں۔ اس میں تحقیق و تنقید کے نمونے بھی ہوں اور شاعروں کے مستند حالات بھی۔ مولوی محمد حسین آزاد کی کتاب ''آبِ حیات'' نے یہ کمی حتی الامکان پوری کردی۔ آزاد خود لکھتے ہیں:

> ''مجھ پر واجب تھا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا متفرق تذکروں میں متفرق مذکور ہیں انہیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی، پھرتی چلتی تصویر سامنے آن کھڑی ہوں، اور انہیں حیات جاوداں حاصل ہوں۔'' ۱۷

''آبِ حیات'' کی شروعات دیباچے سے ہوتی ہے جس میں اردو زبان کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر نظم اردو کے عنوان سے مختلف ادوار کی تقسیم کی گئی ہے اور ہر دور کے شاعر کو تاریخی لحاظ سے جگہ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ادوار کی تقسیم کچھ یوں ہے۔

پہلے دور میں ولؔی اورنگ آبادی اور ان کے ہم عصروں کا ذکر ہے، جس میں شاہ مبارک آبرؔو، شیخ شرف الدین مضموؔن، محمد شاکر ناجؔی، محمد احسن اور غلام مصطفیٰ یک رنگؔ شامل ہیں۔ دوسرے دور میں شاہ حاتؔم، سراج الدین علی خاں آرزؔو اور اشرف علی خاں فغاںؔ کو جگہ دی گئی ہے۔

تیسرے دور میں مرزا مظہر جانِ جاناں، میر عبدالحئی تاباںؔ (سید انشاؔ اور مرزا نظیؔر کی ملاقات) مرزا رفیع سوداؔ، میر ضاحکؔ، خواجہ میر دردؔ، میر سوزؔ اور میر تقی میرؔ کے مختصر حالات اور ان کے کلام کے نمونے دیئے گئے ہیں۔ چوتھے دور میں شیخ قلندر بخش جرأتؔ، میر حسنؔ، سید انشاءاللہ خاں انشا اور شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ شامل ہیں۔

پانچویں باب میں شیخ امام بخش ناسخؔ، میر مستحسن خلیقؔ، خواجہ حیدر علی آتشؔ، شاہ نصیرؔ، مومن خاں مومنؔ، شیخ ابراہیم ذوقؔ، اسداللہ خاں غالبؔ، مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ کو شامل کیا گیا ہے۔ مذکورہ ادوار کی تقسیم

سے متعلق یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اردو شاعری اور شعرا کے حوالے سے یہ تقسیم کوئی نئی نہیں ہے۔اس سے قبل لکھے گئے تذکروں میں بھی شعرا کو تین چار طبقوں میں تقسیم کیے جانے کی روایت ملتی ہے۔(جیسا کہ دوسرے باب میں اس کا مفصل بیان گزرا ہے۔)اس سلسلے میں سب سے پہلے قائم نے ''مخزنِ نکات'' میں شعرا کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔اسی تقسیم کو میر حسن نے ''تذکرہ شعرائے اردو'' میں برقرار رکھا ہے۔قائم کے بعد قدرت اللہ شوق نے ''طبقات الشعرا'' میں شعرا کو چار طبقوں میں تقسیم کیا ہے،اور یہی تقسیم کریم الدین کے تذکرے ''طبقاتِ شعرائے ہند'' میں نظر آتی ہے۔لیکن مولوی محمد حسین کا کمال یہ ہے کہ تقسیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس دور کی منفرد خصوصیات کا بھی ذکر کیا ہے، نیز شاعری کے ارتقائی سفر کو پہلی بار بہتر انداز میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ڈاکٹر ابرار عبدالسلام نے اپنی مرتبہ کتاب ''آبِ حیات'' میں ان پانچوں ادوار کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا وہ یہ کہ:

''ان ادوار میں کوئی ایسا واضح اختلاف موجود نہیں ہے جو ان ادوار کی علیحدہ اور منفرد شناخت کروا سکے، آزاد نے ان ادوار کی جو خصوصیات بیان کی ہیں وہ دوسرے ادوار میں بھی بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں۔''[۱۸]

پھر انہوں نے اس دور کی بڑی تفصیل سے مثالیں پیش کی ہیں اور آخر میں یہ لکھا ہے کہ:

''آبِ حیات کے پانچوں دور آزاد کے تخلیقی ذہن کی پیداوار ہیں۔ بلا شبہ یہ آزاد کا اپنے دور کے حوالے سے ایک بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اردو شاعری کی تاریخ میں پہلی بار ایک باقاعدہ تسلسل دکھانے کی کوشش کی ہے۔......اگر چہ ان ادوار میں کوئی حد فاصل قائم کرنا اور انہیں ایک دور پکارنا مشکل ہے،لیکن اس کے باوجود آزاد کی یہ ایک اچھی کوشش تھی جس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔''[۱۹]

ڈاکٹر عبدالسلام کی بات صحیح ہے کہ آزاد ادوار قائم کرنے کے سلسلے میں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے اور نہ ہی ہر دور کے شاعروں کی شاعرانہ خصوصیات کے درمیان کوئی واضح فرق قائم کر سکے۔مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ آزاد نے جن شعرا کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے اور جس طرح ان کے سوانحی حالات

بیان کیے ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ بقول احسن فاروقی:

''آزاد یہی مقصد لے کر چلے تھے، اسی معاملے میں وہ تذکرہ نگاروں سے آگے بڑھنا چاہتے تھے اور وہ اپنے مقصد میں پورے کامیاب ہیں۔''۲۰

اس سلسلے میں معروف ناقد کلیم الدین احمد بھی رقم طراز ہیں:

''آزاد شاعروں کے نام نہیں گناتے، متفرق اوصاف و نقائص کی فہرست مرتب نہیں کرتے، ہر شاعر کی زندہ تصویر کھینچتے ہیں۔ میرؔ، سوداؔ، دردؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، ناسخؔ غرض ہر شاعر کی الگ الگ تصویر ہے۔''۲۱

''آبِ حیات'' کے منظر عام پر آنے کے بعد محمد حسین آزاد پر جو اعتراضات ہوئے وہ دو قسم کے ہیں۔ اوّل یہ کہ آزاد نے تذکروں سے بہ کثرت استفادہ کیا، لیکن کس تذکرے سے کس مقام پر بات اخذ کی ہے اس کا حسب موقع حوالہ نہیں دیا۔ دوم یہ کہ انہوں نے اپنے مخصوص مذہبی رجحانات کی وجہ سے بڑے بڑے شعرا کو ان کا اصل مقام اور مرتبہ نہیں دیا۔ بعض اوقات تاریخی واقعات کے بیان میں بھی اثر آفرینی کی خاطر تخیل سے کام لیا ہے۔ اگرچہ یہ اعتراضات بے جا نہیں، لیکن ہمیں ان اعتراضات کو آزاد کے زمانے کے سیاق وسباق میں دیکھنا چاہیے۔ ''آبِ حیات'' جیسی تحقیقی کتاب اگر آج کے دور میں لکھی جاتی تو اس پر اعتراضات سو فیصد درست ہوتے۔ کیوں کہ آج کے تحقیقی معیار ایک صدی کے پہلے تحقیقی معیار سے مختلف ہیں۔ اس ضمن میں مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں:

''آزاد کے زمانے تک یہ دستور نہ تھا کہ جو بات کہی جائے اس کے لیے سند پیش کی جائے اور ماخذ کا حوالہ دیا جائے۔''۲۲

''آبِ حیات'' لکھتے وقت آزاد کے سامنے بہت مآخذ تھے جن سے آزاد نے حسب ضرورت استفادہ کیا۔ ان میں سے کچھ مآخذ کی نشان دہی انہوں نے خود کر دی ہے، لیکن بیشتر مآخذ ایسے ہیں جن کی طرف آزاد نے کوئی اشارہ نہیں کیا ہے یا اشارہ کرنا بھول گئے۔ ان مآخذ کی طرف کچھ محققین نے توجہ مبذول کرائی ہے۔ ان میں حافظ محمود شیرانی، قاضی عبد الودود، ڈاکٹر محمد صادق، مسعود حسن رضوی ادیب اور ڈاکٹر ابرار عبد السلام کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق نے 'آبِ حیات' کے مآخذ کو تین حصوں

میں تقسیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آبِ حیات کے ماخذ تین ہیں۔(۱) وہ اطلاعات جو انہیں شعرا کے عزیز و اقارب سے براہ راست زبانی ملیں۔(۲) وہ اطلاعات جو انہوں نے بذریعہ خط و کتابت حاصل کیں۔(۳) وہ اطلاعات جو انہیں پرانے تذکروں سے دستیاب ہوئیں۔'' [۲۳]

ان مآخذ میں سے کچھ معلومات کو آزاد نے بعینہٖ نقل کر دیا ہے۔ کچھ ترمیم و اضافے کے بعد شامل کیں، اور کچھ ایسی ہیں جن کو آزاد نے بیان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ کیوں کہ ان معلومات میں کچھ ایسی باتیں بھی شامل ہیں جن سے شعرا کی ہتک اور تنقیص کا پہلو نکل سکتا تھا۔ یا وہ اتنی فحش تھیں کہ انہیں آبِ حیات کی زینت نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ مثال کے طور پر مولوی ذکاء اللہ کے ایک خط کا کچھ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے جس میں غالبؔ کے احوال لکھ کر مولوی محمد حسین آزاد کو بھیجے گئے تھے۔

''جنابِ من! مجھے جب آپ کے تذکرے کے عالی خیالات اور مضامین کا تصور آتا ہے تو افسوس ہوتا ہے کہ اب تک شائع کیوں نہیں ہوا۔ مگر جب میں سوچتا ہوں کہ اگر آپ کو بندہ سے سچا سچا حال سب شاعروں کا معلوم ہوا تو بہت شاعروں کے شاگرد زندہ ہیں وہ...... کرنے کو تیار ہوں گے اس لیے عذابِ جان بن جائیں گے۔ اب مرزا (غالبؔ) کا حال یہ ہے کہ سوائے شاعر ہونے کے کوئی خوبی اس میں نہ تھی۔ حسد اس قدر تھا کہ کسی کی عزت کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ سنگ دل ایسا تھا کہ سارے بھائی بندوں کی حق تلفی کرنے میں اس کو افسوس نہ تھا۔ جس روز ذوقؔ مر گیا تو خوش ہو ہو کر کہتا تھا کہ آج بھٹیاروں کی بولی بولنے والا مر گیا۔ رند مشرب ایسا تھا کہ کہا کرتا تھا کہ صہبائیؔ شعر کہنا کیا جانے۔ نہ اس نے شراب پی، نہ اس نے قمار بازی کی، نہ معشوق کے ہاتھوں سے جوتیاں کھائیں، نہ جیل خانے میں پڑا......'' [۲۴]

اس طرح بعض معلومات اور واقعات اتنے فحش تھے کہ بقول آزاد ''جی چاہتا تھا کہ ان کی باتوں سے گلزار کھلا دوں، مگر اکثر پھول ایسے فحش کے کانٹوں میں الجھے ہوئے ہیں کہ کاغذ کے پرزے ہوئے جاتے ہیں۔اس لیے صفحہ پر پھیلاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔۲۵ لیکن آزاد کے اس احتیاطی قول کے باوجود ہمیں آبِ حیات میں واقعات، روایات اور اقوال کا ایک بڑا حصہ ایسا نظر آتا ہے جو انہیں براہِ راست شعرا کے عزیز و اقارب اور اپنے حلقۂ احباب سے حاصل ہوا اور بعینہٖ اپنی کتاب میں نقل کر دیا ہے۔ کچھ روایات 'آبِ حیات' میں ایسی بھی بیان ہوئی ہیں جن کے راویوں کے نام آزاد نے بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ بلکہ اکثر اوقات ان کے لیے جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''معتبر لوگوں سے سنا ہے''، ''دیرینہ سال لوگوں سے تحقیق ہوا''، ''بعض اصحاب کہتے ہیں''، ''بعض بزرگوں کا قول ہے'' بقول ابرار عبدالسلام ''آزاد بذات خود بہت سے شعرا کو جانتے تھے، ان کے عزیز و اقارب سے ملاقاتیں کی تھیں اور ان سے روایات سنی تھیں، ان روایات کو بھی آزاد نے آبِ حیات کی زینت بنا دیا ہے۔''۲۶

آبِ حیات کا دوسرا ماخذ ان اطلاعات یا معلومات پر مشتمل ہے جو ان شعرا کے دوستوں، عزیزوں، ملنے والوں اور جان پہچان والوں سے بذریعہ خطوط حاصل ہوئیں۔ اس بابت ڈاکٹر مرتضیٰ حسین لکھتے ہیں:

> ''مولانا محمد حسین آزاد کی برصغیر کے تمام علم دوست حضرات سے واقفیت تھی۔ بے شمار اکابر، شاگردوں، عزیزوں، نجی دوستوں اور ایڈیٹروں سے خط و کتابت تھی۔ اگر آج ان کے خطوط کا پورا مجموعہ مل سکتا تو ایک دفتر ہوتا۔ بلا شبہہ ان خطوط میں نجی معاملات، سوانحی اشارات، نفسیاتی مسائل مل سکتے تھے۔......آبِ حیات اور دربارِ اکبری کے سلسلے میں سینکڑوں خط ناپید ہیں۔ علمی مراسلات میں سے ایک خط بھی نہیں ملتا۔ حالیؔ، شیفتہؔ، مجروحؔ، ذکاءاللہ، غلام رسول ویرانؔ، سرسید جیسے بزرگوں کے خطوط مولانا کے کاغذات میں موجود ہیں، لیکن ان کے نام مولانا کے خط کیا ہوئے؟ کسے معلوم۔''۲۷

ڈاکٹر صادق نے اپنی کتاب ''آبِ حیات کی حمایت میں'' میں ایسے پانچ خطوط نقل کیے ہیں جن

کی نشان دہی ہو چکی ہے۔ان میں سے ایک خط ۴ مارچ ۱۹۷۶ء میں لکھا گیا ہے۔ یہ درگا داس کا خط ہے جس میں انہوں نے شاہ نصیؔر کے حوالے سے انگریزوں کا واقعہ لکھا اور چار غزلیں نقل کی ہیں۔ یہ چاروں غزلیں ''آبِ حیات'' میں شامل ہیں،اور انگریزوں والا واقعہ بھی آزاد نے کسی قدر ترمیم کے ساتھ ''آبِ حیات'' میں شامل کیا ہے۔خط میں جو غزلیں درج ہیں ان کے مطالع یہ ہیں:

ہار کا مجھ کو اس لیے ڈر ہے
شوخ ظالم ہے اور ستم گر ہے
یہاں طالعوں سے ملتا ہے پیارا
بہت دیکھے ہے زاہد استخارہ
(حاتؔم)
زیب تن گر چہ ہے گل پیرہن سرخ ترا
لیکن انجام یہ ہوگا کفن سرخ ترا

خال پشت لب شیریں ہے عسل کی مکھی
روحِ فرہاد لپٹ بن کے جبل کی مکھی
(شاہ نصیؔر)

دوسرا خط رنؔمی کا ہے جو انہوں نے آبِ حیات کی پہلی اشاعت کے بعد لکھا ہے۔اس خط میں رنؔمی نے ناسؔخ سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔آبِ حیات میں مذکور انگوٹھی کی چوری والا واقعہ،نوکروں سے کھانا لے کر کھانے کا واقعہ، بوریے کا واقعہ،قصیدے کے سلسلے میں سوا لاکھ انعام ملنے کا واقعہ، جاں بلب آمدہ الخ اور دزد خانہ ناسؔخ الخ والی تاریخیں اسی خط سے ماخوذ ہیں۔[۲۹]

غالبؔ کے سلسلے میں تبدیلیٔ تخلص کا واقعہ، مذہب سے متعلق معلومات، ہرمزد کا معاملہ اور مثنوی ''بادِ مخالف'' کے حوالے سے معلومات، علاء الدین علائی سے خط کے منقول ہیں۔اس کے علاوہ شاہ نصیؔر سے متعلق بعض معلومات بہاء الدین بشیر کے بھیجے گئے مضمون سے حاصل کی گئی ہیں۔[۳۰] مومؔن کی حیات

سے متعلق تمام معلومات حالی نے لکھ کر بھیجی تھیں جنہیں آزاد نے معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ''آب حیات'' میں شامل کیا ہے۔ آزاد نے مومنؔ کے سلسلے میں خط بھیجنے والے شخص کے بارے میں اشارتاً یہ لکھا ہے کہ:

''ایک صاحب کے الطاف کرم کا شکر گزار ہوں جنہوں نے باتفاق احباب اور اصلاح ہمدگر جزیات احوال فراہم کر کے چند ورق مرتب کیے اور عین حالت طبع میں کہ کتاب مذکور قریب الاختتام ہے مع ایک مراسلہ کے عنایت فرمائے، بلکہ اس میں کم و بیش کی اجازت دی۔ میں نے فقط بعض فقرے کم کیے جن سے طول کلام کے سوا کچھ فائدہ نہ تھا۔ اور بعض عبارتیں اور بہت سی روایتیں مختصر کر دیں یا چھوڑ دیں جن سے ان کے نفس شاعری سے متعلق تھا۔''۳۱

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آزاد نے مومنؔ کی حیات و شاعری سے متعلق خط بھیجنے والے شخص کا نام صاف لفظوں میں کیوں نہیں لکھا؟ خیر اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مومنؔ کے حالات حالی نے آزاد کو لکھ کر بھیجے تھے۔ اس سلسلے میں مولانا اسماعیل پانی پتی کا بیان ملاحظہ فرمائیں:

''ان صاحب کا نام نہ لکھا جنہوں نے محنت اور تلاش کے بعد مومنؔ کے حالات قلم بند کر کے بھیجے تھے۔ صرف اشارے کے طور پر اتنا لکھ دیا کہ ''میں ایک صاحب کے الطاف و کرم کا شکر گزار ہوں......'' اس پر خواص تو اسی وقت سمجھ گئے تھے کہ ''الطاف و کرم'' کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ مگر عوام کے لیے یہ عقدہ لانیحل رہا۔ عرصۂ دراز کے بعد آخر یہ راز اس وقت کھلا جب ۱۹۳۵ء میں مولانا حالی کے شاگرد جناب برج موہن کیفی سے میں نے اس سے متعلق دریافت کیا جس کے جواب میں انہوں نے مجھے ماڈل ٹاؤن لاہور سے ۲۷ جولائی ۱۹۳۵ء کو ایک خط لکھا جس میں صاف طور پر یہ تحریر فرمایا کہ مومنؔ کے حالات حالی نے لکھ کر آزاد کو بھیجے جو ''آب حیات'' کے دوسرے

ایڈیشن میں شامل کتاب کیے گئے۔''۳۲؎

''آب حیات'' کی تصنیف کے سلسلے میں آزاد کا سب سے بڑا ماخذ تذکرے ہیں۔جن تذکروں کے حوالے واضح طور پر ملتے ہیں ان میں 'نکات الشعرا'، 'تذکرۂ شورش'، 'گلشن بے خار'، 'مخزن نکات'، 'سراپا سخن'، گلزارابراہیم'، 'مجموعۂ نغز' اور غلام ہمدانی مصحفی کے تینوں تذکروں کے نام آتے ہیں۔سعدی دکھنی اور خان آرزو کے سلسلے میں آزاد نے سودا کے تذکرے کا ذکر بھی اس طور پر کیا ہے گویا وہ ان کی نظر سے گزرا تھا۔حالاں کہ اس کا کوئی مصدقہ ثبوت ابھی تک فراہم نہیں ہوسکا ہے۔بقول ڈاکٹر اسلم فرخی ''تذکرۂ سودا کا کوئی نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہوا۔قدرت اللہ قاسم اور آزاد تذکرہ سودا دیکھنے کے مدعی ہیں۔ان کے علاوہ کسی اور کی نظر سے یہ تذکرہ نہیں گزرا نہ اس کا حوالہ کہیں اور ملتا ہے۔۳۳؎ ان تذکروں کے علاوہ 'خزینۃ العلوم'، 'گلستانِ سخن'، 'طبقاتِ شعرائے ہند'، 'خوش معرکۂ زیبا'، 'عمدہ منتخبہ'، 'مخزن نکات'، اور 'یادگار شعرا' وغیرہ وہ تذکرے ہیں جن سے آزاد نے کم وبیش استفادہ ضرور کیا ہے۔لیکن اس استفادے کا سراغ ''آب حیات'' میں نہیں دیا گیا ہے۔جن تذکروں کے نام آزاد نے آب حیات میں دیئے ہیں ان کے حوالے بھی ہر جگہ نہیں ملتے۔کہیں کہیں برائے نام دیئے گئے ہیں۔ورنہ عام طور پر دوسرے تذکروں کے مواد کو بغیر کسی حوالے کے آزاد نے اس انداز سے پیش کیا ہے گویا یہ انہیں کی تحقیقی کاوش کا نتیجہ ہے۔۳۴؎ قاضی عبدالودود اور حافظ محمود شیرانی نے آب حیات کے ماخذ کا اپنی بعض تحریروں میں بڑی تفصیل سے جائزہ لیا ہے، اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آب حیات میں سب سے زیادہ تین چار تذکروں سے مدد لی گئی ہے۔ان تذکروں میں 'مجموعۂ نغز'، 'طبقات شعرائے ہند'، 'خوش معرکۂ زیبا'، 'گلزار ابراہیم'، 'عقد ثریا'، 'تذکرۂ ہندی' یادگار شعرا کے نام آتے ہیں۔مثلاً ولی اور ناصر علی کی معاصرانہ چشمک کا حال، شرف الدین مضمون کا حال اور کلام، شاہ مبارک آبرو کے حالات اور ان کا کلام، آرزو کا کلام اور ان کی بدیہہ گوئی کی تفصیل، سودا کے شعر کو حدیث قدسی کہنا، میر ومرزا کے سلسلے میں ایک کو نہر اور دوسرے کو دریا بتانا، بقاء اللہ خاں بقا کے حالات، میر صاحب کی بد دماغی اور شک مزاجی کا حال، ولی کے سلسلے میں ''وے شاعریست از شیطان مشہور تر'' اور ''ولی پر سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں۔'' والے واقعات، جرأت کے ابتدائی حالات اور مرزا محمد تقی خاں کے مشاعرے میں غزل پڑھنا، میر حسن کے بعض حالات، ماشاء اللہ کے

پورے حالات، انشا اور عظیم بیگ کا معرکہ، اسی طرح آب حیات مقدمے کے بعض مطالب مجموعۂ نغز سے ماخوذ ہیں۔ فضلی کی دہ مجلس کی تفصیل، سیوا نامی دکنی مصنف کا ذکر، مرزا جان جاناں کے چارپائی پر بیٹھنے کی روایت اور ایک مرید کے آب خوردہ ٹیڑھا رکھنے کا قصہ، میر ضاحکؔ کی وضع قطع اور لباس، سوداؔ اور میرؔ کے کلام پر دو شخصوں کی تکرار کا ذکر، آتش و ناسخ کی معاصرانہ چشمک کی بعض باتیں، ضاحک اور سوداؔ کے سلسلے کی بعض تفصیلات وغیرہ۔ ۳۵؎ یہ وہ مآخذ ہیں جن کا آزاد نے حوالہ نہیں دیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی روایات اور بیانات آزاد نے مختلف کتابوں اور تذکروں سے اخذ کیے ہیں، جس کی نشان دہی آزاد نے آب حیات میں خود ہی کر دی ہے۔ مثلاً آزاد نے انشا کی ''دریائے لطافت'' سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اس کتاب کے حوالے آب حیات میں جابجا نظر آتے ہیں۔ مرزا مظہر کے حوالے سے بعض حالات ''معمولات مظہر سے لیے گئے ہیں۔ غالبؔ کے حالات ''اردوئے معلیٰ'' سے ماخوذ ہیں۔ قتیل کی تصانیف ''رقعات قتیل'' اور ''چار شربت'' کے حوالے ملتے ہیں۔ کلب حسین خاں نادر کی تصنیف ''تلخیص معلیٰ'' سے بعض بیانات ماخوذ ہیں۔ رنگین کی تصنیف ''مجالس رنگین'' سے بھی آزاد نے استفادہ کیا ہے۔ ۳۶؎ یہ وہ مآخذ ہیں جنہیں آزاد نے آب حیات کے سلسلے میں بنیاد بنایا ہے۔ ان مآخذ میں سے جن کی نشان دہی آزاد نے نہیں کی تھی ان سے بہت سی غلط فہمیوں نے جنم لیا اور اس حوالے سے آزاد کو خوب مطعون بھی کیا گیا۔ لیکن جیسے جیسے ان مآخذ کی نشان دہی ہوتی رہی ویسے ویسے آزاد کے بیانات کی اصلیت بھی سامنے آتی رہی۔ حافظ محمود شیرانی جو ''آب حیات'' کی تاریخی وقعت کے منکر تھے، آخر کار اس کی حمایت میں قلم اٹھانے پر مجبور ہو گئے۔ جب انہوں نے قدرت اللہ قاسم کی تصنیف ''مجموعۂ نغز'' کی ذمہ داری سنبھالی تو اس وقت ان پر یہ منکشف ہوا کہ آزاد کے بیشتر بیانات جو تاریخی حیثیت سے انہیں کمزور اور ناقابل اعتبار معلوم ہوتے تھے اور جنہیں وہ آزاد کے تخیل کی پیداوار بتایا کرتے تھے سب انہیں تذکروں سے ماخوذ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مولانا نے اگرچہ ہر موقع پر اس تالیف سے استفادے کا اظہار نہیں کیا ہے، تاہم وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آب حیات ایک بڑا حصہ اس تذکرے سے ماخوذ ہے۔'' ۳۷؎

شیرانی صاحب کی باتوں سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آب حیات میں منقول تمام واقعات اختراعی نہیں، بلکہ ان میں سے بیشتر واقعات اور روایات کی سند ضرور موجود ہے اور آزاد نے ان واقعات اور روایات کو اپنے تخلیقی مزاج کے ساتھ ہم آہنگ کر کے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ آزاد پر دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا رہا ہے کہ ''آزاد کو تحقیق کے جو مواقع میسر تھے انہوں نے ان سے فائدہ نہیں اٹھایا، تلاش و تدقیق نہیں کی، جو کچھ مواد ملا اسے چھان پھٹک کے بغیر استعمال کر لیا۔۳۸ سب سے پہلے تو دیباچے کی دو تین باتیں خصوصاً اہل تحقیق اور اہل ادب کا مرکز بنی ہیں۔ ان میں آزاد کے دیباچے کا پہلا فقرہ شامل ہے۔ ''اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔''۳۹ میرامن، سرسید احمد خاں، امام بخش صہبائی، پیارے لال آشوب، بابو شیو پرساد، ڈاکٹر ہارنلے اور میکس ملر اردو کو برج بھاشا کے ساتھ منسوب کرنے میں پہل کر چکے تھے۔۴۰ ڈاکٹر اسلم فرخی کا خیال یہ ہے کہ آزاد اپنے نظریے میں میکس ملر سے متاثر ہوئے ہیں۔ اس غلطی کی ابتدا وہیں سے ہوئی ہے۔ میکس ملر کا کہنا تھا کہ ''جس زبان کو ہندی کہا جاتا ہے، ادبی اور اعلیٰ ہندی، دراصل برج بھاشا کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔''۴۱ اس نظریے کے سلسلے میں گیان چند جین آزاد کو ہارنلے سے متاثر بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آزاد نے اردو کو خاص طور سے برج پر مبنی بتایا ہے۔ ان کا مشاہدہ صحیح نہیں کہ اردو یا کھڑی بولی صرفی و نحوی اصولوں کی حد تک برج ہے۔ ہارنلے سے متاثر ہو کر آزاد نے آحیات کی بسم اللہ ان الفاظ سے کی ''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔''۴۲ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا کہنا ہے کہ ''آزاد سے قبل صاحب شمیم سخن کے یہاں بھی ابتدائی جملہ اسی انداز کا ملتا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ''واضح ہو کہ اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔'' لیکن آزاد نے اس دعوے پر جس انداز سے گفتگو کی ہے وہ انہیں کا حصہ ہو کر رہ گئی ہے۔''۴۳ آج ہمارے لیے یہ بات قابل قبول نہ سہی کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے، لیکن یہ کیا کم ہے کہ اردو کے ماخذ اور

پیدائش کے بارے میں آزاد نے غور وفکر کی دعوت دی اور اس دعوت
کے نتیجے میں اس موضوع پر اردو میں لسانیات سے متعلق ایک قابل
قدر ذخیرہ جمع ہو گیا۔

''خالقِ باری'' کو آزاد امیر خسؔرو کی تخلیق مانتے ہیں۔ان کا بیان ہے ''امیر خسؔرو جو کہ ۷۲۵ء (۱۳۲۵ء) میں فوت ہوئے ......خالق باری انہیں کے مخلوقات فکر سے ہے۔'' ۴۴ آزاد کے اس بیان کی تردید سب سے پہلے حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ وہ خوش قسمت کتاب ہے جو بالاتفاق امیر خسرو دہلوی کی طرف
سے منسوب ہے......اگر یہ کتاب امیر خسرو کی تصنیف ہوتی تو صورت
حال بالکل مختلف ہوتی۔'' ۴۵

پھر شیرانی صاحب نے متعدد دلائل سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ''خالق باری'' لسانی کمزوریوں اور داخلی شہادتوں کی وجہ سے امیر خسؔرو کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے اپنی ایک اور مرتبہ کتاب ''حفظ اللسان'' میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ خالق باری کا نام حفظ اللسان ہے اور جس کے مصنف کوئی ضیاء الدین خسرو ہیں۔ وہ اس کتاب کا تعارف ہی کچھ اس انداز سے کراتے ہیں:

''اس مرتبہ کے دو دیباچے ہیں، دیباچۂ اوّل اس عالم گیر اعتقاد کی تردید
ہے کہ خالق باری حضرت امیر خسرو کی تصنیف ہے۔......دیباچۂ دوم
انجمن ترقی اردو کے ایک مخطوطے نوشتہ ۱۱۸۷ھ کی سند پر ایک نہایت اہم
انکشاف کا مظہر ہے کہ خالق باری جس کا اصل نام ''حفظ اللسان'' ہے
بابا اسحاق فتاویٰ (حلوائی) کی فرمائش پر کسی ضیاء الدین خسرو نے (بعد
جہانگیر) تصنیف کی ہے۔ سال تصنیف ۱۰۳۱ھ اس کا مادۂ تاریخ
'تصنیف آخر' سے برآمد ہوتا ہے۔'' ۴۶

''حفظ اللسان'' کے سلسلے میں ممتاز حسین کا یہ دعویٰ ہے کہ شیرانی صاحب نے اس کا جو متن شائع کیا ہے وہ انڈیا آفس والے نسخے پر مبنی ہے، انجمن والے نسخے پر نہیں، اور انڈیا آفس والے نسخے پر کسی ضیاء الدین

خسرو کا نام نہیں، وہ مزید لکھتے ہیں:

''ضیاء الدین خسرو حفظ اللسان کا مولف ہوسکتا ہے لیکن وہ خالق باری کا مصنف نہیں...... اللہ خدائی اور حفظ اللسان کے درمیان کا وقفہ صرف ۳۰ سال کا ہے، اگر خالق باری کا مصنف ضیاء الدین خسرو ہوتا تو پھر اللہ خدائی کے مصنف تجلی اپنی تصنیف میں روح خسرو اور روح نظام الدین سے استمداد کیوں کرتے اور کیا نصاب ظریفی کا بھی مولف ضیاء الدین خسرو گوالیاری ہے۔ اگر نہیں تو ان زبانوں کا علم رکھتے ہوئے حافظ محمود شیرانی کو یہ بات لکھنی نہ چاہیے تھی کہ خالق باری کے مصنف امیر خسرؒو نہیں بلکہ ضیاء الدین خسرو ہیں۔ حفظ اللسان کا ترقیمہ ۱۱۸۷ھ کا ہے۔ کاتب کا نام محمد یٰسین ہے۔ سال تصنیف مشکوک ہے، مگر حافظ محمود شیرانی نے اس کتاب کا سال تصنیف بھی دریافت کرلیا۔ دیباچے کا جملہ یہ ہے ''در سال تصنیف آخر تاریخ بدیہہ مرقوم گردید'' حافظ محمود شیرانی نے اس فقرے سے ''تصنیف آخر'' کا مادۂ تاریخ قرار دے دیا ہے جو بڑی حد تک مشتبہ ہے۔''[۴۷]

''خالق باری'' کے سلسلے میں ڈاکٹر وحید مرزا اپنی کتاب ''امیر خسرؒو'' میں لکھتے ہیں:

''موافق اور مخالف دلیلوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خالق باری اور اس کا زیادہ تر حصہ امیر خسرو کی تصنیف ضرور ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ امتداد زمانہ سے اس میں تصرف اور تحریف ہوتا رہا اور بعض ہندی الفاظ کی شکل بدل گئی۔''[۴۸]

اور یہی خیال صفدر آہ (امیر خسرؒو بہ حیثیت ہندی شاعری ص ۶۶) اور جمیل جالبی کا ہے۔ جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''خالق باری امیر خسرؒو کی تصنیف ہے، جس میں صدیوں کی دھوپ

چھاؤں نے اضافوں اور ملحقات سے اس کی شکل بدل کر رکھ دی ہے
اور آج محمود شیرانی جیسے فاضل اجلّ کو یہ شبہہ ہوا کہ یہ امیر خسرؔو کی
تصنیف نہیں۔''۴۹؎

اس ضمن میں ابرار عبدالسلام ''آبِ حیات'' کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ ''افسر صدیقی نے ''خالق باری'' عرف نہیں اصلی نام ہے۔''میں شیرانی صاحب کے ''خالق باری'' پر لگائے گئے چھ الزامات کا تفصیل سے جواب دیا ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ تصنیف امیر خسرؔو ہی کی ہے۔ ضیاء الدین نامی شخص کی نہیں۔''۵۰؎ چنانچہ اس بحث و مباحثہ کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ خالق باری امیر خسرؔو کی تصنیف ہو سکتی ہے۔

اسی طرح دیباچے میں فضل علی فضلی کی کتاب ''کربل کتھا'' سے متعلق آزاد کا یہ بیان بھی قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میر جعفؔر زٹلی کے کلام کو محمد شاہی بلکہ اس سے پہلے زمانہ کا نمونہ کہا۔
مگر زٹلی کا اعتبار کیا؟ البتہ محمد شاہ کے عہد میں ۱۱۴۵ھ میں فضلی تخلص
بزرگ نے دہ مجلس لکھی۔ اس کے دیباچے میں سبب تالیف لکھتے
ہیں، اور غالباً یہی اردو نثر کی پہلی تصنیف ہے۔''۵۱؎ (؟)

ایک زمانے تک فضلی کی ''کربل کتھا'' کو اردو نثر کی پہلی کتاب سمجھا تا رہا، غالباً یہی وجہ ہے کہ آزاؔد نے بھی اسے اردو نثر کی پہلی کتاب تسلیم کیا ہے۔ لیکن اب تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اردو نثر کی پہلی کتاب کربل کتھا نہیں بلکہ ملا وجہی کی 'سب رس' ہے، جو اس سے سو سال پہلے لکھی گئی۔ دوسری بات یہ کہ آزاد کربل کتھا نام ''دہ مجلس'' بتاتے ہیں۔ حالاں کہ اس کا نام 'دہ مجلس' نہیں بلکہ کربل کتھا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی کربل کتھا کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

''فضلی نے اپنے ترجمے کا نام کربل کتھا رکھا، لیکن فہرست نگار
مخطوطات فورٹ ولیم کالج، ڈاکٹر اشپرنگر اور مولانا محمد حسین آزاد
نے 'دہ مجلس' لکھا ہے، مگر مولوی کریم الدین جنھوں نے اس کتاب
کو پڑھا تھا اور جنھوں نے اس کے طویل اقتباسات بھی نقل کیے ہیں

اس کا نام بصراحت کربل کتھا لکھا ہے۔''۵۲؎

وہ مزید لکھتے ہیں:

''مولوی کریم الدین کا تذکرہ (طبقات الشعرا) کربل کتھا کے متعلق اصل ماخذ دیا ہے، آب حیات اور نمونۂ منثورات میں اس کے بارے میں جو کچھ مرقوم ہے وہ بھی بڑی حد تک طبقات الشعرا سے ماخوذ ہے۔ معاصر نے جو عبارتیں نقل کی ہیں وہ بھی اسی تذکرے سے لی ہیں۔''۵۳؎

ڈاکٹر ابرار عبدالسلام بھی خواجہ احمد فاروقی کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''کربل کتھا'' آزاد کی نظر سے نہیں گزری، آزاد کا بیان اور کربل کتھا کا اقتباس ''طبقات الشعرا'' سے ماخوذ ہے۔'' اور یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ آزاد نے جن قدیم تذکروں سے سب سے زیادہ مدد لی ہے ان میں ''طبقات الشعرا'' بھی شامل ہے۔

نظم اردو کی تاریخ بیان کرتے ہوئے آزاد سعدی دکنی کا تعارف یوں کراتے ہیں:

''دکن میں ایک سعدی گزرے ہیں ان کا فقط اتنا حال معلوم ہے کہ اپنے تئیں ہندوستان کا سعدی شیرازی سمجھتے تھے، اور تعجب ہے کہ مرزا رفیع سوداؔ نے اپنے تذکرے میں ان کے اشعار کو سعدی شیرازی کے نام پر لکھا ہے۔''۵۴؎

آزاد نے اس میں دو باتیں کہی ہیں۔ اوّل یہ کہ سعدی دکن کے رہنے والے تھے۔ دوم یہ کہ سوداؔ نے اپنے تذکرے میں سعدی دکنی کو سعدی شیرازی سمجھ کر ان کے اشعار کو شیرازی سے منسوب کر دیا ہے۔ جہاں تک پہلے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں اکثر تذکرہ نگاروں نے (سعدی) کو دکنی ہی لکھا ہے۔ مثلاً میر تقی میرؔ (نکات الشعرا، ص:۹۵) لچھمی نرائن شفیق (چمنستان شعرا، ص:۴۳) فتح علی گردیزی (ریختہ گویاں۔ ص:۸۲) میر حسنؔ (تذکرہ شعرائے اردو، ص:۸۶) قدرت اللہ قاسم (مجموعۂ نغز، جلد اوّل ص:۲۹۸) اور غلام حسین شورش (تذکرہ شورش، ص:۳۱۶) وغیرہ جب کہ قائم چاند پوری (مخزن نکات، ص:۵) اور ذکاء اللہ (عیار اشعرا، فہرست اشپرنگر ص:۲۸۴) نے بھی سعدی کو شیرازی لکھا ہے۔ خواجہ احمد فاروقی

(میر تقی میرؔ: حیات اور شاعری،ص:۳۵)اور حنیف نقوی (شعرائے اردو کے تذکرے،ص:۲۶۷) نے سعدیؔ کو کاکوروی مانا ہے۔قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ ''کاکوروی بزرگ کا نام سعدیؔ تھا،تخلص نہ تھا،اوران کا شاعر ہونا مطلقاً ثابت نہیں۔شفیق اورنگ آبادی نے دکنی لکھا ہے،اور یہ کہیں زیادہ قابل قبول ہے۔۵۵؎ اب ان تذکروں کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آزادؔ کا سعدیؔ کو دکن سے منسوب کرنا غلط نہیں۔لیکن آزادؔ نے یہ نہیں بتایا کہ یہ بات انہوں نے کہاں سے نقل کی ہے۔ڈاکٹر ابرار عبدالسلام کا کہنا ہے کہ آزادؔ کا یہ بیان'طبقات الشعرا'سے ماخوذ ہے۔''۵۶؎

دوسرے یہ کہ مرزا رفیع سوداؔ کا سعدی کو شیراز سے منسوب کرنا،اس سلسلے میں ڈاکٹر ابرار عبدالسلام رقم طراز ہیں:

''آزاد کے بیان سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ انہوں نے سوداؔ کا تذکرہ خود دیکھا تھا،حالاں کہ ایسا ہرگز نہیں۔آزاد نے سوداؔ کے ترجمے میں اسے نایاب کہا ہے۔اگر یہ تذکرہ ان کے پاس ہوتا یا انہوں نے دیکھا ہوتا تو اس کا ذکر ضرور کرتے۔ان کا بیان مجموعۂ نغز سے ماخوذ ہے۔''

پھر ابرار عبدالسلام نے قاسم کے تذکرے کی وہ عبارت نقل کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ قاسم کے علاوہ کسی اور تذکرہ نگار نے سوداؔ کے تذکرہ کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

نظم اردو کی تاریخ بیان کرنے کے بعد آزاد پہلے دور پر پہنچتے ہیں (جس میں ولیؔ،آبروؔ،مضمونؔ، شاکر ناجیؔ اور یکرنگؔ شامل ہیں۔)اور اس دور کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس دور میں ولیؔ تو مجلس کی شمع ہیں،اور اہل مجلس ولیؔ اور دکن کے شریف ونجیب فصیح زبان ہیں کہ جو کچھ دیکھتے ہیں اسی روشنی سے دیکھتے ہیں۔ان کی زبان ایک ہی سمجھنی چاہیے۔مگر ولیؔ نے اپنے کلام میں ایہام اور الفاظ ذومعنیین سے اتنا کام نہیں لیا۔خدا جانے ان کے قریب العہد بزرگوں کو اس قدر شوق اس کا کیوں کر ہو گیا۔شاید دہروں کا انداز جو ہندوستان کی زبان کا سبزۂ خودرو تھا اس نے اپنا رنگ دیا۔''۵۸؎

پروفیسر گیان چند جین نے آزاد کے اس بیان کی تردید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آب حیات کے مطابق یہ ہندی کا اثر تھا۔لیکن ولی کے متبعین نے ہندی روایت کو چھوڑ کر فارسی شعرا کی تقلید کی تھی۔صاحب ''جواہرِ سخن'' نے دکھایا ہے کہ عہد محمد شاہ میں یہ فارسی شعرا کا مسلمہ طرز کلام تھا۔ چنانچہ اورنگ آباد تک کے فارسی شعرا میں بھی مقبول تھا۔ دراصل یہ شاعری کا محض ایک فیشن ہو گیا تھا،اور فیشن ہمیشہ بہت قلیل مدت تک جاری رہتا ہے۔''۵۹

ڈاکٹر محمد حسن بھی ایہام گوئی کو فارسی اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔۶۰ مگر ڈاکٹر عبدالحق نے آزاد کی تائید کی ہے اور لکھا ہے:

''اردو ایہام گوئی کی پشت پر ہندی شاعری کی یہ روایت سرمایۂ ادب کی صورت میں موجود تھی ،متقدمین اس روایت کی اثر آفرینی سے محفوظ نہ رہ سکے۔زبان و بیان کی سطح پر دورِ اوّل میں ہندی لب ولہجہ کی موجودگی سے اس امر کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ یوں بھی ذخیرۂ الفاظ میں ہندی کے اثرات سے بھی اس خیال کی توثیق ہوتی ہے۔''۶۱

ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی بات درست معلوم ہوتی ہے۔گیان چند جین کا یہ کہنا کہ ''یہ محض ایک فیشن تھا'' صحیح نہیں۔اگر چہ اس دور میں صنعتِ ایہام کا استعمال نمایاں طور پر کیا گیا،لیکن ایسا ہر گز نہیں کہ ولی کے معاصرین نے محض یہی صنعت استعمال کی ، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دوسری لفظی اور معنوی صنعتوں کو بھی ان لوگوں نے زینت کلام بنایا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایہام گوئی اپنی دلکشی کے باعث ان شعرا کی توجہ کا مرکز بنی،اور جب جب ان شعرا کا مطالعہ کیا گیا اس صنعت نے مطالعہ کرنے والوں کو سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کیا،اور یہی آزاد کے ساتھ بھی ہوا۔

آزاد نے 'آب حیات'' میں ولی کا نام شمس ولی اللہ لکھا ہے۔ یوں تو ولی کو مختلف تذکروں میں مختلف ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ مثلاً محمد ولی اللہ۔ ولی محمد،شاہ ولی اللہ،سید ولی محمد، وغیرہ۔ ڈاکٹر محی الدین

قادری زور، عبدالقادر سروری اور ان کے ہم نوا دکنی محققین ولؔی کے نام سید ولی محمد پر اتفاق کرتے ہیں، جب کہ گجرات کے محققین ولی اللہ یا محمد ولی اللہ پر اصرار کرتے ہیں۔ بقول ابرار عبدالسلام ''ولؔی کے نام کے حوالے سے سب سے عمدہ اور جامع تحقیق محمد اکرام چغتائی کی ہے۔ انہوں نے ''ولؔی گجراتی کے نام اور اس کے اختلاف'' میں ولؔی کے نام کے حوالے سے ہونے والی تمام تحقیقات کا تفصیلی تحقیقی وتنقیدی جائزہ لے کر مندرجہ ذیل نتیجہ اخذ کیا ہے:

> ''ولؔی کا نام چاہے کچھ بھی ہو ہمارے خیال کے مطابق ولؔی کے نام کے ساتھ ''شمس، میاں، حاجی، مولانا، سید، اور 'شاہ' کے الفاظ نہیں آسکتے۔ یہ الفاظ ولؔی کے نام کا جز نہیں ہیں، بلکہ بعض وجوہات کی بنا پر ان کو ولؔی کے نام کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے......موجودہ تحقیقات کی روشنی میں 'شمس الدین' ولؔی کا اپنا نام نہیں بلکہ یہ ان کے ایک دوست کا نام ہے......لفظ شمس کی طرح 'میاں' حاجی، اور 'مولانا' کے الفاظ بھی ولؔی کے نام کا حصہ نہیں ہو سکتے......ولی کا نام چاہے کچھ بھی ہو، لیکن ولی اللہ ان کے نام کا جز و لاینفک ہے۔ ہمارے خیال میں ولؔی کا نام 'محمد ولی اللہ' ہے۔ اوّل تو اس میں ولی اللہ کا جز بھی شامل ہے اور ہر جز و قدیم قلمی دستاویزات کے علاوہ قدیم و جدید اردو تذکروں اور دیگر کتب میں موجود ہے۔ دوسرے اس نام کی تصدیق ولؔی کی اپنی مہر، نمسک نامہ محررہ ۱۱۰۷ھ اور ولؔی کے دوسرے بیٹے کے لکھے ہوئے نام سے بھی ہوتی ہے۔'' ۶۲؎

ولؔی کے آبائی کے وطن کے بارے میں آزاد لکھتے ہیں کہ: ''وہ احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے۔'' حالاں کہ اس بارے میں بھی ولؔی کے نام کی طرح مختلف آرا ملتی ہیں۔ ایک گروہ انہیں اورنگ آبادی کہتا ہے، جب کہ دوسرا گروہ گجراتی، دونوں گروہوں کے پاس اپنے اپنے دلائل ہیں۔ حیدرآبادی علما کی رائے ہے کہ شاعر کا پورا نام سید ولؔی محمد ہے، اور اس کی جائے پیدائش اورنگ آباد ہے۔ اس کے برخلاف

گجرات کے محققین کی رائے یہ ہے کہ شاعر کا پورا نام شاہ ولی اللہ اور ان کی جائے پیدائش احمد آباد (گجرات) ہے۔ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اپنی کتاب ''ولی گجراتی'' میں لکھتے ہیں:

''ولؔی کی وطنیت سے متعلق دکن کے اہل علم نے جو کچھ لکھا ہے اسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔اسے دکھنی ثابت کرنے میں محض قیاس آرائی سے کام لیا ہے اور اس کے گجرات سے تعلقات اور وابستگیوں کے شواہد کو کما حقہ اہمیت نہیں دی گئی اور نہ ہی قدیم تذکروں کے بیانات کے پیش نظر علامہ وجیہ الدین کے خاندان کے ارکان سے صحیح حالات معلوم کرنے کی زحمت گوارا کی گئی۔''[۶۳]

پھر انہوں نے مختلف تذکروں اور دیگر قدیم کتابوں کے حوالے سے ولؔی کے آبائی وطن کے حوالے سے تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ:

''قدما نے لفظ دکن کا اطلاق جس حصۂ ملک پر کیا ہے وہ محض اورنگ آباد یا بیجاپور پر نہیں ہے بلکہ دریائے نربدا کے اس کنارے مع سلسلۂ کوہِ ست پڑا، راس کماری تک کی سرزمین اس میں شامل ہے۔اس خطہ میں گجرات و خاندیش بھی شامل ہیں۔اس سلسلہ میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دکن لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔شمالی ہند کا کوئی شخص لفظ دکن استعمال کرتا ہے تو دکن سے فقط مملکت آصفیہ کا علاقہ مراد نہیں لیتا بلکہ اس کے تصور میں دکن سے مراد ست پڑا سے راس کماری تک کا علاقہ ہوتا ہے۔لیکن جب دکن کے اس وسیع علاقہ میں اس لفظ کا استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد گجرات اور برار چھوڑ کر باقی علاقہ ہوتا ہے......میر صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں:

کچھ ہند ہی میں میرؔ نہیں لوگ جیب چاک
ہے میرے ریختوں کا دوانا دکن تمام

اس شعر میں میرؔ صاحب نے پورے شمالی ہند کے لیے لفظ 'ہند' استعمال کیا ہے اور گجرات و دکن کے خطے کو دکن لکھا ہے......موجودہ زمانے میں بھی شمالی اور جنوبی ہند کی تخصیص کے خیال سے گجرات کو دکن ہی میں شمار کرتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مقالہ اردو میں اس طرح لکھا ہے ''دکن میں اردو زبان کے تین بڑے مرکز تھے۔ (۱) گولکنڈہ شاہان قطب (۲) بیجاپور شاہان عادل شاہی کا پایۂ تخت (۳) احمد آباد (گجرات)۔''۶۴؎

قاضی عبدالودود اس مسئلے پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ شہادتیں جن سے دکنی ہونا ثابت ہے نظر انداز کی جاتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ قطعی طور پر ثابت ہے کہ لفظ 'دکن' غلط یا صحیح گجرات کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ رہا اورنگ آبادی ہونے کو تو اس کی قدیم شہادتیں دو ہیں، نکات الشعرا اور 'چمنستان شعرا' اور ان دونوں پر قائم اور حمید کا بیان جو گجرات کے حق میں ہے مرجح ہے۔ میرؔ و قائمؔ کے تذکروں کے مقابلے میں صاف ظاہر ہے کہ شعرا دکن و گجرات سے متعلق موخر الذکر کی معلومات بہتر ہیں۔ جو ظاہر اس وجہ سے ہے کہ قائمؔ نے طالب دکنی کے بیاض سے استفادہ کیا تھا اور میرؔ اس سے محروم تھے۔ شفیق اور حمید دونوں اورنگ آبادی ہیں، لیکن موخر الذکر کا تذکرہ شفیق کے تذکرے سے کم و بیش دس (۱۰) سال قبل وجود میں آیا تھا، اور حمید یقین ہے کہ عمر میں اس سے بہت بڑا ہو۔''۶۵؎

اسی طرح ولیؔ سے متعلق آزاد کا یہ بیان ''نظم اردو کی نسل کا آدم جب ملک عدم سے چلا تو اس کے سر پر اوّلیت کا تاج رکھا گیا۔۶۶؎ بھی ایک عرصہ تک موضوع بحث بنا رہا۔ لیکن اب یہ بات تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ ولیؔ سے بہت پہلے قطب شاہی خاندان کا پانچواں بادشاہ محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ ۱۹۲۲ء میں مولوی عبدالحق نے رسالہ 'اردو' میں ایک مضمون کے ذریعے اس کی کلیات کے اس نسخے کو روشناس کرایا جو کتب خانہ آصفیہ کا مخزونہ تھا اور جس پر اس کے دستخط موجود

تھے۔ ۶۷؎ بہر حال وؔلی کو آج بھی اس اعتبار سے باوا آدم کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اردو غزل کے موضوعات کا تعین کیا جو صدیوں تک غزل کا لازمہ سمجھے جاتے رہے۔ ساتھ ہی اردو غزل کے اظہار کے سانچے مرتب کیے اور نہ زبان کو مختلف تجربات کے ذریعے ایسا شعری سرمایہ دیا جو غزل کی ترقی میں مددگار ثابت ہوا، اور اس طرح وؔلی کے ہاتھوں غزل کی جان دار روایت کا قیام عمل میں آیا۔ ڈاکٹر احسن مارہروی لکھتے ہیں:

''موجودہ شاعری کا رنگ تغزل قافیہ و ردیف کے التزام کے ساتھ (وؔلی) دکنی سے پہلے بکثرت ہندوستان میں مروج نہ تھا۔ جتنے مشاہیر شعرا گزرے ہیں اور جنہوں نے اپنے دیوان غزلیات یا دیگر تصانیف نظم بالترتیب جمع کی ہیں ان سب کا صدر انجمن (وؔلی) کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔'' ۶۸؎

وؔلی کی علمی لیاقت کے بارے میں آزاد کا یہ کہنا کہ ''ان کی علمی تحصیل کا حال ہماری لاعلمی کے اندھیرے میں ہے...... چنانچہ ان کے اشعار سے معلوم ہوگا کہ وہ قواعد وعروض کی طرح زبان عربی سے بھی ناواقف تھے۔'' ۶۹؎ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ احسن مارہروی کے اس بیان کو خلاف واقعہ قرار دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''یہ کہنا کہ وہ (وؔلی) عربی وعروض سے نابلد تھے خلاف واقعہ ہے۔ ان کی کوئی غزل، کوئی شعر، کوئی رباعی، کوئی مثنوی اور کوئی مستزاد متعارف ومقررہ بحور سے باہر نہیں۔'' نیز اردو کی ابتدائی حیثیت کے موافق جا بہ جا عربی الفاظ و تراکیب بھی ان کے کلام سے مفقود نہیں...... بعض عربی و فارسی کے الفاظ متحرک لکھ دینے سے ان کی جہالت و ناواقفیت نہیں ثابت ہوتی۔ سیر تلاش سے معلوم ہوگا کہ وہ لوگ بھی جن کی مشرقی فضیلت مسلم تھی (وؔلی) سے سو برس بعد تک انہیں حرکات وسکنات کے عادی رہے۔'' ۷۰؎

قاضی عبد الودود بھی آزاد کے عروض والے بیان سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کلیات وؔلی سے اس کی شہادت نہیں ملتی کہ وہ عروض کے قواعد سے ناواقف تھے۔ حروف کا دب کر نکلنا یا

تقطیع میں بالکل ساتھ ہوجانا ایسی بات نہیں جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ وہ عروض سے بے خبر تھے۔''ا؎

مصطفیٰ خاں یکرنگ کے بارے میں آزاد کا خیال ہے کہ وہ آخر عمر میں مرزا مظہر جان جاناں کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔اس حوالے سے آزاد نے یکرنگ کا ایک شعر بھی نقل کیا ہے،اور لکھا ہے کہ اس شعر میں ''مرزا مظہر جان جاناں کی استادی اور اپنی شاگردی کا اشارہ ہے۔'' وہ شعر یہ ہے۔ ؎

جس کے درد دل میں کچھ تاثیر ہے
گر جواں بھی ہے تو میرا پیر ہے

قاضی عبدالودود یکرنگ کو تلمذ مظہر نہیں مانتے ، وہ لکھتے ہیں''اس شعر سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ یہ شعر مظہر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔آزاد نے یکرنگؔ کے بیان میں ایک اور شعر لکھا ہے جس میں مظہر کا ذکر ہے،لیکن تلمذ کا ثبوت اس سے بھی نہیں ملتا۔'' مزید انہوں نے یہ بھی لکھا کہ ''شعرائے اردو کا کوئی تذکرہ نگار یکرنگؔ سے ذاتی واقفیت کا مدعی نہیں،قرینہ ہے کہ میرؔ کے مستقل طور پر دہلی آنے سے پیشتر ہی ان کی شمع حیات گل ہو چکی تھی۔سال ولادت درکنار کسی تذکرے سے یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ کیا عمر پائی تھی،آزاد یہ نہیں بتاتے کہ یکرنگؔ، مظہرؔ سے قبل کس سے اصلاح لیا کرتے تھے۔تلمذ نظیر کی کوئی قابل وثوق شہادت موجود نہیں۔آرزو کی ''تنبیہ الغافلین'' کی جو عبارات قول فیصل میں منقول ہیں،ان میں سے ایک شاگردی آرزو پر مشعر ہے اور ''مخزن نکات'' اس کا مصداق ہے۔۳؎

دوسرے دور میں آزاد سب سے پہلے شاہ حاتمؔ کا تعارف کراتے ہوئے مصحفیؔ کے حوالے سے ان کی شاعری کی ابتدا کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''شیخ غلام ہمدانی مصحفی اپنے تذکرے میں ان (حاتمؔ) کی شاعری کی ابتدا یہ لکھتے ہیں کہ ''۱۱۳۰ھ محمد شاہی عہد میں ولیؔ کا دیوان دکن سے دہلی آیا۔اس زمانے کے حال کو بموجب وہی غنیمت تھا۔اس واسطے خاص وعام میں اس کا بہت چرچا ہوا۔''۴؎

محمود شیرانی کا کہنا ہے کہ ''۳ نہیں ۲ جلوس محمد شاہی شاہ حاتمؔ کی سند پر مصحفیؔ نے دہلی میں ولیؔ کے دیوان کی آمد کی تاریخ دی ہے۔مصحفی کی عبارت یہ ہے''روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ درسن دوئم فردوس

آرام گاہ دیوان ولی در شاہجہاں آباد آمدہ'' ۵؎ اور آزاد نے خود ستمبر ۱۸۶۷ء میں شاہ حاتم پر جو مضمون لکھا تھا اس میں ۲ ہی دیا ہے۔'' ۶؎ معلوم نہیں آب حیات میں انہوں نے ۳ کیوں کر لکھا۔ ابرار عبدالسلام کا خیال ہے کہ: '' آزاد یہاں پر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ولی کے دیوان کی دہلی آمد ۱۱۳۲-۳۳ھ (۲۰-۱۷۱۹ء) کے بعد شاہ حاتم نے بھی شعر کہنا شروع کیا، حالاں کہ ایسا ہرگز نہیں۔ دیوان ولی کی آمد سے پہلے شمالی ہند میں باقاعدہ شاعری شروع ہو چکی تھی۔ حاتم کے بیان کے مطابق انہوں نے ۱۱۲۸ھ (۱۷۱۷ء) میں شاعری شروع کی جب ان کی عمر سترہ سال کے لگ بھگ تھی۔ حاتم نے دیوان زادہ کے مقدمہ لکھا ہے کہ '' از سنہ یک ہزار و یک صد و بیست و ہشت تا یک ہزار و یک صد و شنت و نہ کہ چہل سال باشد۔ نقد عمر دریں فن نمود۔'' ۷؎

آزاد شاہ حاتم کے فارسی دیوان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاہ حاتم کا ایک دیوان فارسی میں بھی ہے۔ مگر بہت مختصر۔ میں نے دیکھا وہ ۱۱۹۷ھ کا خود ان کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔ ۸؎ اس سلسلے میں قاضی عبدالودود کا کہنا ہے کہ '' شاہ اودھ کے کتب خانے میں جو نسخہ حاتم کے دیوان فارسی کا تھا اس کے بارے میں بجنسہ یہی باتیں اشپرنگر نے لکھی ہیں۔ آزاد نے اشپرنگر کے دیکھنے کو اپنا دیکھنا تصور کر لیا ہے۔ ورنہ اس کا امکان ہے کہ فہرست میں جس نسخے کا ذکر ہے وہ انہوں نے دیکھا ہو یا ۱۱۷۹ھ میں حاتم نے ایک اور نسخہ لکھا ہو اور وہ آزاد کی نظر سے گزرا ہو بہت کم ہے۔ ۹؎

آزاد کے مطابق شاہ حاتم ۹۶ برس کی عمر میں ماہ رمضان ۱۲۰۷ھ میں دہلی میں فوت ہوئے۔ '' آزاد کے ماخذ میں فہرست اشپرنگر اور طبقات شعرائے ہند سر فہرست ہیں۔ ان دونوں میں حاتم کی وفات تقریباً ۱۲۰۷ھ ہی مرقوم ہے۔ طبقات شعرائے ہند ص ۱۳۳ پر مولوی کریم الدین لکھتے ہیں: '' وہ درمیان ۱۷۹۱ء میں دہلی میں فوت ہوئے۔'' ۱۷۹۱ء بمطابق ۷-۱۲۰۶ھ بنتے ہیں۔ جب کہ فہرست اشپرنگر ص، ۲۳۵ پر حاتم کے بیان میں تحریر ہے '' وہ دہلی میں ۱۱۱۱ھ میں پیدا ہوئے تھے...... تذکرۂ مصحفی کی تصنیف سے دو تین سال پیش تر انہوں نے انتقال کیا۔'' مصحفی کا تذکرہ '' تذکرۂ ہندی'' ۱۲۰۹ھ میں مکمل ہوا۔ دو تین سال پیشتر ۷-۱۲۰۶ھ بنتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آزاد نے قیاس سے کام لیتے ہوئے ۱۲۰۷ھ لکھ دیا ہو۔ ۸۰؎ قاضی عبدالودود '' عقد ثریا'' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ '' اس میں الفاظ میں لکھا ہے۔ یک

ہزار و نو دو ہفت ۔آزاد نے جو ۱۲۰۷ھ لکھی ہے اس کی کوئی سند نہیں ۔'' ۸۱؎

سراج الدین علی خاں آرزؔو کا ذکر کرتے ہوئے آزاد نے ان کے شاگردوں کی جو فہرست دی ہے ان میں مرزا جان جاناں، سوؔدا، میر تقی میؔر اور درؔد وغیرہ شامل ہیں۔مگر ان میں سے بعض کے متعلق یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خان آرزؔو کے شاگرد ہیں۔قاضی عبدالودود لکھتے ہیں ''مظہر جان جاناں ہرگز ان لوگوں میں شمار نہیں کیے جا سکتے جو آرزؔو کی آغوش طبیعت میں پلے ہیں۔'' ۸۲؎ مزید قاضی صاحب نے ''مجمع النفائس'' اور ''تنبیہ الغافلین'' سے اقتباسات نقل کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ مظہر جان جاناں خان آرزو کے شاگرد نہیں ۔لیکن بعض اسناد سے وہ آرزو کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں ۔لیکن وہ اسناد قابل قبول نہیں ۔اسی طرح خلیق انجم میؔر کی شاگردی سے اتفاق نہیں کرتے ۔وہ لکھتے ہیں کہ ''میؔر کو خان آرزو سے تلمذ نہیں تھا ورنہ آرزو 'مجمع النفائس' میں یا کسی اور کتاب میں اس کا ضرور ذکر کرتے ۔انہوں نے اپنے تمام شاگردوں کے ترجموں میں اپنی استادی کا ذکر کیا ہے۔'' ۸۳؎

خان آرزؔو کی اردو شاعری کے حوالے سے آزاد کا یہ خیال ہے کہ ''وہ اردو کے شاعر نہ تھے، نہ اس زمانے میں اسے کچھ کمال سمجھتے تھے۔(آب حیات، ص:۱۱۶) اس ضمن میں جمیل جالبی کا بھی یہی خیال ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ ''اردو میں خان آرزؔو نے ستائیس (۲۷) شعر کہے ہیں۔اشعار کی یہ تعداد ہرگز ایسی نہیں ہے کہ ان کے حوالے سے انہیں تاریخ ادب میں جگہ دی جائے۔'' ۸۴؎ بہرحال! آزاد نے آروزؔ کے انتخاب اشعار میں ایک شعر لکھا ہے۔ ؎

مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ قلقل نہ ہووے گا
مۓ گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا ۸۵؎

'نکات الشعرا' ص ۱۵۶، گلزار ابراہیم، مجموعۂ نغز ۲، ص ۲۳۲، اور تذکرہ میر حسن، ص ۱۷۵، اس کے مصدق ہیں۔ ۸۶؎ قاضی صاحب کی بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اس کے علاوہ بھی کئی تذکرے مثلاً تذکرہ شورش مشمولہ دو تذکرے ص ۱۹۴، اور مخزن نکات، ص ۱۲۲ میں بھی اسے میؔر کا شعر بتایا ہے۔اشرف علی خاں فغاںؔ کے متعلق آزاد نے دو حکایتیں بیان کی ہیں۔پہلی یہ کہ:

''ایک دن راجہ صاحب (شتاب رائے) کے دربار میں غزل پڑھی

جس کا قافیہ تھا 'لالیاں اور جالیاں، سب سخن فہموں نے بہت تعریف
کی۔ راجہ صاحب کی صحبت میں جگنوں میاں ایک مسخرے تھے، ان کی
زبان سے نکلا کہ نواب صاحب سب قافیے آپ نے باندھے مگر
تالیاں رہ گئیں۔ انہوں نے ٹال دیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ راجہ
صاحب نے خود فرمایا، نواب صاحب سنتے ہو، جگنوں میاں کیا کہتے
ہیں؟ انہوں نے کہا کہ مہاراج اس قافیہ کو مبتذل سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور
حضور فرمائیں تو اب بھی ہوسکتا ہے۔ مہاراج نے فرمایا ہاں کچھ کہنا تو
چاہیے، انہوں نے اس وقت پڑھا۔

جگنوں میاں کی دم جو چمکتی ہے رات کو
سب دیکھ دیکھ اس کو بجاتے ہیں تالیاں

(آب حیات، ص: ۱۱۹)

قاضی عبدالودود اس حکایت کو نہیں مانتے۔ وہ لکھتے ہیں ''ترجمہ فغاں میں میاں جگنو سے متعلق جو شعر ہے وہ دیوان فغاں کے کسی نسخے میں نہیں ہے، اور آزاد نے شعر کے بارے میں جو حکایت لکھی ہے وہ بھی آب حیات کے سوا کہیں نہیں ملتی۔ ۸۷؎

دوسری حکایت یہ ہے:

''راجہ صاحب نے کہا کہ نواب صاحب: ملکہ زمانی کو احمد شاہ درّانی
کیوں کر لے گیا۔ انہیں یہ بات ناگوار ہوئی، افسردہ ہو کر بولے کہ
مہاراجہ جس طرح سیتا جی کو راون لے گیا تھا اسی طرح وہ لے
گیا۔ اس دن سے دربار میں جانا چھوڑ دیا۔''

قاضی عبدالودود اس واقعہ سے بھی اختلاف کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''ملکہ زمانی محمد شاہ کی بی بی اور اس کی دوسری زوجہ صاحبۂ محل کی خالہ زاد بہن ہیں۔ موخر الذکر کی بیٹی حضرت محل سے احمد شاہ نے بہ جبر عقد کیا، تو یہ دونوں اپنی مرضی سے حضرت بیگم کے ساتھ گئیں (تاریخ عالم گیر ثانی مجہول المصنف،

ص: ۲۲۰) آزاد کو حقیقت کا علم نہ تھا، لیکن یہ بات شتاب رائے کے متعلق فرضی نہیں کہی جاسکتی۔ اس سے قطع نظر وہ ایک شائستہ آدمی تھا، شاہی خاندان کی ایک خاتون کے بارے میں ایسی بات شاید ہی اس کی زبان سے نکل سکتی ہے۔'' جہاں تک دربار چھوڑنے والی بات ہے تو اس سلسلے میں قاضی صاحب کی رائے یہ ہے کہ ''اگر اس کی اصلیت ہوتی تو عظیم آباد سے تعلق رکھنے والے کا تذکرہ نگار اس کا ضرور ذکر کرتے۔ آزاد کے سوا کسی نے نہیں لکھا۔ ۸۸؎ ہوسکتا ہے کہ آزاد نے فغاںؔ کے ترجمے میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے یہ روایت اختراع کرلی ہو۔

تیسرے دور کی تمہید میں قدیم زبان کے نمونے کے طور پر آزاد نے بہت سے اشعار لکھے ہیں۔ ان میں سے بعض کا انتساب غلط ہے۔ ابرار عبدالسلام نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''آب حیات'' میں ان اشعار کی نشان دہی کی ہے۔ ذیل میں وہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

بیوفائی کیا کہوں دل ساتھ تجھ محبوب کی
تیری نسبت سے میاں بلبل سے گل نے خوب کی

آزاد نے یہ شعر سوداؔ سے منسوب کیا ہے۔ ابرار عبدالسلام لکھتے ہیں کہ ''یہ شعر سوزؔ کا ہے۔ دیوان سوزؔ میں بعض الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ موجود ہے۔ کلیات سوداؔ مرتبہ آسی، مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن اور مرتبہ ڈاکٹر شمس الدین میں یہ شعر موجود نہیں۔''

جاتے ہیں لوگ قافلے کے پیش و پس چلے
ہے یہ عجب سرا کہ جہاں آئے بس چلے
صیاد اب تو کر دے قفس سے ہمیں رہا
ظالم پھڑک پھڑک کے پرو بال گھس چلے
خیال ان انکھڑیوں کا چھوڑ مت مرنے کے بعد از بھی
دل آیا جو تو اس میکدے میں جام لیتا جا

مذکورہ بالا اشعار کو بھی آزاد نے سوداؔ سے منسوب کیا ہے۔ حالاں کہ یہ اشعار بھی بعض الفاظ کی تبدیلیوں کے ساتھ دیوان سوزؔ میں موجود ہیں۔'' ۸۹؎

ایک یہ شعر جسے آزاد سودؔا سے منسوب کرتے ہیں:

وہ صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

اس شعر کے بارے میں قاضی عبدالودود کی تحقیق یہ ہے کہ ''مطبوعہ کلیات سوؔدا، ص:۱۰۹ پر پوری غزل موجود ہے، لیکن یہ ایک نہایت ہی نا معتبر خطی نسخے پر مبنی ہے۔ قابل اعتبار نسخے اس سے خالی ہیں۔ تذکرہ میر حسن، ص ۱۲۶ و گلزار ابراہیم وغیرہ میں شیدؔا، شاگرد سوؔدا کے نام سے ہے، اور کوئی معقول وجہ اس کی نہیں کہ وہ اس کا مصنف نہ سمجھا جائے۔''۹۰ تذکرہ مسرت افزا، ص ۱۳۷، گلشن سخن، ص ۱۶۴، تذکرہ عشقی، ص ۲۸، اور تذکرہ سرور ص ۳۶۹ میں بھی یہ شعر شیدؔا کے نام سے ہی منسوب ہے۔''۹۱

تمہید کے بعد اس دور میں سب سے پہلے مرزا مظہر جان جاناں کا ذکر آتا ہے۔ ان کے نسب اور ولادت کے بارے میں آزاد رقم طراز ہیں:

> ''نسب ان کا باپ کی طرف سے محمد بن حنیفہ سے ملتا ہے کہ حضرت علی کے بیٹے تھے۔ ماں بیجا پور کے شریف گھرانے سے تھیں۔ دادا بھی دربارشاہی میں صاحب منصب تھے۔ دادی اسد خاں وزیر عالم گیر کی خالہ زاد بہن تھیں ...... یہ کالا باغ علاقہ مالوہ میں ۱۱/ رمضان کو جمعہ کے دن پیدا ہوئے۔''۹۲

آزاد کا یہ بیان معمولات مظہریہ سے ماخوذ ہے۔ ''حضرت ایشاں کی جدہ محترمہ اسد خاں وزیر کی خالہ زاد بہن تھیں۔''۹۳ لیکن ''معمولات مظہریہ'' کے مترجم محمد امجد علی مجددی انہیں بہن نہیں بلکہ بیٹی بتاتے ہیں۔ ان کا یہ بیان ہے کہ ''آپ کی دادی صاحبہ اسد خاں وزیر کی دختر تھیں۔'' اسی طرح پیدائش کے سلسلے میں آزاد نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب معمولات مظہریہ سے ماخوذ ہے۔ اس کی عبارت یہ ہے۔ ''دوران سفر جب کالا باغ کے مقام پر کہ حدود مالوہ میں واقع ہے پہنچے، شب جمعہ ۱۱/ رمضان المبارک تھی جب یہ نیر اعظم و آفتاب معظم مطلع سعادت سے طلوع ہوا۔''۹۴

مرزا مظہؔر اور تاباؔں کے سلسلے میں آزاد کا یہ بیان:

''سید عبدالحیٔ تاباں ایک نوجوان شریف زادہ حسن وخوبی میں اس قدر شہرۂ آفاق تھا کہ خاص وعام اسے یوسف ثانی کہتے تھے......مرزا صاحب کے مرید تھے۔مرزا صاحب بھی چشم محبت اور نگاہ شفقت سے دیکھتے تھے۔چنانچہ اکثر ایسا ہوتا کہ مرزا صاحب بیٹھے ہیں، تاباں بھی حاضر ہیں اور باادب اپنے مرشد کی خدمت میں بیٹھے ہیں۔ حضرت اگر چہ محفل ارشاد کے آداب سے گرم جوشی ظاہر نہ کرتے تھے،مگر معلوم ہوتا تھا کہ انہیں دیکھتے ہیں اور مارے خوشی کے باغ باغ ہوئے جاتے ہیں۔تاباں بھی مزاج داں تھے،اشعار اور لطایف نمکین کہتے۔حضرت سن سن کر خوش ہوتے۔''۹۵

قاضی عبدالودود آزاد کے اس بیان کو اختراعی مانتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں کہ''آزاد نے جو جزئیات بیان کیے ہیں اختراعی ہیں۔ان کے پاس کوئی ذریعہ ان کو معلوم کرنے کا نہ تھا۔''۹۶ مولانا عبدالحیٔ بھی آزاد کے اس بیان کو تسلیم نہیں کرتے۔ان کا کہنا ہے کہ''کچھ شبہہ نہیں کہ تاباں کو مرزا صاحب سے عقیدت اور مرزا صاحب کو ان سے محبت تھی۔بعضوں نے لکھا ہے کہ مرزا صاحب کے مرید ہو گئے تھے،مگر جو شخص پیرو مرشد کے تعلقات خصوصاً مرزا صاحب کے انداز واطوار اور طریقہ سے واقف ہوگا وہ کبھی ان خرافات باتوں کو تسلیم نہیں کر سکتا۔''۹۷ اس سلسلے میں مسعود حسن رضوی ادیب کا خیال سب سے الگ ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''مذہبی تعصب کے مریضوں کو ان بیانوں میں آزاد کے تعصب کی جھلک نظر آتی ہے۔وہ یہ تو یاد رکھتے ہیں کہ مرزا مظہر ایک صوفی بزرگ تھے،لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ تصوف کے مسلک میں عشق مجازی، عشق حقیقی کا زینہ سمجھا جا سکتا ہے۔خود مرزا مظہر کے والد نے نصیحت کی تھی......اس نصیحت اور وصیت کی بنا پر مرزا مظہر کا فرض تھا کہ باپ کی روح خوش کرنے کے لیے عشق مجازی کا طوق گلے میں ڈال کر خود کو کوچہ وبازار میں رسوا اور خوار کریں۔''۹۸

مسعود حسن رضوی ادیب کی بات اس حد تک تو صحیح ہے کہ عشق مجازی، عشق حقیقی کا زینہ سمجھا جاتا ہے، لیکن مسلک تصوف اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ عشق مجازی کا زینہ فحاشی اور لغویات سے سجایا جائے۔ ایک مرید کی یہ مجال کہ وہ اپنے مرشد کے ''کان کے پاس منھ لے جائے اور چند کلمے چپکے سے ایسے گستاخانہ کہے کہ سوائے اس پیارے عزیز کو کوئی کہہ نہ سکے۔'' یہ ممکن ہی نہیں۔ آزاد کا یہ بیان صاف طور پر اختراعی معلوم ہوتا ہے۔ کامل قریشی بھی آزاد کے اس بیان کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مسلک کے اعتبار سے مرزا مظہر چوں کہ سنی العقیدہ تھے اور صوفی منش بزرگ تھے، اس لیے محمد حسین آزاد کو ان کی کوئی ادا پسند نہیں آئی اور اسی لیے ان کی شہرت، آبرو اور نیک نامی کو دھچکہ پہنچانے کے لیے آزاد نے تاباں کی سرگوشیوں والے مفروضہ کو تعلقات کا رنگ دے کر مرزا کو بدنام کرنے کی جسارت کی ہے۔ ورنہ حقائق اتنے ہیں کہ تاباں مرزا کے مرید تھے۔......''[۹۹]

مرزا مظہر جان جاناں کے تحصیل علم کے سلسلے میں آزاد لکھتے ہیں کہ: ''مرزا صاحب کی تحصیل علمی زیادہ نہ تھی، مگر علم حدیث کو با اصول پڑھاتے تھے۔''[۱۰۰] اگر مرزا صاحب علم حدیث اصول کے ساتھ پڑھا لیتے تھے تو ان کے تحصیل علوم کے متعلق یہ کہنا کہ ''وہ عالمانہ نہیں تھی صحیح معلوم نہیں ہوتا۔'' ان کے خطوط میں جا بہ جا بکھرے قرآن و حدیث، تفسیر، اصول فقہ، تاریخ اور مختلف کتابیات کے حوالے سے اس بیان کی تردید کرتے ہیں۔ مرزا صاحب کے معاصرین کے بیانات سے بھی ان کی علمی صلاحیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے مرید غلام علی لکھتے ہیں:

> ''آپ (مرزا مظہر) علوم ظاہری اور باطنی کے عالم، کامل فقیہ اور مکمل عارف تھے۔ آپ نے طریقۂ احمدیہ کے سلوک مقامات حضرت مجدد کے سجادہ نشین فرزند عروۃ الوثقیٰ حضرت ایشان محمد معصوم کے خلیفہ شیخ عبدالحق محدث کی اولاد سے ہیں۔ سالہا رہ کر فیض حاصل کیا اور اعلیٰ مقامات اور عمدہ حالات سے مشرف ہوئے۔''[۱۰۱]

اسی طرح مرزا مظہر کی وفات کا واقعہ آزاد یوں بیان کرتے ہیں:

”غرض ساتویں محرم کی تھی کہ رات کے وقت ایک شخص مٹھائی کی ٹوکری ہاتھ میں لیے آیا۔ دروازہ بند تھا۔ آواز دی اور ظاہر کیا کہ مرید ہوں۔ نذر لے کر آیا ہوں قرابین ماری کہ گولی سینہ کے پار ہوگئی۔ وہ تو بھاگ گیا مگر انہیں زخم کاری آیا۔ تین دن تک زندہ رہے۔“ ۱۰۲

آزاد کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے یہاں نذر و نیاز لے کر ہر شخص ہر وقت آ سکتا تھا، اور مرزا صاحب بلا تکلف نیاز قبول فرماتے تھے۔ ایسا ہرگز نہیں۔ مولانا عبدالحیٔ ”معمولات مظہریہ“ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ نذر نیاز کے لیے ایسی کڑی شرطیں لگا رکھی تھیں کہ مشکل سے پوری ہوتی ہوں گی۔ وہ شرطیں یہ تھیں۔ (۱) یہ کہ پیش کش کرنے والا شریف و نجیب ہو (۲) دنیا داروں سے اختلاط نہ رکھتا ہو (۳) فی الجملہ صالح اور پرہیزگار ہو (۴) حلال و حرام میں تمیز کرنے کا علم رکھتا ہو (۵) ایسے ملک سے تازہ وارد نہ ہو جہاں لوٹ مار ہوئی ہو (۶) اخلاص عقیدت سے پیش کرتا ہو، وغیرہ وغیرہ۔ دوسری بات یہ کہ مرزا صاحب سے ملنے اس وقت ایک شخص نہیں، بلکہ کئی لوگ آئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں کوئی مٹھائی کی ٹوکری نہیں تھی۔ ۱۰۳ مرزا صاحب کے مرید شاہ غلام علی نے یہ واقعہ بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کا بیان ہے:

”بدھ کی رات ساتویں محرم ۱۱۹۵ھ کو پہر رات گزرے چند آدمیوں نے آپ کے دروازے پر دستک دی۔ خادم نے عرض کی کہ بعض لوگ آپ کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔ فرمایا آنے دو۔ تین آدمی اندر آئے، ایک ان میں ولایتی مغل تھا۔ آپ خواب گاہ سے اٹھ کر ان کے سامنے کھڑے ہوئے، مغل نے پوچھا۔ کیا مرزا جان جاناں آپ ہی ہیں؟ فرمایا ہاں! دوسرے دو آدمیوں نے بھی کہا کہ ہاں مرزا مظہر جان جاناں یہی ہیں۔ پس اس بدبخت نے گولی کا وار کیا۔ گولی بائیں طرف دل کے قریب لگی۔ آپ بہ سبب کمزوری اور ناطاقتی کے زمین پر گر پڑے۔“ ۱۰۴

آزاد کا سوؔدا کے آبا و اجداد کے سلسلے میں یہ خیال ہے کہ ”سوؔدا کے باپ مرزا محمد شفیع میرزایان

کابل سے تھے۔''اور اکثر تذکرہ نگاروں نے اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔''مجموعۂ نغز، جلد اوّل، ص۳۰۴، گلشن بے خار، ص۲۴۴، شعرائے ہند، ص۱۰۹، سخن شعرا، ص۲۲۲، تذکرہ آزردہ، ص۴۸، خمخانۂ جاوید، جلد چہارم، ص۲۳۶، سے آزاد کے خیال کی تائید ہوتی ہے۔لیکن سفینۂ ہندی، ص۱۰۵، اور باغِ معانی، ص۱۰۷ میں مذکور ہے کہ مرزا کے آبا و اجداد بخارا سے آئے تھے۔''۱۰۵ گیان چند جین کا بھی یہی خیال ہے۔ وہ قاضی عبدالودود کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''قاضی عبدالودود نے دھیان دلایا کہ ہاتف کی ہجو میں سوؔدا نے اس کے باپ کے لیے لکھا ہے ۔ع''وہ خرس گر مغل کوئی ہوگا تو کابلی ہوگا۔''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سوؔدا کے والد کابلی مغل نہیں ہو سکتے تھے۔صاحب''باغِ معانی''کے سوؔدا سے ذاتی تعلقات تھے، اس نے لکھا ہے کہ سوؔدا کے اجداد بخارا سے ہندوستان آئے تھے۔''۱۰۶

شاہ عالم اور سوؔدا کے سلسلے میں آزاد کا یہ لطیفہ بہت مشہور ہے:

> ''جب (سوؔدا کے) کلام کا شہرہ عالم گیر ہوا تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لیے دینے لگے، اور فرمائش کرنے لگے۔ایک کسی غزل کے لیے تقاضا کیا۔انہوں نے عذر بیان کیا۔حضور نے فرمایا۔بھئی مرزا کئی غزلیں روز کہہ لیتے ہو؟ مرزا نے کہا پیرومرشد جب طبیعت لگ جاتی ہے، دو چار شعر کہہ لیتا ہوں۔حضور نے فرمایا۔بھئی ہم تو پائخانہ میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں۔ہاتھ باندھ کر عرض کی، حضور ویسی بو بھی آتی ہے۔یہ کہہ کر چلے آئے۔''۱۰۷

آزاد کے مذکورہ بیان میں دو باتیں قابل غور ہیں۔پہلی یہ کہ کیا واقعی شاہ عالم سوؔدا کے شاگرد تھے؟ دوسری یہ کہ آزاد نے بادشاہ کے حوالے سے غزلیں کہنے والی جو بات نقل کی ہے اس میں کتنی صداقت ہے؟ جہاں تک پہلے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں امتیاز علی عرشی، محمود شیرانی اور خلیق انجم ان تینوں شخصیات نے اس کی تردید کی ہے۔امتیاز علی عرشی لکھتے ہیں:

''سوؔدا کی شاگردی کا ذکر شاہ عالم یا سوؔدا کے کسی معاصر تذکرہ نویس نے نہیں کیا۔ نہ شیخ چاند نے سوانح سوؔدا میں بیان کیا......شاہ عالم ۱۱۷۳ھ میں بہار میں تخت پر بیٹھے اور ۱۱۸۵ھ میں دلّی آئے۔ سوؔدا اس سے بہت پہلے فرخ آباد جا چکے تھے، اور خط و کتابت کے ذریعہ سے بھی اصلاح کا کوئی ثبوت نہیں۔''۱۰۸

محمود شیرانی نے لکھا ہے کہ ''سوؔدا کی کبھی شاہ عالم سے ملاقات ہوئی ہی نہیں۔''۱۰۹ اور یہی خیال خلیق انجم کا بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''کوئی مقام ایسا نہیں جہاں شاہ عالم اور سوؔدا ایک ساتھ رہے ہوں۔ اگر یہ تلمذ اس زمانے سے قبل تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ میرؔ، گردیزی، قائم اور شفیق اس کا ذکر نہیں کرتے۔''۱۱۰

اسی طرح غزل والی حکایت کے سلسلے میں اکثر محققین کی رائے یہ ہے کہ یہ حکایت حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ حافظ محمود شیرانی شاہ عالم اور سودا کی گفتگو کو بے اصل اور بے معنی قرار دیتے ہیں۔ (مقالات شیرانی، جلد دوم، ص:۹۷) قاضی عبد الودود اسے فرضی حکایت قرار دیتے ہیں۔ (آزاد بہ حیثیت محقق، ص:۳۷) گیان چند جین کا خیال ہے کہ ''نہ بادشاہ ایسی رکیک بات کہہ سکتا تھا نہ سوؔدا کو ایک بادشاہ پر ایسا طنز کرنے کی ہمت ہو سکتی تھی۔''۱۱۱

اسی تیسرے دور میں میر ضاحک کے حالات بیان کرتے ہوئے آزاد آخر میں لکھتے ہیں:

''میر ضاحکؔ کا انتقال ہوا تو سوؔدا فاتحہ کے لیے گئے، اور دیوان اپنا ساتھ لیتے گئے۔ بعد میں رسم عزا پرسی کے موقع پر نوکر سے دیوان منگا کر جو ہجویں ان کی کی تھیں سب چاک کر ڈالیں۔ میر حسن نے بہ تقاضائے علو حوصلہ و سعادت مندی اسی وقت دیوان باپ کا گھر سے منگایا اور جو ہجویں ان کی تھیں وہ پھاڑ ڈالیں۔ لیکن سوؔدا کی تصنیف قلم سے نکلتے ہی بچہ بچہ کی زبان پر پھیل جاتی تھی۔ اس لیے سب قائم رہیں۔ ان کا (میر ضاحک) کلام اسی مجلد کے اندر تھا، مفقود ہو گیا۔''۱۱۲

بقول ابرار عبد السلام ''آزاد کا یہ بیان خود ان کے بیانات کی روشنی میں باطل ٹھہرتا ہے۔ آزاد نے

سوؔدا کے ترجمہ میں ان کا سنہ وفات ۱۱۹۵ھ لکھا ہے اور میر ضاحکؔ کو گلزار ابراہیم کے حوالے سے ۱۱۹۶ھ میں بہ حیات بتایا ہے۔''۱۱۳ محمود شیرانی لکھتے ہیں کہ ''اگر چہ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ ضاحکؔ کب فوت ہوئے، مگر یہ یقینی ہے کہ مرزا مرحوم ضاحک کی وفات پر تعزیت کے لیے نہ آئے اور نہ آسکتے تھے، اور نہ ہجویں چاک کر سکتے تھے، کیوں کہ مرزا ضاحک سے پہلے گلزار عالم سے رحلت کر چکے ہیں۔ یہ ہجویں آج بھی کلیات سوؔدا میں موجود ہیں۔''۱۱۴ میر ضاحک کے دیوان میں وہ ہجویں موجود ہیں یا نہیں واللہ اعلم۔ گیان چند جین نے صرف یہ خبر دی ہے کہ ''بتیا راج بہار میں ضاحکؔ کا دیوان دریافت ہو گیا ہے۔ یعنی یہ مفقود نہیں ہوا۔۱۱۵ لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اس دیوان میں وہ ہجویں موجود ہیں یا نہیں جو سوؔدا کے لیے لکھی گئی تھیں۔

آزاد خواجہ میر دردؔ کے احوال میں لکھتے ہیں کہ ''انتیس برس کی عمر میں 'واردات درد' کے نام سے ایک رسالہ لکھا، اور اس کی شرح علم الکتاب کا ایک بڑا نسخہ تحریر کیا کہ اس میں ایک سو گیارہ رسالے ہیں۔''۱۱۶ قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ ''یہ کتاب دو مقدموں اور ایک سو گیارہ (۱۱۱) ابواب پر مشتمل ہے۔ دردؔ نے باب کے لیے لفظ 'وارد' کا استعمال کیا ہے۔ ان کی حقیقت بیان کیے بغیر انہیں رسائل کہنا غلط فہمی کا باعث ہو سکتا ہے۔۱۱۷ اسی طرح آزاد نے شاہ عبدالعزیز اور سوؔدا کی طرف سے میر دردؔ پر ہوئے طنز کا ایک ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ (آب حیات، ص:۱۷۸،۱۷۹) جس کے بارے میں اسلم فرخی کا خیال ہے کہ ''خواجہ صاحب کی بزرگی، متانت، سنجیدگی اور خاندانی وجاہت کی روشنی میں یہ دونوں واقعے صحیح نہیں معلوم ہوتے۔''۱۱۸

میر تقی میرؔ کا تعارف آزاد یوں کراتے ہیں:

> ''میرؔ تخلص محمد تقی نام، خلف میرؔ عبداللہ، شرفائے اکبرآباد سے تھے۔ سراج الدین علی خاں آرزوؔ......گلزار ابراہیمی میں لکھا ہے کہ میرؔ صاحب کا ان سے دور کا رشتہ تھا، اور تربیت کی نظر پائی تھی۔ عوام میں ان کے بھانجے مشہور ہیں۔ در حقیقت بیٹے میر عبداللہ کے تھے، مگر ان کی پہلی بیوی سے تھے۔ وہ مر گئیں تو خان آرزو کی ہمشیرہ سے شادی کی تھی۔''۱۱۹

آزاد کے اس بیان میں کئی غلطیاں ہیں جن کی طرف محققین نے توجہ دلائی ہیں۔سب سے پہلے میؔر کے والد کے نام کا مسئلہ آتا ہے،اس سلسلے میں اسلم فرخی کا خیال یہ ہے کہ ''نساخ اور محسن کی تقلید میں آزاد نے میؔر کے والد کا نام عبداللہ لکھا ہے۔آزاد ''ذکر میؔر'' سے واقف نہیں تھے اس لیے انہوں نے وہی نام لکھا جو متداول تھا۔'' ۱۲۰ یوں تو میؔر کے والد کا نام محمد علی یا میر محمد علی تھا۔جیسا کہ ''ذکر میؔر'' سے ثابت ہے۔''خواجہ محمد باسط میؔر کو نواب امیر الامرا کی خدمت میں لے گئے اور نواب نے پوچھا ''ایں پسر از کیست'' خواجہ نے جواب دیا ''از میر محمد علی است'' قاضی عبدالودود نے بھی ذکر میؔر ہی کے حوالے سے میؔر کے والد کا نام محمد علی بتایا ہے۔'' ۱۲۱

اسی طرح آزاد کا یہ کہنا کہ میؔر پہلی بیوی سے تھے۔دوسری بیوی خان آرزو کی بہن تھیں،صحیح نہیں ہے۔میر تقی میؔر،علی متقی کی پہلی بیوی سے نہیں بلکہ دوسری بیوی سے تھے۔علی متقی کی پہلی بیوی خان آزرو کی بہن تھی۔جب ان کا انتقال ہو گیا تو علی متقی نے میؔر کی والدہ سے دوسری شادی کی۔پہلی بیوی سے حافظ محمد حسن تھے،جنہیں میؔر نے اپنا بڑا بھائی کہا ہے۔۱۲۲ بقول قاضی عبدالودود ''آزاد کے بیان کی تردید کے لیے یہ کافی ہے کہ میؔر کے سوتیلے بھائی جو آرزو کے بھانجے تھے،وہ میؔر سے بہت بڑے تھے۔'' ۱۲۳

خان آرزؔو سے میؔر کی علاحدگی کی آزاد نے جو وجہ بیان کی وہ یہ ہے کہ ''خان صاحب (آروز) حنفی مذہب تھے،اور میؔر صاحب شیعہ۔اس پر نازک مزاجی غضب۔غرض کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہو گئے'' ۱۲۴ نثار احمد فاروقی،قاضی عبدالودود اور عبدالباری آسی آزاد کے اس خیال سے متفق نہیں۔نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''خان آرزو اور میر کے تعلقات کی خرابی یا کشیدگی کے لیے جن لوگوں نے میؔر کے مذہبی معتقدات یعنی تشیع کو سبب بتایا مناسب نہیں۔اس لیے کہ خان آرزو بھی کچھ متشدد قسم کے سنی نہ تھے،اور میؔر کم سن تھے ان کے اعتقادات میں ایسی جارحیت نہ تھی جس سے کوئی فتنہ پیدا ہو،اور خان آرزو اتنے بے رحم ہو جائیں کہ میؔر کی یتیمی،غربت اور بے کسی کا بھی خیال نہ کریں۔'' ۱۲۵

قاضی صاحب کا بھی یہی خیال ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ ''بگاڑ عقائد کی وجہ سے ہوا ہو،ذکر میؔر سے

ثابت نہیں۔اس سے کچھ اور اسباب کا پتا چلتا ہے۔''۱۲۶ لیکن قاضی صاحب نے ان اسباب کا ذکر نہیں کیا ہے۔البتہ نثار احمد فاروقی،عبدالباری آسی اور خواجہ احمد فاروقی اس علاحدگی کا سبب ''میر کے معاشقے'' کو قرار دیتے ہیں۔تفصیل کے لیے دیکھیے (ذکر میرؔ،مرتبہ: نثار احمد فاروقی،ص:۳۱،دیباچہ کلیات میرؔ، عبدالباری آسی،ص:۱۷) میر حسن کے دیوان کے بارے میں آزاد لکھتے ہیں کہ ''ان کا دیوان اب نہیں ملتا۔'' (ص:۲۵۴) قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ دیوان غزلیات آزاد کی وفات کے بعد شائع ہوا۔اگر آزاد تلاش کرتے تو انہیں بہ کثرت خطی نسخے ملتے۔مجھے پندرہ،سولہ نسخوں کے وجود کا علم ہے۔'' پھر قاضی صاحب نے کچھ نسخوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔میر حسن کی غزلوں کی تعداد بتاتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں کہ '' آج یہ نوبت ہے کہ پانچ غزلیں بھی پوری نہ ملیں جو اس کتب میں درج کرتا۔'' (ص:۲۵۴) صغیر بلگرامی کا خیال ہے کہ ''اگر آزاد ان کی غزلیں تلاش کرتے تو انہیں چنداں مشکل پیش نہ آتی۔'' پھر انہوں نے اپنی کتاب ''جلوۂ خضر'' میں آب حیات میں دی گئی غزلوں کے علاوہ میر حسن کی سات غزلیں لکھی ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اگر آزاد چاہیں تو ان غزلیات کو ''آب حیات'' کے تیسرے ایڈیشن میں شامل کر سکتے ہیں۔۱۲۸ آزاد نے تیسرے ایڈیشن میں تبدیلیاں تو کی تھیں لیکن اس وقت بھی آزاد نے پتا نہیں کیوں ان غزلیات کو ''آب حیات'' کی زینت بنانا مناسب نہیں سمجھا۔آزاد،انشاؔ کے احوال میں لکھتے ہیں:

> ''سعادت علی خاں نواڑے میں لیٹے ہوئے میر انشاء اللہ خاں کی گود میں سر دھرا ہوا،سرور کے عالم میں دریا کی سیر کرتے چلے جاتے تھے۔لب دریا ایک حویلی پر لکھا دیکھا۔حویلی علی نقی خاں بہادر کی۔کہا کہ انشا دیکھو کسی نے تاریخ کہی مگر نظم نہ کر سکا......اسے رباعی کر دو، اسی وقت عرض کی!

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی
نہ سم کی نہ تال کی نہ سر کی
یہ تاریخ کہی ہے کسی لر کی
حویلی علی نقی خاں بہادر کی۱۲۹

اس واقعے کے سلسلے میں عابد پشاوری کی تحقیق ہے کہ یہ واقعہ ''طلسم ہند'' مصنفہ طوطا رام شایان سے ماخوذ ہے، جسے آزاد نے اپنے مخصوص رنگ میں پیش کیا ہے۔ عابد پشاوری نے شایان کی کتاب سے مذکورہ واقعہ بھی نقل کیا ہے اور اس کے بعد یہ لکھا ہے کہ ''آب حیات'' کا پہلا ایڈیشن ۱۸۸۰ء میں وکٹوریہ پریس لاہور سے شائع ہوا۔ ''طلسم ہند'' شوال ۱۲۹۱ھ مطابق نومبر ۱۸۷۴ء میں شائع ہو چکی تھی۔ آزاد کا ماخذ یقیناً یہی کتاب ہے لیکن آزاد نے واقعے کی نوعیت بالکل بدل دی ہے۔ آزاد نے اپنا لطیفہ یقیناً ان کی تاریخ سے اخذ کیا ہے جو آزاد کی کتاب ''آب حیات'' سے چھ برس پہلے شائع ہو چکی تھی۔''۱۳۰

اس طرح آزاد نے انشا کے احوال میں ایک اور واقعہ سعادت علی خاں اور جان بیلی کا بیان کیا ہے۔ (ص: ۲۷۸) گیان چند جین آزاد کے بیان کیے گئے اس واقعے کو آزاد کی ''افسوس ناک اختراع قرار دیتے ہیں۔۱۳۱ ابرار عبدالسلام لکھتے ہیں کہ ''سعادت علی خاں اور جان بیلی میں کبھی ایسا دوستانہ ربط ضبط نہیں رہا۔ ان کی صحبت میں یہ واقعہ پیش آ ہی نہیں سکتا۔ واقعات قتیل سے پتا چلتا ہے کہ ہجر اور ہجر کی بحث مرزا جعفر اور انشا میں ہوئی تھی، جس کے بیچ قتیل بھی کود پڑے تھے اور جس میں فتح انشا کے حصے میں آئی تھی۔''۱۳۲

مصحفی کی مشاقی اور پر گوئی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی غزل فروشی کے بارے میں آزاد لکھتے ہیں:

> ''عین مشاعرہ کے دن لوگ آتے ۸/ سے عہ/ تک اور جہاں تک کسی کا شوق مدد کرتا وہ دیتا۔ اس میں سے ۹، ۱۱، ۲۱ شعر کی غزل نکال کر حوالہ کر دیتے ان کے نام کا مقطع کر دیتے۔ اور اصل سبب کمزوری کا یہ تھا کہ بڑھاپے میں شادی بھی کی تھی۔ سب سے پہلے تو ایک سالا تھا وہ شعر چن کر لے جاتا۔ پھر سب کو دے لے کر جو کچھ بچتا وہ خود لیتے۔''۱۳۳

آزاد کے مذکورہ بیان میں کئی غلطیاں ہیں۔ بقول اسلم فرخی ''اوّل تو اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ مصحفی نے بڑھاپے میں شادی کی تھی۔ پھر یہ کہ سالا کہاں سے پیدا ہو گیا۔ دوسرے مصحفی اتنے کم عقل نہ تھے کہ پھس پھسے اشعار مشاعرے میں پڑھ کر اپنی ہنسی اڑواتے۔ جو شخص میر و مرزا سے ہم سری کا دعویٰ رکھتا ہو اس کے لیے مشاعرے میں پست و پوچ اشعار پڑھنا انتہائی ذلت کی بات ہے۔۱۳۴ افسر صدیقی کا خیال ہے کہ ''آزاد نے شعرائے دہلی کے مقابلے میں اہلِ لکھنؤ کی تذلیل کی ہے اور مصحفی کی

غزل فروشی کے اتہام والزام کے پردے میں وہاں کے بہت سے شعرا کو شعر گوئی کی قوت سے معرّیٰ اور مصحفی سے غزل خرید کر شاعر بننے کی کوشش کرنے والا ظاہر کیا ہے۔''۱۳۵؎

ایسا لگتا ہے کہ آزاد مصحفی کو ذاتی طور پسند نہیں کرتے تھے۔اس لیے جگہ جگہ ان کے امروہہ کے ہونے پر طنز کرتے ہیں۔ان کے کلام کو بہت پست دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔شاید انہیں کوششوں میں سے ایک کوشش یہ بھی ہو۔عابد پشاوری کے خیال میں مصحفی کو اپنے کلام کو بیچ کر گزارہ کرنے والی بات بھی مشکوک ہے۔''۱۳۶؎

دور پنجم آب حیات کا آخری دور ہے۔اس دور کی ابتدا ناسخ سے ہوتی ہے۔طبع ثانی کے لیے آزاد نے ناسخ کے حالات از سر نو مرتب کیے تھے،اور وہ تمام باتیں جو انہیں ناسخ کے سلسلے میں طبع اوّل کے بعد حاصل ہوئی تھیں اس میں شامل کر دی تھیں۔طبع اوّل میں ناسخ کی تاریخ گوئی کے سلسلے میں آزاد نے محض یہ لکھا تھا کہ ''چور نے ان کے گھر میں نقب لگائی اس کی بھی تاریخ کہی۔''(محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف،اسلم فرخی،ص:۲۱۶)لیکن طبع ثانی میں آزاد نے ایک پورے واقعے کا اضافہ کیا ہے جسے بعض محققین نہیں مانتے۔آزاد کا بیان یہ ہے:

> ''۱۸۳۱ء میں معتمد الدولہ آغا میر نے جو سوا لاکھ روپیہ قصیدے کا صلہ دیا تھا،انہوں نے مرزائی صاحب کے حوالے کر دیا تھا۔لوگوں نے جانا کہ ان کے گھر ہی میں ہے۔چور نے رات میں نقب لگائی اور ناکام گیا۔''۱۳۷؎

ابرار عبدالسلام آزاد کے اس بیان کردہ واقعے کا ماخذ رغمی کے خط کو قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:''رغمی کے خط سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ صلہ میں آغا میر نے سوا لاکھ روپیہ انعام دیا،یہ آزاد کی اپنی اختراع ہے۔''(۱۳۸)لیکن مسعود حسن رضوی ادیب کا خیال ہے کہ''قصیدے میں وزیر کی مدح کے ساتھ ساتھ بادشاہ کی مدح کا بھی التزام کیا گیا تھا۔آغا میر نے جو اس قصیدے کا اتنا گراں قدر صلہ دیا تو اس میں استاذ نوازی کے جذبے کے علاوہ بادشاہ کی مدح کا احترام اور اس کی نظر میں سرخ روئی حاصل کرنے کا مقصد بھی مد نظر ہوگا۔''۱۳۹؎ بقول قاضی عبدالودود''آغا میر شاعر ہی نہ تھے تو شاگردی کا سوال کہاں سے

آ گیا۔ دوسری بات یہ کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ سوا لاکھ روپے انعام ملے۔ قصیدے پر اتنی بڑی رقم کا ملنا بھی خلاف قیاس ہے۔ اس انعام کے سلسلے میں آزاد کے بیان کے علاوہ کوئی اور ثبوت نہیں ملتا۔" ۱۴۰؎ قاضی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ مرزائی صاحب کے یہاں روپے رکھوانا بھی کہیں سے ثابت نہیں۔ آزاد کے آگے آتش و ناسخ کے مطلع "چشم یار میں"، "مردم بیمار میں" نقل کر کے لکھتے ہیں کہ یہاں ردیف 'میں' بے معنی ہے، 'پر' ہو تو ٹھیک ہو۔ (آب حیات، ص: ۳۵۴) رشید حسن خاں کے مطابق قاضی عبدالودود نے "تذکرہ شعرا مصنفہ ابن امین اللہ طوفان" کے حواشی میں لکھا ہے کہ آزاد نے جو ردیف 'میں' پر اعتراض کیا ہے، آتش و ناسخ کے مطبوعہ کلیاتوں میں ان غزلوں میں ردیف 'کو' ہے۔ دونوں استادوں کے دیوان "آب حیات" کی تصنیف سے بہت پہلے چھپ چکے تھے اور چار دانگ ہند میں رائج تھے۔ دیوان کی طرف رجوع کیے بغیر اعتراض جڑ دینا نہایت غیر ذمہ دارانہ روش ہے۔" ۱۴۱؎ آزاد پر اعتراض کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ "انہوں نے "آب حیات" کے پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں ردیف 'میں' لکھی تھی۔ لیکن تیسرے ایڈیشن میں اسے تبدیل کر کے 'کو' کر دیا۔ بعد کے ایڈیشن چوں کہ زیادہ تر طبع دوم کو سامنے رکھ کر لکھے جاتے رہے اس لیے اس میں یہ غلطی موجود رہی۔" ۱۴۲؎ بہر حال آزاد نے ناسخ کے حالات بہت تفصیل سے لکھے ہیں۔ ان میں سے بعض مصدقہ نہیں ہیں۔ بعض میں بے احتیاطی کی وجہ سے چند غلطیاں بھی در آئی ہیں۔ اس کے باوجود یہ حالات بسا غنیمت ہیں۔ کلام ناسخ کی تنقید بالخصوص ان کی زبان کا جائزہ بے شبہ قابل قدر ہے۔

آزاد آتش کا یہ شعر نقل کرتے ہیں:

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک
نہ ایک مو کم ہوا اپنا نہ ایک تار کفن بگڑا

لگے منھ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجیے دہن بگڑا

پھر آگے آزاد ان اشعار کے سلسلے میں یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ "نشہ کے سرور میں آ کر (آتش نے مصحفی سے) کہا کہ استاد اس ردیف قافیہ میں کوئی یہ شعر نکالے تو کلیجہ نکل پڑتا ہے۔ جواباً مصحفی نے ایک

نومشق لڑکے کی غزل جو توجہ سے بنایا اور اس میں انہیں دو قافیوں کو اس طرح باندھا:

لکھا ہے خاکِ کوئے یار سے اے دیدۂ گریاں
قیامت میں کروں گا گر کوئی حرف کفن بگڑا
نہ ہو محسوس جو شے کس طرح نقشہ میں ٹھیک اترے
شبیہہ یار کھنچوائی کمر بگڑی دہن بگڑا (۱۴۳)

ابواللیث صدیقی اس واقعے کو قبول نہیں کرتے۔ان کا خیال ہے کہ ''آتش جیسا فقیر منش اور منکسر المزاج شخص کسی مشاعرے میں ایک غزل پڑھے اور نشے کے سرور میں آکر استاد سے ایسی بات کہے، اور پھر استاد بھی مصحفی کے پایہ کا ہو کر شاگرد کو ذلیل کرنے کے لیے نومشق کو غزل کہہ کر دے، اور غزل بھی ایسی جو بادالنظر میں آتش کے مقابلے کمزور درجہ کی ہو۔ہمیں ماننے میں تامل ہے۔''۱۴۴ قاضی عبدالودود بھی اس واقعے کا انکار کرتے ہیں۔ان کی تحقیق کے مطابق 'کفن بگڑا'، 'دہن بگڑا' کی زمین میں مصحفی کی غزل دیوان ہفتم میں ہے، جس کا زمانہ تصنیف ۱۲۲۵ھ یا اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔اس زمانے میں آتش و مصحفی میں استادی، شاگردی کا تعلق باقی نہ تھا۔اس لیے حکایت جس طرح بیان ہوئی ہے صحیح نہیں ہوسکتی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دونوں میں جھگڑا ضرور تھا۔ناصر نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔لیکن اس کی تفصیل پیش نہیں کی۔''(۱۴۵) آتش کے بارے میں ایک اور واقعہ آزاد میر انیس کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ''آتش نے اپنے کسی شاگرد سے کہا کہ بھئی ہمیں نماز تو سکھا دو۔وہ اتفاقاً سنی تھا۔اس نے ویسی ہی نماز سکھا دی۔......''(آب حیات، ص:۳۸۳) اس واقعے کو گیان چند جین صحیح نہیں مانتے۔وہ لکھتے ہیں کہ ''یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ ایک مسلمان کو اتنی عمر تک نماز پڑھنی نہ آتی تھی۔یا ایک پختہ عمر کے شیعہ کو شیعوں اور سنیوں کے طریقے کا فرق معلوم نہ تھا۔''۱۴۶ گیان چند جین کا اعتراض بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔قطع نظر اس سے کہ آزاد نے آتش کی تصویر بڑی محنت اور سلیقے سے تیار کی ہے، اور ان کی شاعری پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔اس طرح آزاد نے دبستان لکھنؤ کے ایک عظیم شاعر کو ہم سے قریب کر دیا ہے۔

دور پنجم کے باکمال شاعروں میں ایک شاعر مومن خاں مومن ہیں۔'آب حیات' کے طبع اوّل میں

مومنؔ کا ذکر نہ تھا۔اس عدم شمولیت کے متعلق مذہبی عصبیت کے علاوہ بھی کچھ کہا گیا ہے۔مثلاً مومنؔ کے سوانح نگار عرشی گیاوی عدم شمولیت کا سبب آزاد کی حد سے بڑھی ہوئی ذوق پرستی قرار دیتے ہیں۔'' ۱۴۷؎ گیان چند جین لکھتے ہیں کہ ''مومنؔ کے انتقال کے وقت آزاد کی عمر ۲۳ برس کی تھی۔انہوں نے مومنؔ کو مشاعروں میں پڑھتے ہوئے سنا تھا۔حالات لکھنا چاہتے تو لکھ سکتے تھے۔نہ لکھنے کی شاید ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ذوقؔ کے ہم عصروں کو کم کرنا چاہتے تھے۔'' ۱۴۸؎ بہر حال آزاد نے مومنؔ پر پہلے ایڈیشن میں بھلے ہی کچھ نہ لکھا ہو لیکن دوسرے ایڈیشن میں جس قدر انہوں نے لکھا ہے اور ان کی شخصیت کی جیسی قلمی تصویر کھینچی ہے وہ بھی ہمارے لیے کم اہمیت کی حامل نہیں۔

پانچویں دور کے صدر نشیں 'ملک الشعرا' خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق ہیں۔بقول گیان چند جین ''ذوقؔ کے حالات طبع اوّل میں اتنے مفصل نہ تھے۔طبع دوم میں آزاد نے کئی نئی حکایتیں شامل کر دیں۔تیسری بار انہیں حالات کو اپنے مرتبہ دیوانِ ذوقؔ کے مقدمہ میں لکھا ہے۔'' ۱۴۹؎ بہر حال 'آب حیات' میں ذوقؔ کے تذکرے کا آغاز آزاد ان جملوں سے کرتے ہیں:

> ''جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔جن کی خوشبو شہرت عام بن کر جہاں میں پھیلی......وہ تاج سر پر رکھا گیا تو ''آب حیات'' اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ملک الشعرا کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا۔'' ۱۵۰؎

ذوقؔ کے بارے میں آزاد کے اس مبالغہ آمیز اور تعارفی جملے کو اسلم فرخی حد سے بڑھی ہوئی ذوق پرستی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آزاد کے یہ تعارفی جملے ذوقؔ کے مرتبے کو بلند کرنے کے بجائے انہیں ایک عجیب مضحکہ خیز انداز میں ہمارے سامنے لاتے ہیں۔فردوسیؔ، سعدیؔ، حافظؔ، میرؔ اور غالبؔ تو اس تعارف کے مستحق ہو سکتے

ہیں، ذوقؔ اس بار گراں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔شبلی نے سرور کائنات
کی مرقع کشی کے لیے سیرت النبی میں اس اسلوب کو اختیار کیا ہے اور
وہاں یہ زیب دیتا ہے۔ذوقؔ کے لیے نہیں۔''۱۵۱؎

آگے ذوقؔ کے حالات میں شاہ نصیرؔ اور ذوقؔ کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔ملاحظہ فرمائیں:

''ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سنائی۔شیخ مرحوم (ذوقؔ) نے
پوچھا یہ غزل کب کہی۔خوب گرم شعر نکالے ہیں۔انہوں نے کہا کہ ہم
تو شاہ نصیرؔ کے شاگرد ہو گئے ہیں۔انہیں سے یہ اصلاح لی ہے۔شیخ
مرحوم کو بھی شوق ہوا اور وہ بھی شاہ نصیرؔ کے شاگرد ہو گئے......بعض
موقع پر ایسا ہوا کہ شاہ صاحب نے ذوقؔ کی غزل کو دیکھ کر بے اصلاح
پھیر دیا اور کہا طبیعت پر زور ڈال کر کہو چنانچہ اس طرح کئی دفع غزلیں
پھیر دیں۔بہت شعر کٹ گئے۔زیادہ تر قباحت یہ ہوئی کہ شاہ صاحب
کے صاحب زادے شاہ وجیہ الدین منیر تھے۔ان کی غزلوں میں توارد
سے یا خدا جانے کس اتفاق سے وہی مضمون پائے گئے۔اس لیے انہیں
زیادہ رنج ہوا۔''۱۵۲؎

آزاد کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ نصیرؔ ذوقؔ کے مضامین چرا کر اپنے بیٹے کی غزل مرتب کر دیتے تھے۔ذوقؔ اپنے استاد کی اس ناروا اور مذموم حرکت سے بہت آزردہ ہوئے اور یہی بگاڑ کی وجہ بنی۔لیکن ایسا ہر گز نہیں۔بقول اسلم فرخی ''شاہ نصیرؔ ایک اچھے استاد کی طرح اپنے شاگرد سے محنت کرانا چاہتے تھے۔اسی وجہ سے غزلیں واپس کر دیتے تھے۔جہاں تک مضامین کی چوری کا مسئلہ ہے تو یہ محض ایک افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔''۱۵۳؎

ذوقؔ کے قصیدے کا ذکر کرتے ہوئے آزاد ان کے ایک قصیدے کی خوبی یہ بیان کرتے ہیں:

''اس کے مختلف شعروں میں انواع واقسام کے صنائع بدائع صرف
کیے تھے۔ایک ایک زبان میں جو ایک ایک شعر تھا،ان کی تعداد

(۱۸) تھی۔ اس پر اکبر بادشاہ نے خاقانی ہند کا خطاب عطا کیا۔ اس
وقت شیخ مرحوم کی عمر انیس برس کی تھی۔"۱۵۴

اس بیان میں کئی باتیں قابل غور ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ کیا ذوق واقعی اٹھارہ زبانیں جانتے تھے۔ اس سلسلے میں محمود شیرانی لکھتے ہیں کہ "یہ دعویٰ اسی قسم کی تعلّی ہے جو انگریز کیا کرتے تھے کہ میں ہندوستان کی پندرہ زبانیں جانتا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں بیس جانتا ہوں اور پھر وہ ان زبانوں کا ایک ایک جملہ طوطے کی طرح رٹ لیتا ہے اور اسی پر اس کی زبان دانی ختم ہو جاتی ہے۔" اگر شیرانی صاحب کی باتوں پر غور کیا جائے تو اس کا سیدھا سا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ذوق اٹھارہ زبانیں نہیں جانتے تھے، اور اس میں سوائے مبالغہ کے کوئی اور بات نہیں۔ جہاں تک انیس برس کی عمر میں خاقانی ہند کا تعلق ہے تو شیرانی صاحب کا اس پر یہ اعتراض ہے کہ "استاد ذوق بقول آزاد ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے۔ انیس سال کی عمر یعنی ۱۲۲۳ھ میں خاقانی ہند بنا دیئے گئے۔ یہ بات یقیناً حیرت انگیز ہے۔ مجھ کو شبہہ ہے کہ اس موقع پر مولانا کو سہو ہوا ہے۔"۱۵۵ اس سلسلے میں عابد پشاوری نے بھی اپنے مضمون "ذوق کی حکایات" میں مدلل بحث کی ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "اگر یہ مان بھی لیں کہ ذوق نے کوئی ایسا قصیدہ کہا تھا جس میں سترہ زبانیں تھیں تو اب قصیدہ موجود نہیں۔ (بلکہ ماضی میں بھی موجود نہیں تھا) دوسرے یہ کہ قصیدہ دربار میں پڑھا نہیں گیا۔ یہ بھی طے ہے کہ اس قصیدے پر خاقانی ہند کا خطاب نہیں ملا۔" آگے پشاوری صاحب نے یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ "ذوق کو خاقانی ہند کا خطاب نہ اکبر شاہ ثانی نے دیا اور نہ بہادر شاہ ظفر نے۔ ظفر نے ایک خطاب دیا تھا اور وہ 'سلطان الشعرا' کا خطاب تھا۔ خاقانی ہند خطاب انہیں عوام کی طرف سے دیا گیا۔"۱۵۶

ذوق اور ظفر کے سلسلے میں آزاد نے متعدد حکایتیں لکھی ہیں اور جا بجا ظفر کے اشعار کو ذوق کی ملکیت بتایا ہے۔ حالاں کہ ظفر کے شاعر ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔ ان کی شاعری سے متعلق متعدد مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی، نیاز فتح پوری اور شان الحق حقی نے ظفر کی شاعرانہ خصوصیات کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ کوئی انصاف پسند ان مضامین کی روشنی میں ظفر کے انفرادی رنگ سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح آزاد کی بعض باتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ذوق ظفر سے

اپنے اشعار چھپایا کرتے تھے اور ظفؔر بھی اس کوشش میں رہتے تھے کہ ذوقؔ اپنی کسی چیز پر زورِ طبع نہ خرچ کریں، بلکہ سارا زورِ شاگردی کی منزلوں پر نذر کر دیں۔ ایسی ان تمام حکایتوں اور بیانات کے متعلق اعتماد ویقین کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ بقول اسلم فرخی ''آزاد کو محض اس بنا پر رد کر دینا کہ آزاد غیر محتاط راوی ہیں، انصاف کے خلاف ہے۔ اسی طرح آزاد پر یہ الزام عائد کرنا کہ انہوں نے ظفر کو بدنام کیا اور وہ اقلیم سخن جس کے ظفؔر بلا شرکت ذوقؔ مالک تھے اپنے استاد کے حوالے کر دی کسی حد ٹھیک ہو سکتا۔ لیکن ذوقؔ کی اعانت و دل سوزی میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔''۱۵۷

غالبؔ کے تبدیلیٔ تخلص کے سلسلے میں آزاد لکھتے ہیں:

''نام اسد اللہ، پہلے اسد تخلص کرتے تھے۔ جھجھر میں کوئی فرومایہ سا شخص اسد تخلص کرتا تھا۔ ایک دن اس کا مطلع کسی نے پڑھا:

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب
ارے وہ شیر رحمت ہے خدا کی

سنتے ہی اس تخلص سے جی بیزار ہو گیا۔ چنانچہ ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۸ء میں اسد اللہ الغالب کی رعایت سے غالبؔ تخلص اختیار کیا۔ لیکن جن غزلوں میں اسد تخلص تھا انہیں اسی طرح رہنے دیا۔''۱۵۸

غالبؔ کے بارے میں محولہ بالا روایت علاء الدین احمد خاں علائی نے آزاد کے نام خط لکھ کر بھیجی تھی، آزاد نے اسی بیان کو 'آب حیات' میں شامل کیا ہے۔ قاضی عبد الودود اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''جھجھر کے اسد کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ وہاں غالبؔ تخلص کا ایک گمنام شاعر البتہ گزرا ہے۔ اسی طرح شعر کی صحیح شکل جو 'تذکرۂ ہندی' اور 'مجموعۂ نغز' کے علاوہ خود غالبؔ کے اردوئے معلیٰ میں موجود ہے۔ وہ یہ ہے۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

شاعر کا پورا نام میر امانی اسدؔ تھا۔ دہلی کے رہنے والے اور سوداؔ کے شاگرد تھے۔ ان کی وفات وولادت غالبؔ سے بہت پہلے ہوئی تھی، اور یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ اس شعر کا سننا تبدیلیٔ تخلص کا باعث ہوا تھا۔''۱۵۹

کالی داس گپتا رضا کے مطابق تبدیلیٔ تخلص کا سنہ بھی درست نہیں۔ غالبؔ نے ۱۲۳۱ھ میں دو مہر بنوائی تھی۔ پہلے پر اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ ۱۲۳۱ھ کندہ کرایا۔ دوسرے پر اسد اللہ الغالب ۱۲۳۱ھ بمطابق ۱۶-۱۸۱۵ء کے ہے۔ غالبؔ تخلص کا استعمال ۱۸۱۶ء میں باقاعدگی سے کرنے لگے تھے، لیکن اسد تخلص کو کلی طور پر ترک نہیں کیا تھا۔۱۶۰؎ تبدیلیٔ تخلص کے بارے میں آزاد نے جتنی باتیں نقل کی ہیں اس میں اسلم فرخی کے بقول ''غلطی آزاد کی نہیں علاء الدین احمد خاں کی ہے۔ انہوں نے آزاد کو تبدیلیٔ تخلص کا پورا واقعہ اور یہ شعر لکھ کر بھیجا تھا۔''۱۶۱؎

غالبؔ کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں کہ ''ساطع برہان کے اخیر میں چند ورق سید عبد اللہ کے نام سے ہیں۔ وہ بھی مرزا صاحب کے ہیں۔'' آگے لکھتے ہیں ''قاطع برہان کے کئی شخصوں نے جواب لکھے۔ چنانچہ میرٹھ میں حافظ عبد الرحیم نام کے ایک معلم نابینا تھے۔ انہوں نے اس کا جواب ساطع برہان لکھا۔ (آب حیات، ص: ۵۰۰) اس عبارت سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آزاد یہ جانتے تھے کہ ''ساطع برہان'' غالبؔ کی ''قاطع برہان'' کا جواب ہے۔ تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک مخالف کی کتاب میں غالبؔ کی تحریر اور وہ بھی دوسرے شخص کے نام سے ہو۔ بقول قاضی عبد الودود ''کسی کتاب میں جو قاطع کی مخالفت یا موافقت میں لکھی گئی تھی سید عبد اللہ کا نام تک نہیں آیا۔ قیاس مقتضی ہے کہ آزاد کی مراد ساطع نہیں 'دافع ہذیان' مصنفہ نجف علی خان سے ہو جو غالبؔ کی حمایت میں لکھی گئی تھی، اور چند ورق در اصل سوالات عبد الکریم ہوں۔ اس رسالے کے نسخ موجودہ میں مطبع کا نام اور سال انطباع نہیں۔ لیکن قرینہ ہے کہ یہ اسی وقت اور اسی مطبع میں چھپا تھا، جہاں دافع ہذیان طبع ہوئی تھی۔''۱۶۲؎ اسی طرح ''سبد چیں'' کے مشمولات کو آزاد نے دو تین قصیدے، چند قطعے اور خطوط تک محدود کیا ہے۔ لیکن قاضی صاحب کا خیال ہے کہ ''اس میں خطوط نہیں ہیں اور منظومات میں رباعیاں اور غزلیں بھی ہیں۔''۱۶۳؎

غالبؔ کے قیام کلکتہ کے دوران کا آزاد ایک واقعہ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''جب مثنوی حریفوں کے جلسے میں پڑھی گئی تو بجائے اس کہ کمال کو تسلیم کرتے، یا مہمان سے اپنی زیادتیوں کا ذکر کرتے، ایک عمداً کہا کہ اس مثنوی کا نام کیا ہے، معلوم ہوا کہ 'باد مخالف' دو نے گلستاں کا فقرہ پڑھا

''یکے ازصلحارا بادمخالف درشکم پیچید'' اورسب نے ہنس دیا۔'' ۱۶۴؎

قاضی عبدالودود اور کالی داس گپتا رضا اسے فرضی حکایت خیال کرتے ہیں۔قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ ''اس حکایت کی کوئی سند موجود نہیں۔اگرایسا واقعہ ہوا ہوتا تو غالبؔ مثنوی کا نام بدل دیتے۔(آزاد بحیثیت محقق،ص:۳۹) کالی داس گپتا رضا کا خیال ہے کہ ''جب یہ مثنوی لکھی گئی تھی تب اس کا نام ''بادمخالف'' نہ تھا، بلکہ ''آتشی نامہ'' اور ''وداد پیام'' (یعنی دوستی کا پیغام تھا) جیسا کہ آخری شعر سے ظاہر ہے۔

آتشی نامہ و داد پیام
ختم شد والسلام ولاکرام
(۱۶۵)

رضا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''بادمخالف'' کا عنوان دیوان کے ترتیب کے وقت دیا گیا۔بہر حال غالبؔ کے احوال میں کچھ خامیاں ہیں تو کچھ خوبیاں بھی ہیں۔آزاد نے غالبؔ کی خودداری، پریشان حالی، ان کی ظرافت طبع، گھریلو مسائل اور خوش مزاجی گویا ہر بات پر روشنی ڈالی ہے۔شاید ہی کوئی ایسی بات ہو جو آب حیات میں نظر نہ آتی ہو۔

مرزا دبیرؔ کے بارے میں آزاد کا یہ عجیب وغریب بیان ملاحظہ فرمائیں:

''مرزا دبیرؔ خاندانی شاعر نہ تھے۔پھر آزاد اسی صفحے کے حاشیہ پر یہ اطلاع دیتے ہیں کہ ''تذکرہ سراپا سخن'' میں لکھا ہے کہ ان کے والد مرزا آغا جان کاغذفروش تھے۔اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھا ہے کہ 'دبیرؔ ولد غلام حسین، متعلقان آغا جان کاغذفروش ہیں۔مصنف موصوف کو شوق ہے کہ ہر شخص کے باب میں کچھ نہ کچھ نکتہ ضرور نکال لیتے ہیں۔اس لیے (دبیرؔ کے) خاندان کے باب میں نہ یقین ہے نہ شک۔'' ۱۶۶؎

قاضی عبدالودود نے نشان دہی کہ ہے کہ 'سراپا سخن' کے طبع اوّل میں ص ۱۰۸، اور ص ۲۱۵ میں صرف دو جگہ دبیرؔ کے والد کا نام آیا ہے اور دونوں جگہ دبیرؔ کے والد کا نام غلام حسین مرقوم ہے' جہاں تک آزاد کے اس بیان کا تعلق ہے ''مصنف موصوف ہر شخص کے باب میں کچھ نہ کچھ طنز کا نکتہ نکال لیتے

ہیں۔'' تو یہ اتہام محض ہے۔ 'سراپا سخن' میں سینکڑوں شاعروں کا ذکر ہے، اور ممکن ہے کہ دو چار کے بارے میں طنز یہ بات کہی ہو، لیکن دو چار کو ہر شخص کس طرح کہہ سکتے ہیں۔''۱۶۷

افسر صدیقی خیال ہے کہ آزاد نے مراز دبیرؔ کے خاندان کو مشکوک قرار دینے کے لیے ''سراپا سخن'' کے مصنف پر یہ الزام تراشی کی ہے۔ دبیرؔ ایک عالی نسب اور علم و فضل میں نمایاں حیثیت رکھنے والے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، اور آزاد کا یہ بیان ''خاندان کے بارے میں نہ یقین ہے نہ شک'' معلوم نہیں وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ اگر یقین نہیں تو شک ہونا لازم ہے۔''۱۶۸

دبیرؔ کے سلسلے میں آزاد نے ایک حکایت ''آتش لطیفے'' کے عنوان سے لکھی ہے، جسے ''تنقید آب حیات'' مصنف میر محمد رضا غلط ٹھہراتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''بالکل جھوٹی حکایت ہے۔ آتشؔ نے ایک مجلس میں جہاں میں بھی تھا، دبیرؔ کا ایک بے نقط مرثیہ سن کر یہ البتہ کہا تھا کہ ''یہ صنعت اس بے تکلفی کے ساتھ آپ کا حصہ ہے۔''۱۶۹ میر محمد رضا کی بات کس حد تک صحیح ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کیوں کہ انھوں نے اپنی کتاب میں دبیرؔ کے سلسلے میں آزاد کے اکثر بیانات کو غلط ٹھہرایا ہے۔ اسلم فرخی کا میر محمد رضا کے بارے میں یہ خیال ہے کہ ''ان کے عینی شہادت ہونے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کا حد سے زیادہ جذباتی بیان اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ان کے بیان کو قبول کرنے میں احتیاط سے کام لینا چاہیے۔''۱۷۰

پانچویں دور کے آخری شاعر میر انیسؔ ہیں۔ آزاد نے ان کی شاعری پر تبصرہ کرنے سے پہلے لکھنؤ میں مرثیے کی مقبولیت کی وجہ بیان کی ہے۔ گویا انھوں نے میر انیسؔ کی شاعری کے معاشرتی محرکات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر میر انیسؔ کی پر گوئی کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> ''آمد مضامین کی انتہا نہ رہی۔ جن مرثیوں کے بند ۴۰، ۵۰ سے زیادہ
> نہ ہوتے تھے وہ ۱۵۰ سے گزر کر ۳۰۰ سے بھی نکل گئے۔ میر صاحب
> مرحوم نے کم سے کم دس ہزار مرثیہ ضرور کہا ہوگا، اور سلاموں کا شمار
> کیا۔ رباعیاں تو باتیں تھیں۔''۱۷۱

احسن لکھنوی آزاد کے اس بیان کو قبول نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ ''میر انیسؔ کو دس ہزار مرثیوں کا مصنف بتانا بالکل معجزہ یا کرامت کا ظاہر کرنا ہے۔''۱۷۲ قاضی عبدالودود نے بھی اس کی تردید

کی ہے، وہ لکھتے ہیں ''اگر انیسؔ کے بندوں کا اوسط (۱۰۰) فی مرثیہ رکھا جائے تو بندوں کی تعداد دس لاکھ اور ابیات کا شمار تیس لاکھ پہنچتا ہے۔ سلاموں اور رباعیوں کی کیا تعداد آزاد کے ذہن میں تھی اس کا علم خدا کو ہے۔۳۷ قاضی صاحب نے کئی مجموعے کے اشعار گنے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ کسی مجموعے میں ۵۲ ہزار سے زیادہ اشعار نہ تھے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ممکن ہو انیسؔ کا سارا کلام طبع نہ ہوا ہو۔ لیکن آزاد نے جو کچھ لکھا ہے وہ مبالغے کی انتہا ہے۔

میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کا تذکرہ ''آبِ حیات'' کی پہلی اشاعت میں شامل نہ تھا۔ طبع ثانی میں آزاد نے ان دونوں باکمال اشخاص کے حالات کا مختصراً اضافہ کیا ہے۔ اسلم فرخی کے بقول ''یہ ابتدا تھی۔ اس آغاز نے دوسروں کو نئے نئے راستے دکھائے۔ اس طرح آزاد اردو ادب کے مورخین کے لیے رہنما بن گئے، لیکن بعض شعرا کے حالات میں اختصار کو ملحوظ رکھنے کی وجہ سے نشانۂ ستم اعتراض بھی بنے۔''۴۷

آزاد کی تحقیق کے سلسلے میں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ان کے عہد میں اردو ادب کے تمام ماخذ دستیاب نہ تھے۔ معلومات کے ذرائع محدود تھے۔ تذکروں اور زبانی روایتوں کے علاوہ مواد کی فراہمی کے سلسلے میں جو کوشش ہو سکتی تھی انہوں نے کی۔ دوستوں کو خطوط لکھے۔ ان سے معلومات حاصل کیں۔ جس جگہ سے کوئی بات معلوم ہونے کی توقع تھی وہاں تک گئے۔ بہت سے لوگوں نے ان کی مدد کی، اس کے برعکس بعض نے ان کے خطوط کا جواب دینا بھی گوارا نہ کیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود آزاد کے ذوق وشوق کا اندزہ بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کہ ''آبِ حیات'' میں بہت سی خامیاں ہیں اور محققین نے ان خامیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ لیکن اس سے ''آبِ حیات'' کی اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ بقول مولانا سید عبدالحیؒ ''اس کتاب کی مقبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ جو غلط اور نادرست روایتیں مصنف کے جادو نگار قلم نے لکھ دی ہیں وہ آج اردو کی انشا پردازی کے قالب میں روح کی طرح زبانوں پر چڑھ گئی ہیں۔ جس طرح اقلیدس کے اصول موضوعہ بے چوں چرا مانے جاتے ہیں اسی طرح ان کو بے تکلف کام میں لایا جاتا ہے۔''۵۷

(ب) گل رعنا

مولانا سید حکیم عبدالحئی (۱۸۶۹ء-۱۹۲۳ء) کا نام ہندوستان کی اسلامی تاریخ رقم کرنے والوں میں سب سے زیادہ روشن ہے۔'نزہتہ الخواطر'، 'الثقافتہ الامیہ فی الہند' اور 'الہند فی العہد الاسلامی' لکھ کر انہوں نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ محفوظ کر دی ہے۔ وہ ایک بلند پایہ مورخ و ادیب کے ساتھ ساتھ ایک باذوق محدث بھی تھے۔ عربی زبان سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ابتدا سے تاریخی و تصنیفی سرگرمیوں کے لیے عربی زبان کا انتخاب کیا تھا اور یہی زبان ان کی محنت کا اصل میدان اور ان کی علمی و دینی صلاحیتوں کا اصل مرکز رہی ہے۔ اردو میں حکیم صاحب نے جو کتابیں (رسائل میں متفرق مضامین کے علاوہ) لکھی ہیں ان میں دو کتابیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک ''یادِ ایام'' جو ان کے دوست حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی فرمائش پر لکھی گئی اور دوسرے ''گلِ رعنا'' اور یہاں اسی کتاب پر گفتگو مقصود ہے۔ سب سے پہلے اس کے سبب تالیف پر نظر ڈالتے ہیں جو کہ مولف نے خود بیان کی ہے۔ دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے اپنے بچپن میں جن بزرگوں اور عزیزوں کو دیکھا ان میں سے ہر ایک۔ ایک ایک بیاض کا مالک تھا، میں نے ان ہی بزرگوں کے دامن میں تربیت پائی تھی چنانچہ میرے پاس بھی ایک بیاض تھی، جو کسی زمانے میں ہمیشہ میرے پیش نظر رہتی تھی (رفتہ رفتہ) اس میں مشہور شعرا کا کلام اتنا جمع ہو گیا کہ اس کو ترتیب دے کر شائع کر دیا جائے تو پڑھنے والوں کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ جن کا کلام ہو ان کے مختصر حالات بھی دیے جائیں، تذکرہ جمع کیے اور کام شروع کیا۔ بات میں بات نکلتی آئی اور وہ ایک خاص کتاب بن گئی، جس کا نام میں نے ''گل رعنا'' رکھ دیا۔''[۶۷]

''گل رعنا'' پہلی مرتبہ کب منظر عام پر آئی؟ اس سلسلے میں کتاب کے سرورق پر کوئی صراحت موجود نہیں ہے۔ میرے پیش نظر ۲۰۱۴ء کا شائع شدہ ایڈیشن ہے۔ اس کے دیباچہ پر ۶/ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ

درج ہے۔ کتاب کی پہلی اشاعت کے سلسلے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا خیال ہے کہ ''غالباً یہ کتاب پہلی مرتبہ جمادی الاوّل ۱۳۴۳ھ (۱۹۲۵ء) میں دارالمصنفین سے شائع ہوئی۔''۷۷؎ مولانا کے اس خیال کی تائید گیان چند جین کے قول سے بھی ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''طبع اوّل پر سنہ اشاعت ۱۳۴۳ھ ہی درج ہے۔'' (اردو کی ادبی تاریخیں، ص: ۱۰۳) کتاب میں جن چیزوں کا ذکر ہے۔ مولف نے سرورق پر اس کی صراحت یوں بیان کی ہے:

> ''تذکرہ شعرائے اردو موسوم بہ 'گل رعنا' یعنی اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بہ عہد کے باکمالوں اور اردو شعرا کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار اور ان کے ہر قسم کے کلام کے نمونے۔'' (سرورق، گل رعنا)

گیان چند جین کے بقول ''حکیم صاحب نے دیانت داری اور صحت سے اپنے موضوع تحریر کی صراحت کر دی ہے۔ یہ بازگشت ہے ''آب حیات'' کے سرورق کی جس پر لکھا ہے ''آب حیات یعنی مشاہیر شعرائے اردو کے سوانح عمری اور زبان مذکور کی عہد بہ عہد کی ترقیوں اور اصلاحوں کا بیان۔''۷۸؎ یوں تو حکیم صاحب نے دیباچے میں کتاب کی جو وجہ تالیف بیان کی ہے اس میں کہیں ''آب حیات'' کا ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن حکیم صاحب کے فرزند ارجمند اور ان کے سچے جانشین مولانا سید ابوالحسن ندوی نے اپنی کتاب ''حیات عبدالحیؒ'' میں گل رعنا کی تصنیف کی جو وجہ بیان کی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ''گل رعنا'' کے تالیف کی ایک وجہ مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' بھی تھی۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیں:

> ''کوئی موضوع کسی بڑے سے بڑے مصنف پر ختم اور اس کے لیے وقف نہیں ہوتا۔ آب حیات بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ وہ اپنی غیر معمولی مقبولیت اور اپنی اعلیٰ قسم کی انشا پردازی، دقیق نکتہ سنجی، بلکہ ذوق آفرینی اور ادب آموزی کے ساتھ ہر انسانی کام کی طرح نقائص سے یکسر مبرا اور غلطیوں اور فروگذاشتوں سے کلیتہً خالی نہیں

> آب حیات کے اسی تشنہ گوشوں کو جو ایک نئی تصنیف کے متقاضی تھے ایک ایسی تصنیف کی ضرورت تھی جو اس کمی کو پورا کرے، اور ہمارے علم میں گل رعنا ایسی کتاب ہے جس میں سب سے پہلے اس فرض کو انجام دینے کی کوشش کی گئی۔''۹۷؎

اس طرح اگر ''گل رعنا'' کے اندراجات پر نظر ڈالی جائے تو وہاں بھی ''آب حیات'' کی تقلید نظر آئے گی۔ مثلاً ابتدا میں محمد حسین آزاد نے اپنے مقدمے میں اردو زبان اور اردو شاعری کی تاریخ بیان کی ہے۔ حکیم صاحب نے بھی مقدمے کے چند صفحوں میں اردو نثر کی تاریخ کے اضافوں کے ساتھ اردو زبان اور اردو شاعری کی تاریخ بیان کی ہے۔ نثری تاریخ کے اضافے پر گیان چند جین کا یہ اعتراض ہے کہ ''اردو شاعری کی تاریخ میں اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔'' (اردو کی ادبی تاریخیں، ص: ۱۰۴) بہر حال مقدمہ کے بعد کتاب کو تین طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ طبقۂ متقدمین، طبقۂ متوسطین، طبقۂ متاخرین، اور ہر طبقے میں تین دور قائم کیے گئے ہیں۔

طبقۂ متقدمین کے پہلے دور میں بقول مولف ''ان شاعروں کا ذکر ہے جن کی نشو ونما حیدر آباد اور بیجا پور میں ہوئی ہے۔'' اس میں قلی قطبؔ شاہ، نصرتیؔ، ہاشمی بیجا پوری، ابوالحسن تانا شاہ اور ان کے معاصرین وغیرہ کا شامل ہیں۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ سوائے نصرتیؔ کے اس دور کے تمام شاعروں کو مولف نے مقدمہ میں جگہ دی ہے۔ طبقۂ متقدمین کے دوسرے دور میں ولیؔ اور ان کے معاصرین کا ذکر ہے۔

طبقۂ متقدمین کے تیسرے دور میں شیخ مبارک آبروؔ، شاکر ناجیؔ، مضمونؔ، محمد حسین کلیمؔ، حاتمؔ اور شرف الدین علی خاں فغاںؔ وغیرہ شامل ہیں۔

طبقۂ متوسطین کا پہلا دور مرزا مظہر جان جاناں سے شروع ہو کر ضیاء الدین ضیاؔ پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور میں میرؔ، سوداؔ، دردؔ اور میر سوزؔ جیسے باکمال شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ طبقۂ متوسطین کے دوسرے دور میں میر اثرؔ، بقا، جعفر علی حسرتؔ، انشاء اللہ خاں انشاؔ اور ان کے معاصرین کا ذکر کیا گیا ہے۔

طبقۂ متوسطین کا تیسرا دور دبستان دہلی کے شعرا پر مشتمل ہے۔ جس میں شاہ نصیرؔ، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ اور شیفتہؔ وغیرہ شامل ہیں۔ طبقۂ متاخرین کا پہلا دور شیخ امام بخش ناسخؔ اور خواجہ حیدر علی آتشؔ کے

ساتھ ساتھ ان دونوں اساتذہ کے شاگردوں پر مشتمل ہے۔

طبقۂ متاخرین کے دوسرے دور میں منشی امیرؔ احمد مینائی، نواب مرزا داغؔ، میر مہدی مجروحؔ، ضامن علی جلالؔ اور امیر اللہ تسلیم وغیرہ شامل ہیں۔

طبقۂ متاخرین کا آخری دور جسے مولف نے (جدید شاعری کے آغاز) کا نام دیا ہے، اس دور میں شامل ہونے والے شعرائے کرام میں محمد حسین آزادؔ، حالیؔ، اسماعیلؔ میرٹھی اور اکبرؔ الہ آبادی شامل ہیں۔

کتاب کے آخر میں دو ضمیمے شامل ہیں۔ پہلے میں مراثی کا بیان ہے اور ساتھ ہی میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ دوسرے میں مولف نے اپنے والد کے حالات اور ان کے کلام کے نمونے پیش کیے ہیں۔

ان ادوار میں زمانی اعتبار سے کچھ خامیاں ہیں۔ ان خامیوں کی طرف گیان چند جین نے توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں ''میرؔ کے بہنوئی محمد حسین کلیمؔ کو متقدمین میں جگہ دی گئی ہے جب کہ مظہر جان جاناں کو متوسطین کے دور اوّل میں۔ ظاہر ہے کہ مظہر کو حاتمؔ و آبروؔ و فغاںؔ وغیرہ کے ساتھ متقدمین میں رکھنا چاہیے تھا۔ میر اثرؔ کو متوسطین کے دوسرے دور میں رکھا ہے حالاں کہ ان کا صحیح مقام متوسطین کے دور اوّل میں سوداؔ، میرؔ، دردؔ اور سوزؔ وغیرہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ کو متوسطین کے تیسرے دور میں رکھا ہے، لیکن ناسخؔ و آتشؔ کو متاخرین کے دور اوّل میں جگہ دی ہے۔ حالاں کہ یہ سو فیصدی غالبؔ و ذوقؔ کے معاصرین ہیں۔ مرثیہ نگار دبیرؔ و انیسؔ کو کتاب کے آخر میں یعنی حالیؔ، اسماعیلؔ میرٹھی اور اکبرؔ الہ آبادی کے بعد جگہ دی ہے۔ کیا حکیم صاحب اردو شاعری کو غزل ہی کے مترادف مانتے ہیں۔ مرثیے کو محض نواحی حیثیت دیتے ہیں۔'' گیان چند جین ایک اصول بیان کرتے ہیں کہ ''تذکرے اور تاریخ کے بیچ ما بہ الامتیاز یہ ہوتا ہے کہ تذکرے میں شعرا کو الف بائی ترتیب سے اور تاریخ ادب میں تاریخی ترتیب سے درج کیا جاتا ہے۔'' پھر ''گل رعنا'' کے بارے میں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ 'صاحب گل رعنا نے آب حیات کی تقلید میں شعرا کو تاریخی ترتیب سے رکھا ہے اور ان کے ادوار قائم کیے ہیں۔''[۱۸۰]

بہر حال میرؔ کے 'نکات الشعرا' سے لے کر محمد حسین آزاد کی 'آب حیات' تک جتنے تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں سے اکثر تذکرے ایسے ہیں جن میں اس سے قبل لکھے تذکرے کی تقلید نظر آتی ہے، اور ہر تذکرہ نگار کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان سے قبل لکھے گئے تذکرے میں جو خامیاں اور کمیاں رہ گئی ہیں انہیں

دور کریں۔ مولف ’گل رعنا‘ نے بھی ’آب حیات‘ کی تقلید کی اور اس کی تاریخی فروگذاشتوں اور کمیوں کو اپنی کتاب سے پورا کرنے اور دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ’’آب حیات‘‘ میں جن مشہور شعرا کو نظر انداز کر دیا گیا تھا یا کسی اور وجہ سے انہیں شامل نہیں کیا گیا تھا مولف نے اپنے تذکرے میں جگہ دی ہے، ان کے حالات لکھے ہیں اور ان کی شاعری پر نقد و تبصرہ بھی کیا ہے۔ مثال کے طور پر طبقۂ متقدمین میں مولف نے نصرتیؔ، فقیر اللہ آزادؔ، سراج الدین سراجؔ، مرزا داؤدؔ، عزلتؔ، عاجزؔ اور محمد حسین کلیم وغیرہ کو شامل کیا ہے۔ ان شعرا کے ذکر سے آب حیات خالی ہے۔ اسی طرح دور متوسطین اور متاخرین میں انعا اللہ خاں یقینؔ، میر محمد باقر حزیںؔ، محمد بیدارؔ، میر قدرت اللہ قدرتؔ، میر ضیاء الدین ضیاؔ، حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ، میر نظام الدین ممنونؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، شیفتہؔ، کرامت علی شبیدی اور رشکؔ وغیرہ جیسے ممتاز شعرا کا ذکر ’’آب حیات‘‘ میں نہیں کیا گیا ہے۔ شیخ بقاء اللہ بقاؔ اور قیام الدین قائمؔ کا تذکرہ آب حیات میں حاشیے میں درج ہے، لیکن مولف ’گل رعنا‘ نے ان پر بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ اسی طرح منشی امیر احمد مینائی، مرزا داغؔ، میر مہدی مجروحؔ، قربان علی سالکؔ اور حکیم ضامن علی جلالؔ ’’آب حیات‘‘ میں نظر نہیں آتے، جن کی شاعری سے نہ صرف لکھنؤ بلکہ رام پور، حیدرآباد اور خود دہلی کی مجلسیں معمور و مخمور تھیں۔ بقول علی میاں ندوی ’’اس موقع پر یہ عذر نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی شاعری کے شہباز نے آزاد کی وفات کے بعد بال و پر نکالے اور انھوں نے ارتقا کی منازل طے کیں۔ اس لیے کہ یہ وہ شعرا ہیں جو شاعری کی دنیا میں نام پیدا کر کے آزاد کی وفات سے کئی سال پہلے اس دنیا سے سفر اختیار کر چکے تھے، اور آزاد جیسا اردو ادب و شاعری کا قدرداں اور مبصر ان سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔‘‘ [۱۸۱]

اسی طرح ’’آب حیات‘‘ میں متعدد تاریخی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں اور بعض بیانات ایسے ہیں جن کی تصدیق ان کتابوں سے ہوتی ہے جن کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ آزاد نے ان کے بارے میں سنی سنائی روایات پر یا اپنے حافظے پر اعتماد کیا اور کتاب کی تصنیف کے وقت اصل ماخذ کی طرف رجوع کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ یا اگر کی بھی تو کتاب کے کسی شوشہ اور نقطہ کو اپنے گہر بار قلم اور قوت متخیلہ سے اس قدر بڑھا چڑھا کر بیان کیا کہ اس کی اصل حقیقت جاتی رہی۔ یہی وجہ ہے کہ مولف ’گل رعنا‘ ’’آب حیات‘‘ میں بیان کیے گئے بعض واقعات کو صحیح نہیں مانتے، مثلاً ’’آب حیات‘‘ میں آزاد نے میرؔ صاحب کی بد دماغی و نازک مزاجی کی جو

تصویر کھینچی ہے اور نواب سعادت علی کا سامنا ہو جانے اور ان کی بے پرواہی اور بے نیازی کا جو نقشہ بیان کیا ہے۔ پھر خلعت بحال کرنے اور دعوت کا ایک ہزار روپیہ بھیجنے اور ردوکد کے بعد قبول کرنے کا واقعہ بھی بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ مولف ’گل رعنا‘ کی نظر میں ان واقعات کی تصدیق کہیں سے نہیں ہوتی۔ انہوں نے میر تقی میرؔ کے ایک ہم عصر مرزا علی لطف کی کتاب ’’گلشن ہند‘‘ کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ ان کا مشاہرہ کبھی موقوف نہیں ہوا۔ اور ۱۲۲۵ھ تک ان کا یہی خیال رہا۔ یعنی میرؔ کا مشاہرہ جاری رہا۔ ایسے ان تمام واقعات پر جو ’’آب حیات‘‘ میں میرؔ کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولف ’گل رعنا‘ لکھتے ہیں:

> ’’حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے میرؔ صاحب کی جو تصویر ’’آب حیات‘‘ میں کھینچی ہے وہ ان کے منہ پر کھلتی نہیں۔ کچھ شبہہ نہیں کہ میرؔ صاحب نازک مزاج تھے مگر آزاد نے جو واقعات لکھے ہیں اگر وہ آج کسی میں پائے جائیں تو ہر شخص اس کو نازک مزاج نہیں ’خرد دماغ‘ سمجھے گا۔‘‘ ۱۸۲؎

آزاد نے بہادر شاہ ظفرؔ کے کلام کے متعلق جو رائے دی ہے اور ان کے کلام کو جس طرح ذوقؔ کا کلام ثابت کیا ہے، از روئے انصاف اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ مولف ’گل رعنا‘ لکھتے ہیں:

> ’’(ظفر کو) اقلیم سخن کہ فرمارِوائی کی دادا سے ترکہ میں ملی تھی، اور اردوئے معلٰی ان کے زیر نگیں تھا۔ افسوس ہے کہ اس کو بھی مولوی محمد حسین آزاد نے ظفرؔ سے چھین کر استاد ذوقؔ کو بخش دیا لطف یہ ہے کہ چار دیوان اس بد نصیب بادشاہ کے چھپ چکے ہیں، اور حضرت ذوقؔ کا بھی تھوڑا بہت کلام جو کچھ مل سکا وہ ایک دیوان کی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ ان دونوں کو پڑھو اور ہر ایک کے انداز سخن پر غور کرو۔ پھر اپنی فطرت سلیم سے فتویٰ لو۔ دونوں کی حیثیتیں جداگانہ نظر آئیں گی۔‘‘ ۱۸۳؎

اسی طرح اودھ کی تاریخ لکھتے وقت آزاد نے بعض ایسی روایتیں نقل کی ہیں کہ جو محض سطحی معلومات پر مبنی ہیں۔ مولف ’گل رعنا‘ کی نظر میں ان روایتوں کی حیثیت سوائے افسانہ کے اور کچھ نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ’’آزاد کہتے ہیں کہ (سوداؔ) ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہنچے۔ نواب شجاع الدولہ

نے بے تکلفی اور طنز سے کہا! مرزا تمہاری وہ رباعی اب تک میرے
دل پر نقش ہے۔ بہ پاس وضعداری پھر دربار نہ گئے۔'' یہ سب افسانہ
ہے۔شجاع الدولہ فیض آباد میں رہتے تھے۔لکھنؤ کی اس وقت
ایک قصبہ سے زیادہ حیثیت نہ تھی۔ یہ بھی غلط ہے کہ سوؔدا دوبارہ
دربار نہیں گئے۔شجاع الدولہ جب تک جیتے رہے یہ ان کی
ملازمت میں رہے۔ان کے کلیات میں متعدد قصیدے شجاع الدولہ
کی تعریف میں موجود ہیں۔''۱۸۴؎

مولف 'گل رعنا' نے مصحفی کے تذکرے کے حوالے سے آزاد کے بیان کیے گئے کئی واقعات کو غلط
ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کی نظر سے صرف میر تقی میرؔ کا تذکرہ
'نکات الشعرا'، ہی نہیں بلکہ مصحفی کا تذکرہ بھی نہیں گزرا۔ یا کم سے کم آب حیات کی تصنیف کے وقت مصحفی کا
تذکرہ آزاد کے سامنے موجود نہ تھا۔انہوں نے سید انشاؔ کے بارے میں سعادت یار خاں رنگیںؔ کے حوالے
سے جو یہ بات نقل کی ہے کہ ''ان کو ایک مشاعرہ میں اس طرح دیکھا کہ ایک شخص میلی کچیلی روئے دار مرزئی
پہنے، سر پر ایک میلا سا پھینٹا، گھٹنا پاؤں میں، گلے میں پکیوں کا توبڑا ڈالے، ایک ککڑ کا حقہ ہاتھ میں لیے
آیا۔توبڑے میں سے ایک کاغذ نکالا، غزل پڑھی اور کاغذ پھینک چل دیا۔اس موقع پر آزاد نے انشاؔ کی وہ
غزل لکھی ہے جس کا مطلع ہے:

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں (۱۸۵)

آزاد نے انشاؔ کی وہ مشہور غزل اس جگہ نقل کی ہے جو اس موقع کے لیے نہایت موزوں ہے، اور
اس غزل کا ایک شعر یہ ہے۔:

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

مگر واضح رہے کہ یہ غزل انشاؔ کی اس زمانے کی تصنیف نہیں ہے جو ان کے جنون اور بے چارگی کا

زمانہ بیان کیا جاتا ہے۔ میں نے اس غزل کے چند اشعار تذکرہ مصحفی میں پڑھے ہیں جو اس زمانے میں لکھا گیا ہے جس وقت انشا لکھنؤ پہنچے بھی نہ تھے۔ مصحفی نے تذکرہ میں وہاں تک کا حال لکھا ہے کہ ''مرشد آباد سے دلّی آ چکے ہیں اور مرزا عظیم بیگ وغیرہ شعرائے دلّی سے معرکہ درپیش تھے۔''۱۸۶

آگے مولف 'گل رعنا' نے یہ بھی لکھا ہے:

> ''آزاد نے انشا کے مجنوں ہو جانے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی ایسی دردانگیز تصویر کھینچی ہے کہ اس کو اپنے الفاظ میں پڑھو تو دل بے قابو ہو جاتا ہے، اور حقیقت میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزاد کی نری جادو طرازی ہے۔ حیات دبیر کے مصنف نے مرزا اوج کی زبانی لکھا ہے جو میر انشاء اللہ خاں کے نواسے بھی تھے کہ سید انشا نہ مجنوں ہوئے اور نہ ان کی تنخواہ بند ہوئی۔''۱۸۷

گیان چند جین اسے درست قرار نہیں دیتے، وہ لکھتے ہیں کہ ان کی مجنونیت کا ذکر کئی جگہ ملتا ہے۔۱۸۸ لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ مجنونیت کا واقعہ کس کتاب میں درج ہے۔ یا کہاں کہاں انشا کی مجنونیت کا ذکر ملتا ہے۔

بہرحال یہ چند مثالیں جو اوپر پیش کی گئی ہیں ''آب حیات'' کے صاف آئینہ پر دھبہ کی طرح نمایاں ہوتی ہیں، اور ان کی تحقیق اور اصل واقعہ کا اظہار ہر اس دیانت دار مورخ کا فرض تھا جو اس موضوع پر آزاد کے بعد قلم اٹھاتا۔ غالباً مولف 'گل رعنا' نے اپنی کتاب میں سب سے پہلے ''آب حیات'' کی تاریخی غلطیوں اور مبالغہ آمیز باتوں پر تبصرہ کیا ہے اور حقیقت کو سامنے لانے کی ایک بہترین کوشش کی ہے۔ گیان چند جین اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں ''گل رعنا'' کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے مولف کی بعض باتوں کی تصدیق کی ہے اور بعض سے متعلق تردد کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً میر حسن نے اپنے تذکرے میں خاکی کا ایک شعر نقل کر کے اسے عہد جہانگیر کا شاعر بتایا ہے۔ مولف 'گل رعنا' کا قیاس ہے کہ شعر کی زبان عہد جہانگیر کی نہیں۔ عہد عالمگیر کی معلوم ہوتی ہے۔ (گیان چند جین اس قیاس کو درست قرار دیتے ہیں) پھر حاشیے میں وہ مفید اطلاع دیتے ہیں کہ حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانے میں سید محمد قادری خاکی معاصر ولی کا

دیوان تھا جس میں دوریختیاں بھی تھیں۔ بہت ممکن ہے کہ میر حسن نے جس خا کی کا شعر نقل کیا ہے وہ یہی ہو۔ص۱۴ تا ۱۸ پر درویشوں کے ملفوظات اور ان کے شانِ نزول درج ہیں۔اس بارے میں گیان چند جین لکھتے ہیں کہ یہ تلاش قابل قدر ہے، بعد کی کتابوں میں یہ ملفوظات عام ہو گئے ہیں۔لیکن 'گل رعنا' میں شاید سب سے پہلے ملتے ہیں۔

اسی طرح ابراہیم عادل شاہ کے لیے مولف لکھتے ہیں کہ ''دھرپد میں ایک کتاب ملکی زبان میں لکھی تھی، اس کا نام ''نورس نامہ'' ہے۔گیان چند جین لکھتے ہیں کہ ''نورس'' نہ دھرپد کی کتاب ہے نہ موسیقی کی۔ یہ ابراہیم کے گیتوں کا مجموعہ ہے جن کی ابتدا میں اس راگ کی صراحت ہے جس میں یہ گائے جانے چاہئیں۔حکیم صاحب حیدر بخش حیدری کی ''توتا کہانی'' کا ماخذ ابن انشا کی ''طوطی نامہ'' کو قرار دیتے ہیں۔ یہ بات درست نہیں۔گیا چند جین کا خیال ہے کہ ''ابن نشاطی نے کوئی 'طوطی نامہ' لکھا ہی نہیں ہے۔حیدری کا ماخذ سید محمد قادری کی فارسی نثر ''طوطی نامہ'' ہے۔ص ۵ پر مولف 'گل رعنا' لکھتے ہیں کہ اردو میں پہلا واسوخت میرؔ نے لکھا۔گیان چند جین نے اس کی تردید کی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ میرؔ سے پہلے حاتمؔ، آبروؔ اور ناجیؔ کے واسوخت ملتے ہیں۔جمیل جالبی کے بقول 'اردو کا پہلا واسوخت حاتمؔ نے ۱۱۴۹ھ میں لکھا۔' (جلد دوم، حصہ اوّل، ص:۱۴۴)

ص ۲۶ نیز ص ۸۵-۸۴ پر ایک بیاض کے حوالے سے مولف 'گل رعنا' نصرتیؔ کے ایک 'معراج نامہ' کا ذکر کرتے ہیں۔اس کے بارے میں گیان چند جین نصیر الدین ہاشمی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''نصیر الدین ہاشمی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مولف گل رعنا نے نصرتیؔ کی ایک تصنیف کا ذکر کیا ہے، مگر وہ صحیح نہیں ہے۔'' گل رعنا میں اس کے جو اشعار دیئے ہیں ان سے یہ راز منکشف ہو جاتا ہے کہ یہ نصرتیؔ کے قصیدہ چرخیہ کے اشعار ہیں، جنہیں ناواقفیت کی بنا پر 'معراج نامہ' سمجھ لیا گیا ہے۔ص ۵۲ پر مولف گل رعنا لکھتے ہیں کہ تصوف کو دردؔ سے پہلے کسی نے چھوا نہیں۔گیا چند جین اسے بھی درست نہیں مانتے۔وہ لکھتے ہیں کہ ''ولیؔ سراجؔ سے مقدم ہیں اور ان کی غزلوں میں معرفت کے اشعار کافی ملتے ہیں۔اس کے علاوہ بھی دکن میں کئی عارفانہ مثنویاں لکھی گئی ہیں۔

آزاد نے 'آب حیات' میں 'نکات الشعرا' کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''میرؔ نے ولیؔ کو شیطان سے

مشہور قرار دیا ہے۔‘‘ مولف ’گل رعنا‘ اعتراض کرتے ہیں کہ ’نکات الشعرا‘ میں یہ الفاظ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے ’نکات الشعرا‘ نہیں دیکھا تھا۔ گیان چند جین کا خیال ہے کہ ’’آزاد کے پیش نظر ’نکات الشعرا‘ کا ایسا نقش اوّل رہا ہوگا جس میں یہ طنز تھا۔ بعض محققین کی بھی یہی رائے ہے۔‘‘ ۱۸۹؎

حالاں کہ مولوی عبدالحق اس قیاس کو صحیح نہیں مانتے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ’’بعض حضرات نے جو یہ قیاس قائم کیا ہے کہ ممکن ہے کہ پہلے ہو اور بعد میں یہ فقرہ خارج کر دیا گیا ہو، کسی طرح قابل قبول نہیں۔‘‘ ۱۹۰؎ اسی طرح مولف نے اپنے والد کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ ’’وہ بہت بڑے شاعر اور بہت بڑے مورخ تھے۔‘‘ گیان چند جین کا خیال ہے کہ مولف ’گل رعنا‘ نے عقیدت فرزندی کی بنا پر یہ بات کہی ہے۔ ’’کیفیت یہ ہے کہ ان کا بہت بڑا شاعر ہونا تو درکنا انہیں کوئی چھوٹے شاعر کے طور پر بھی نہیں جانتا، اور ملک کے مشہور مورخین ان کو مورخ کے طور پر بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ عقیدت فرزندی ایک بات ہے اور غیر جانب داری کے ساتھ ادبی تاریخ لکھنا دوسری بات ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میں اپنے والد کا ذکر کرنا کوئی جواز نہ تھا۔‘‘ ۱۹۱؎ گیان چند جین کا مولف کے والد کے بارے میں جو نظریہ ہے اس سے قطعاً پورے طور پر اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ مولف کے والد بہت بڑے شاعر نہ سہی، لیکن کتاب کے آخر میں دیئے گئے کلام کے نمونے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر ضرور تھے، اور مولف نے اپنے والد کا ذکر (عقیدت فرزندی) کی بنا پر نہیں بلکہ غالب گمان یہ ہے کہ ایک اچھے شاعر ہونے کی بنا پر ہی کیا ہوگا۔

مذکورہ بالا نقائص اور خامیوں کے باوجود بھی ’گل رعنا‘ ایک اہم اور قابل ذکر تذکرہ ہے۔ مولف نے پوری حقیقت پسندی اور سادگی کے ساتھ اس کتاب کی ترتیب کے محرکات اور تصنیف کے اغراض و مقاصد کا اظہار اپنے پیش لفظ میں کیا ہے۔ انہوں نے اردو زبان و ادب اور شاعری کی تاریخ کے طالب علموں کو اس کتاب کے ذریعہ بہت سی نئی معلومات فراہم کی ہیں۔ متعدد نئے ماخذوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اردو شاعری کے آغاز کو ’آب حیات‘ اور دوسرے قدیم تذکروں سے کئی قدم پیچھے لے گئے ہیں، جب دکن و گجرات میں صوفیائے کرام کے ذریعہ اس عام فہم بولی کا اور سلاطین دکن اور ان کے عہد کے شعرا کے ذریعے اس مرغوب طبع شاعری کا آغاز ہو گیا تھا۔ انہوں نے بہت سی تاریخی غلطیوں کی تصحیح کی اور بقول مولوی عبدالحق:

''ہر شاعر کے کلام سے نمونہ بھی دیا گیا ہے، جس سے فاضل مولف کی وسعت نظر کا ثبوت ملتا ہے۔ اگر چہ زبان وشعرا کے کلام پر اعلیٰ تنقید کا حق ادا نہیں کیا گیا، تاہم ہر شاعر کے کلام پر بہت ہی منصفانہ رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔''۱۹۲

مولوی عبدالحق کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اس کتاب میں ''تنقید کے اعلیٰ نمونے موجود نہیں'، لیکن سچ تو یہ ہے کہ مولف نے اپنی کتاب میں کہیں اس کا دعویٰ بھی نہیں کیا ہے کہ یہ کتاب تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہے، اور اس میں وہ تنقید کے ان اعلیٰ معیاروں کی پیروی کریں گے جو اس وقت تک رائج تھے۔ تحقیقی اعتبار سے بھی اس میں کچھ خامیاں ہیں، لیکن اس زمانے میں اس سے زیادہ بہتر کام کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی، کیوں کہ مولف کے سامنے وہ مواد نہ تھا جو اس کے اخلاف کے حصے میں آیا ہے۔ ان کا سب سے بڑا ماخذ 'آب حیات' ہے لیکن انہوں نے مواد کی کمی کے باوجود جس طرح اس اوّلین تاریخ کے بعض تسامحات اور عدم توازن کی نشان دہی کی ہے وہ قابل داد ہے۔

(ج) شعرالہند

'شعرالہند' مولانا عبدالسلام ندوی کی وہ تصنیف ہے جو ان کی زندگی اور ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جس میں اردو شاعری اور اس کی مختلف اصناف کے تاریخی و ادبی ارتقا سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلی جلد میں چار ابواب ہیں۔ پہلے باب میں اردو شاعری سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد قدما کا پہلا دور شروع ہوتا ہے جس میں اردو شاعری کی تجدید اور اصلاح کا ذکر ہے۔ دوسرے دور میں میر تقی میرؔ اور مرزا سوداؔ کے کلام کا موازنہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد قدما کا تیسرا دور آتا ہے جس میں لکھنوی شاعری کے آغاز پر بحث ہے، اور مصحفیؔ و انشاؔ کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اس بحث کے بعد ''تلامذہ شعرائے قدیم'' کا عنوان قائم کیا گیا ہے، جس میں خان آرزوؔ، مرزا مظہرؔ، میر سوزؔ، انشاؔ، جراٴتؔ، میر حسنؔ، شاہ مبارک آبرو، مصطفیٰ خاں یک رنگؔ، شرف الدین مضمونؔ، شاہ حاتمؔ، میرؔ، سوداؔ، میر دردؔ، مصحفیؔ، بقاؔ، دیوانہؔ، ضیاؔ، حزیںؔ، الہامؔ، ندیمؔ، بیدادؔ، حسرتؔ اور قدرتؔ کے ۹۱ شاگردوں کا نہایت مختصر ذکر کیا گیا ہے، اور نمونے کے طور پر ان کے ایک ایک دو دو شعر بھی نقل کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد ''متبعین شعرائے قدیم'' کا عنوان قائم کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کن کن شعرا نے کن کن شعرا کا تتبع کیا ہے۔ اس کے خاتمے پر باب اوّل ختم ہوتا ہے جو ۱۶۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

دوسرے باب میں متوسطین کے پہلے دور کا ذکر ہے۔ اس کی ابتدا شیخ ناسخؔ سے ہوتی ہے۔ اس میں تفصیل سے یہ بتایا گیا ہے کہ شیخ ناسخؔ نے زبان میں کیا کیا تبدیلیاں کی ہیں۔ اور اس سلسلے میں ایک آخری تبدیلی الفاظ کی ہے جس کی ایک طویل فہرست 'جلوۂ خضر' سے نقل کی گئی ہے۔ اس کے بعد اردو شاعری کے دو مختلف اسکول کے تحت دلّی اور لکھنؤ کی خصوصیات کلام تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ نیز شیخ ناسخؔ اور خواجہ حیدر علی آتشؔ کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ پھر ''اساتذۂ دہلی'' کا عنوان آتا ہے، جس میں اس دور کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، اور شاہ نصیرؔ، ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ کے علاحدہ علاحدہ رنگوں کو دکھایا گیا ہے۔ اس کے خاتمے پر ''متوسطین کا دوسرا دور'' شروع ہوتا ہے، جس میں تلامذۂ آتشؔ و ناسخؔ سے بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ شیخ ناسخؔ اور خواجہ آتشؔ کے بعد اردو زبان اور اردو شاعری کی اصلاح میں جو کمی

رہ گئی تھی اس کو ان کے تلامذہ نے نہایت عمدگی کے ساتھ پورا کیا۔ اسی میں تلامذۂ غالبؔ و مومنؔ کا بھی بیان ملتا ہے جو شیفتہؔ، ذکیؔ، مجروحؔ اور انورؔ دہلوی کے مختصر حالات و کلام پر مشتمل ہے۔

تیسرے باب کی ابتدا ''متاخرین کا پہلا دور اور ریاست رام پور'' کے عنوان سے ہوتی ہے۔ اس باب میں بتایا گیا ہے کہ غدر کے بعد نواب یوسف علی خان اور نواب کلب علی خان کی قدردانیوں نے رام پور کو اساتذۂ لکھنؤ و دہلی دونوں کی شاعری کا مرکز بنا دیا، اور ان کی فیاضانہ کشش نے مومنؔ، غالبؔ، داغؔ، اسیرؔ، امیرؔ، منیرؔ، بحرؔ، قلقؔ اور تسلیمؔ وغیرہ کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ اسی باب میں داغؔ اور امیرؔ مینائی کا موازنہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ''متاخرین کا دوسرا دور'' شروع ہوتا ہے جس میں تلامذۂ داغؔ اور امیرؔ کا ذکر ہے۔

چوتھے باب کا عنوان ''دورِ جدید'' ہے۔ اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ اصحاب نے ہمارے شعرا کے سامنے کیا کیا اصلاحی مطالبات پیش کیے اور ''مقدمۂ حالی'' سے یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ اردو شاعری کے متعلق مولانا نے کیا کیا اصلاحی خیالات ظاہر کیے ہیں، اور پھر ان کی شاعری کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد حسرتؔ موہانی، وفاؔ رام پوری، فانیؔ، جوہرؔ، اصغرؔ گونڈوی، شادؔ عظیم آبادی اور جوشؔ ملیح آبادی کا کلام نمونے کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد وطنی شاعری، اصلاحی شاعری، اخلاقی شاعری، سیاسی شاعری، نیچرل شاعری، مناظرِ قدرت، وصف نگاری، ظریفانہ شاعری، قومی شاعری، تاریخی شاعری کا علاحدہ علاحدہ ذکر کیا گیا ہے، جس میں حالیؔ، شبلیؔ، اقبالؔ، اکبرؔ الہ آبادی اور اسماعیل میرٹھی وغیرہ کا کلام پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں متفرق نظموں کا عنوان قائم کیا گیا ہے جس میں انگریزی نظموں کے ترجمے کا بھی تذکرہ شامل ہے۔ اس طرح یہ باب اختتام پذیر ہوتا ہے جو ۱۰۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں پہلے ایک مقدمہ ہے جس میں اردو زبان میں فنِ تنقید پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد کتاب کو تین باب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں اردو کی انواعِ شاعری پر تاریخی حیثیت سے غزل، ریختی، واسوخت، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، ڈرامہ، مذہبی شاعری، صوفیانہ شاعری، اخلاقی شاعری و فلسفیانہ شاعری پر بحث کی گئی ہے۔

دوسرا باب ''اردو کی انواعِ شاعری پر ریویو ادبی حیثیت سے'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں غزل، خمریات، قصیدہ، فخریہ، مرثیہ، ہجو، مثنوی، سہرا، وصف، تشبیہ و استعارہ، اجزائے شعر میں قافیہ، ردیف

اور ''محسنات شعر'' کے تحت صنائع و بدائع کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔

تیسرے باب میں ''بیان سخن'' کے عنوان کے تحت ملکی سرمایہ اور غیر مسلم شعرا کا ذکر کیا گیا ہے۔
ڈاکٹر خورشید نعمانی 'شعر الہند' پر تبصرہ کرتے ہوئے کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اردو میں قدیم شعرا کے بہت سے تذکرے ہیں، لیکن وہ سب موجودہ تنقیدی نقطۂ نظر سے ناقص اور نامکمل ہیں۔ان سے نہ تو شعرا کے حالات زندگی اور نہ کلام کی خصوصیات ہی معلوم ہوتی ہیں اور نہ شاعری کے عہد بہ عہد تغیرات اور اس کے اسباب پر بحث ملتی ہے۔وہ تو دراصل تذکرے سے زیادہ بیاض ہوتی ہیں، جن سے تذکرہ نگار اپنے پسندیدہ اشعار کا انتخاب لکھ لیا کرتے تھے......مولانا عبد السلام ندوی کو شعر و ادب سے فطری لگاؤ تھا، اور اس پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ چنانچہ انہوں نے مولانا شبلی کی 'شعر العجم' کے طرز پر 'شعر الہند' لکھی۔اس طرح 'آب حیات' کے بعد 'شعر الہند' اردو شعرا پر پہلی کتاب ہے جس سے اردو شاعری کے تمام رخ سامنے آجاتے ہیں۔'' ۱۹۳

'آب حیات' اور دیگر تذکروں کے باوجود آخر 'شعر الہند' لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی، اس کی وضاحت کرتے ہوئے خود عبد السلام ندوی لکھتے ہیں:

''اگر چہ (اردو شاعری) نے اپنی ترقی کے لیے نسبتاً فارسی شاعری سے کم زمانہ پایا۔تاہم اس پر بھی فارسی شاعری کی طرح تغیرات و انقلابات کے مختلف دور گزرتے رہے اور وہ اپنی فطری قابلیت کی بنا پر ہر دور کے مختلف موثرات اور محرکات سے متاثر ہوتی رہی اور ان موثرات نے اس کو ایک تاریخی چیز بنا دیا۔لیکن افسوس ہے کہ آج تک اردو زبان میں کوئی ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی جو اردو شاعری کے ان تمام انقلابات و تغیرات کو نمایاں کرتی اور اس سے یہ معلوم ہوتا کہ انواع

شاعری کے لحاظ سے موجودہ زبانوں میں اردو کا کیا درجہ ہے۔''۱۹۴؎

اردو کے آغاز وارتقا پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن 'شعرالہند' کی تصنیف تک اس پر بہت کم تحریریں تھیں۔ محمد حسین آزاد نے 'آب حیات' میں جو رائے قائم کی تھی مولانا عبدالسلام ندوی اس کی تائید کرتے ہیں، اور یہ لکھتے ہیں:

''اردو زبان کا مکمل خاکہ اگر چہ عالم گیر کے زمانے میں تیار ہوا، لیکن اس زبان کی داغ بیل عالم گیر کے زمانہ سے بہت پہلے پڑ چکی تھی، اور تیمور کے زمانہ تک دکن میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے ایک مستقل زبان پیدا ہو کر ان تمام شہروں میں پھیل چکی تھی، جو مسلمانوں کے زیر اقتدار تھے۔''۱۹۵؎

شعرالہند کی بنیادی خصوصیت کیا ہے؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کی بنیادی خصوصیت اردو شاعری کی تنقیدی تاریخ ہے۔ اس سلسلے میں مولانا نے کس طرح بحث کی ہے اس کا ایک نمونہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ اردو شاعری پر دربار کے کیا اثرات مرتب ہوئے اس کا جائزہ لیتے ہوئے عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں:

''تاہم اس دور میں شاعری فقرا اور صوفیہ کی خانقاہوں سے نکل کر عام طور پر امرا کے دربار میں آ گئی، اور اس انقلاب نے اردو شاعری کی تاریخ پر گونا گوں اثر ڈالے۔ اگر چہ یہ افسوس ناک بات ہے کہ میرؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، جرأتؔ اور انشاؔ وغیرہ کے کلام کا جو مخلوط مجموعہ شائع ہوا، اس میں دلّی اور لکھنؤ کا کلام امتیازی حیثیت سے علاحدہ علاحدہ نہیں کیا گیا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دلّی میں ان بزرگوں کا کیا رنگ تھا؟ اور لکھنؤ میں آ کر اس میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ اس لیے ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ مصحفیؔ، جرأتؔ اور انشاؔ وغیرہ کے کلام میں جو غیر مطبوع تغیرات پیدا ہوئے وہ تمام تر لکھنؤ کی آب و ہوا

اور درباری تعلقات کا نتیجہ ہیں۔ تاہم اگر خواجہ میر دردؔ اور وؔلی کے غیر
مخلوط کلام کو دلّی کی شاعری کا اصلی نمونہ قرار دیا جائے تو ہم کو اس دور
کی شاعری علانیہ دلّی کی شاعری سے مختلف نظر آتی ہے اور اس دور کا
ہر شاعر درباری اثر سے متاثر نظر آتا ہے۔''۱۹۶؎

یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دلّی اور لکھنؤ دو اسکول کا نظریہ سب سے پہلے اسی کتاب سے قائم ہوا۔ اس نقطۂ نظر کا یہ فائدہ ہوا کہ اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ ''دو ادبی اسکول'' (علی جواد زیدی) ''دلّی کا دبستانِ شاعری'' (ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی) اور ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی) کی کتابیں اسی نظریہ کی وجہ سے وجود میں آئیں، اور مطالعۂ شعر و ادب کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ عبدالسلام ندوی نے صرف نظریہ ہی نہیں قائم کیا بلکہ لکھنؤ اسکول کی خامیوں کی نشان دہی بھی کی، جس میں خاص طور پر لکھنؤ کی تہذیب و تمدن زنانہ پن، مبتذل اشعار، روحانی جذبات کی کمی، رعایت لفظی اور معاملہ بندی وغیرہ شامل ہیں۔ بقول مولوی عبدالحق ''ان عنوانات کے تحت مولف نے مثالوں کی کافی تعداد دی ہے۔ خیر ہم پر تو یہ الزام تھا کہ ہم دلّی کی طرف کے رہنے والے ہیں، لیکن مولوی عبدالسلام ندوی نہ دلّی کے ہیں نہ دلّی کے اطراف کے۔ دیکھیں ان پر کیا الزام لگایا جاتا ہے۔''۱۹۷؎

گیان چند جین 'شعرالہند' پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف کے بارے میں یہ رائے قائم کرتے ہیں:

''عبدالسلام ندوی نظریاتی تنقید میں نیاز مند ہیں لیکن عملی تنقید میں
نہیں۔ انہوں نے دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کا جو تصور پیش کیا ہے وہ
اردو ادب میں محو ہونے والا نہیں۔ کسی نہ کسی شکل میں چپکا رہے گا۔
عام ذہنوں میں ان دبستانوں کے وہی خصائص بسے ہوئے ہیں جو
انہوں نے گنوائے ہیں۔ انہوں نے میرؔ و سوداؔ، انشاؔ و مصحفیؔ اور آتشؔ و
ناسخؔ کے موازنے میں خاصے توازن کا ثبوت دیا ہے، اور ان شعرا کی
جو خصوصیات شناخت کی ہیں انہیں عام طور سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہاں
بحیثیت تاریخ ادب کے 'شعرالہند' کی کوئی اہمیت نہیں۔''۱۹۸؎

'شعرالہند' اردو کی ان کتابوں میں سے جس کے بارے میں آج تک یہ حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکا کہ یہ 'تذکرہ' ہے یا 'تنقید' اسم بامسمیٰ یا ہے یا بے مسمی؟ اس کو تحقیق سے کوئی نسبت ہے یا نہیں؟ اس کی ادبی قدر و قیمت ہے یا تاریخی، اگر ادبی قدر و قیمت ہے تو کیا ہے؟ یا اگر تاریخی قدر و قیمت کی حامل ہے تو اس کا ، مقام و مرتبہ کیا ہے؟ بعض ناقدین اسے محنت و مشقت سے لکھی ہوئی ایک کتاب سمجھتے ہیں، اور بعض اسے دوسروں کے اقوال و آرا کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ وہ حضرات جو اس تنقید و تنقیص میں سب سے آگے ہیں ان میں مولوی عبدالحق، نصیرالدین ہاشمی، نیاز فتح پوری اور کلیم الدین احمد کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے جا سکتے ہیں۔ ان سب کے اعتراضات مختلف قسم کے ہیں لیکن ایک عام اعتراض یہ ہے کہ 'شعرالہند' میں 'جلوۂ خضر'، 'نکات الشعرا'، 'آب حیات'، 'مقدمہ شعر و شاعری' اور 'شعرالعجم' کے اس کثرت سے اقتباسات دیئے گئے ہیں کہ خود مولانا کی رائے کہیں پر بھی نہیں آسکی ہے۔ اگر کوئی اوریجنل معلوم بھی ہوتی ہے تو غور و فکر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی پیش رو کی رائے کی تلخیص ہے۔ ذیل میں ان اعتراضات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مولوی عبدالحق کا سب سے اہم اور پہلا اعتراض کتاب کے نام پر ہے۔ وہ اپنے مضمون کے ابتدا میں لکھتے ہیں:

> ''ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس کتاب کا نام 'شعرالہند' کیوں رکھا گیا ہے۔ اگر تبرکاً و رسماً 'شعرالعجم' کے تتبع میں یہ نام رکھا گیا ہے تو خیر، ورنہ موضوع کے حساب سے یہ نام موزوں نہیں معلوم ہوتا۔''

اس ضمن میں وہ مزید لکھتے ہیں:

> ''قابل مولف (سید سلیمان ندوی) نے اردو شاعری کے آغاز پر صرف بارہ صفحے لکھے ہیں اور یہ بہت ناکافی اور تشنہ ہیں۔ اردو زبان کی تاریخ سے مطلق بحث نہیں کی ہے۔ ابتدائی شاعری جو دکن کی شاعری ہے اس سے مولف ناواقف ہیں اور نہ اس کا انہوں نے مطالعہ فرمایا ہے۔ اس لیے دوسروں کے اقوال جوں کے توں نقل کر دیئے ہیں اور اور اس لیے قیاس قائم کرنے میں غلطیاں ہوگئی ہیں۔''[۱۹۹]

نصیرالدین ہاشمی اپنے مضمون ''شعرالہند اور دکن'' میں لکھتے ہیں کہ فاضل مولف نے دکن کی ادبی خدمات کو نظرانداز کر دیا ہے جیسا کہ چاہیے تھا ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے، اس بابت وہ مزید لکھتے ہیں:

''یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے دکن کے حقوق ادا کرنے سے دریغ کیا ہے۔ تاہم دکن سے متعلق انہوں نے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں ان میں بعض فروگذاشتیں ہیں اور بعض کمیاں رہ گئی ہیں اگر ان فروگذاشتوں سے قطع نظر کر لیں جو کتاب کی کامل کامیابی میں حائل ہیں تو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کے مصنف نے دکن کو قابل لحاظ سمجھا اور اگرچہ اسے اردو کی تاریخ میں وہ مستقل درجہ نہیں دیا جس کا وہ اپنی کارگذاریوں کے لحاظ سے مستحق ہے۔''۲۰۰

کلیم الدین احمد اپنی مشہور زمانہ کتاب ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں 'شعرالہند' کے پہلے حصے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شعرالہند' کا پہلا حصہ 'آب حیات' اور 'گل رعنا' سے مختلف نہیں۔ دلچسپی میں یہ 'آب حیات' سے بہت پیچھے ہے۔ یہ درست ہے کہ اس میں مواد 'گل رعنا' سے زیادہ ہیں، لیکن 'گل رعنا' پڑھی جا سکتی ہے۔ 'شعرالہند' کی ورق گردانی سے طبیعت میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔''

اس بابت وہ مزید لکھتے ہیں:

''مصنف 'شعرالہند' نے بہت محنت اور کاوش سے کام لیا ہے، لیکن وہ تنقید کے لیے پیدا نہیں کیے گئے تھے۔ اگر وہ یہ محنت کسی ایسے کام میں صرف کرتے جس سے ان کی طبیعت کو زیادہ مناسبت تھی تو شاید ان کی محنت مشکور ہوتی ہے۔''۲۰۱

نیاز فتح پوری نے 'شعرالہند' کی دوسری جلد پر جو اعتراضات کیے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) اصناف شاعری کے سلسلے میں جس اصول پر مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ اصول ناقابل فہم ہیں۔

(۲) وہ اردو غزل سے بیزار نظر آتے ہیں اسی وجہ سے انہوں نے سطحی اور سرسری بیان سے کام لے کر بات ختم کر دی ہے۔

(۳) غزل پر ادبی حیثیت سے جو تنقید کی گئی ہے، وہ تشنہ اور نامکمل ہے۔

(۴) اصناف سخن سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی زیادہ واضح اور مدلل نہیں ہے۔

(۵) 'شعر الہند' تنقید کے اصول سے ہٹی ہوئی ہے جو اس کا بدترین عیب ہے۔ ۲۰۲

درج بالا اعتراضات سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ 'شعر الہند' ان تمام ناقدین کی توجہ کا مرکز بنی رہی تھی اور آج بھی ہے جو ادبیات کو جدید فلسفہ، سماجیات اور نفسیات کے آلے سے جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ اس کا یہ بہت واضح مطلب ہے کہ 'شعر الہند' سے اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود یہ ناقدین حضرات اس سے صرف نظر نہ کر سکے، اور جس کتاب سے ناقدین کا بہت بڑا گروہ صرف نظر نہ کر سکے تو اس کتاب کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اس کی دونوں جلدیں اردو شاعری کی تنقید میں بلند درجہ رکھتی ہیں۔ اس کا صحیح اندازہ ان اشعار کے انتخاب سے لگایا جا سکتا ہے جو مولانا نے 'شعر الہند' میں درج کیے ہیں۔ اس تعلق سے ڈاکٹر شباب الدین لکھتے ہیں:

> ''ہمارے نزدیک 'شعر الہند' ایک تنقیدی کتاب ہے، جو بیسویں صدی کے تیسرے دہے کے نظام تنقید کے مطابق ضبط تحریر میں لائی گئی ہے۔ اس میں شعر کے لفظی و معنوی محاسن پر بحث کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کی روش میں جو تغیر و تبدل ہوتا رہا اس کی طرف واضح اشارے کیے گئے ہیں، اور کسی حد تک اس بات پر بھی بحث کی گئی ہے کہ تغیر و تبدل کے اسباب کیا تھے، اور اس کا اردو شاعری پر کیا اثر پڑا۔'' ۲۰۳

○

حواشی:

(۱) محمد حسین آزاد، نند کشور وکرم، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء ص:۱۲
(۲) آب حیات کا تنقیدی مطالعہ، مسعود حسن رضوی ادیب، کتاب نگر، دین دیال روڈ لکھنؤ، ۱۹۵۳ء ص:۱۰
(۳) آب حیات، مرتبہ: ڈاکٹر ابرار عبد السلام، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۶ء ص:۱۵
(۴) ایضاً، ص:۱۵
(۵) محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف (حصہ دوم) ڈاکٹر اسلم فرخی، انجمن ترقی اردو (پاکستان) ۱۹۶۵ء ص:۶
(۶) مکاتیب حالی، مرتبہ: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ادبی پریس (کراچی) ۱۹۵۰ء ص:۱۷
(۷) دستور الفصاحت، مرتبہ: امتیاز علی عرشی، ہندوستانی پریس، رام پور، ۱۹۴۳ء ص:۱۰۹
(۸) آبِ حیات، محمد حسین آزاد، اتر پردیش اردو اکادمی (لکھنؤ) ۲۰۰۳ء ص:۴
(۹) محمد حسین آزاد، مظفر حنفی، ساہتیہ اکادمی (دہلی) ۱۹۹۶ء ص:۵۱
(۱۰) محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف (حصہ دوم) ص:۸
(۱۱) مقالات آزاد (جلد اوّل) مرتبہ: آغا محمد باقر، مجلس ترقی ادب (لاہور) ۱۹۶۶ء ص:۳۰
(۱۲) آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین، ڈاکٹر محمد صادق، مجلس ترقی ادب (لاہور) ۱۹۷۳ء ص:۸)
(۱۳) محولہ بالا، ص:۱۰
(۱۴) ایضاً، ص:۱۰
(۱۵) مکاتیب حالی، ص:۱۸
(۱۶) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، انجمن ترقی اردو (پاکستان) ۲۰۰۰ء ص:۳۸
(۱۷) آب حیات، محمد حسین آزاد، ص:۴
(۱۸) آب حیات، مرتبہ: ابرار عبد السلام، ص:۲۴
(۱۹) محولہ بالا، ص:۲۵
(۲۰) اردو میں تنقید، ڈاکٹر احسن فاروقی، لکھنؤ یونیورسٹی (لکھنؤ) سنہ اشاعت ندارد، ص:۳۴
(۲۱) اردو تنقید پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، بک امپوریم، اردو بازار، سبزی باغ (پٹنہ) ۲۰۱۰ء ص:۴۶
(۲۲) آب حیات کا تنقیدی مطالعہ، ص:۵۷
(۲۳) آب حیات کی حمایت میں، ص:۸
(۲۴) محولہ بالا۔ ص:۳۰
(۲۵) آب حیات، محمد حسین آزاد، ص:۲۵۴
(۲۶) آب حیات، مرتبہ: ابرار عبد السلام، ص:۳۵-۳۶
(۲۷) مکاتیب آزاد، مرتبہ: سید مرتضیٰ حسین فاضل، مجلس ترقی ادب (لاہور) ۱۹۶۶ء ص:۱۳-۱۴
(۲۸) آب حیات کی حمایت میں، ص:۱۲
(۲۹) آب حیات، مرتبہ: ابرار عبد السلام، ص:۳۷
(۳۰) محولہ بالا، ص:۳۷
(۳۱) آب حیات، محمد حسین آزاد، ص:۴۰۵

(۳۲) کلیات نثر حالی،مرتبہ: شیخ اسماعیل پانی پتی (جلداوّل) مجلس ترقی ادب (لاہور) سنہ اشاعت ندارد،ص:۳۱۳
(۳۳) محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف (حصہ دوم) ص:۵۲
(۳۴) اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری مجلس ترقی ادب (لاہور) ۱۹۷۲ء ص:۶۱۱
(۳۵) محولہ الا ص:۶۱۲
(۳۶) آب حیات،مرتبہ: ابرار عبدالسلام،ص:۴۴
(۳۷) مجموعہ نغز،مرتبہ: حافظ محمود شیرانی، پنجاب یونیورسٹی (لاہور) ۱۹۳۳ء، دیباچہ،مرتب
(۳۸) اردو کی ادبی تاریخیں،ص:۳۶
(۳۹) آب حیات،محمد حسین آزاد،ص:۶
(۴۰) آب حیات،مرتبہ: ابرار عبدالسلام،ص:۴۴۶
(۴۱) محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف (حصہ دوم) ص:۶۸
(۴۲) تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ تک، سیدہ جعفر و گیان چند جین (جلداوّل) ص:۴۳،۴۷، بحوالہ آب حیات،مرتبہ: ابرار عبدالسلام ص:۴۴۶
(۴۳) اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری،ص:۶۱۴
(۴۴) آب حیات،محمد حسین آزاد،ص:۱۶
(۴۵) پنجاب میں اردو، حافظ محمود شیرانی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان (نئی دہلی) ۱۹۸۲ء ص:۱۳۷، ۱۳۸
(۴۶) حفظ اللسان معروف بہ خالقِ باری،مرتبہ: حافظ محمود شیرانی، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی،۱۹۴۴ء ص:۱
(۴۷) امیر خسرو دہلوی، پروفیسر ممتاز حسین، پاکستان ہیرالڈ لمیٹڈ (کراچی) ۱۹۷۵ء ص:۳۴۴، ۳۵۵
(۴۸) امیر خسرو، ڈاکٹر وحید مرزا، نیشنل امیر خسرو سوسائٹی، ایوانِ غالب (نئی دہلی) ۲۰۰۷ء ص:۲۶۶
(۴۹) تاریخ ادب اردو (جلداوّل) ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی) ۱۸۷۷ء ص:۲۸
(۵۰) آب حیات،مرتبہ: ابرار عبدالسلام،ص:۴۵۱
(۵۱) آب حیات،محمد حسین آزاد،ص:۲۳
(۵۲) کربل کتھا،مرتبہ: خواجہ احمد فاروقی، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی (دہلی) ۱۹۶۱ء ص: مقدمہ مرتب
(۵۳) محولہ بالا، مقدمہ مرتب
(۵۴) آب حیات،محمد حسین آزاد،ص:۳۷
(۵۵) آب حیات،مرتبہ: ابرار عبدالسلام،ص:۴۶۲
(۵۶) محولہ بالا ص:۴۶۲
(۵۷) ایضاً،ص:۴۶۲
(۵۸) آب حیات،محمد حسین آزاد،ص:۸۱
(۵۹) اردو کی ادبی تاریخیں،ص:۶۴۵
(۶۰) دہلی میں اردو شاعری کا پس منظر، ڈاکٹر محمد حسن، ماڈل ٹاؤن (دہلی) ۱۹۶۴ء ص:۲۷۵
(۶۱) انتخاب حاتم،مرتبہ: ڈاکٹر عبدالحق، جمال پرنٹنگ پریس (دہلی) ۱۹۷۷ء ص:۴۷
(۶۲) آب حیات،مرتبہ: ابرار عبدالسلام،ص:۴۶۵
(۶۳) ولیؔ گجراتی،مرتبہ: ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی، ادبی پبلشرز (بمبئی) ۱۹۷۴ء ص:۱۷
(۶۴) محولہ بالا،ص:۲۷ تا ۸۰

(۶۵) عیارستان، قاضی عبدالودود، ص:۱۸۷، حوالہ: آب حیات، مرتبہ: ابرار عبدالسلام، ص:۴۶۶

(۶۶) آب حیات، محمد حسین آزاد، ص:۸۳

(۶۷) محمد قلی قطب شاہ، مسعود حسین، ساہتیہ اکادمی (دہلی) ۱۹۸۹ء ص:۲۷

(۶۸) کلیاتِ ولی، مرتبہ: احسن مارہروی، انجمن اردو پریس، اردو باغ (اورنگ آباد) ۱۹۲۷ء ص:۲۸

(۶۹) آب حیات، محمد حسین آزاد، ص:۸۴

(۷۰) کلیاتِ ولی، ص:۲۲

(۷۱) محمد حسین آزاد: بحیثیت محقق، قاضی عبدالودود، ادارہ تحقیقات اردو (پٹنہ) ۱۹۸۴ء ص:۲۷

(۷۲) آب حیات، محمد حسین آزاد، ص:۱۰۲

(۷۳) محمد حسین آزاد: بحیثیت محقق، ص:۲۸

(۷۴) آب حیات، محمد حسین آزاد، ص:۱۰۹

(۷۵) تذکرہ ہندی، ص:۸۰، بحوالہ: مقالات شیرانی (جلد سوم) مرتبہ: مظہر محمود شیرانی، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ (لاہور) ۱۹۶۹ء ص:۶۸

(۷۶) مقالاتِ آزاد (جلد اوّل) ص:۲۰۲

(۷۷) آب حیات، مرتبہ: ابرار عبدالسلام، ص:۴۷۵

(۷۸) آب حیات، محمد حسین آزاد، ص:۱۱۳

(۷۹) شعرا کے تذکرے، قاضی عبدالودود، خدا بخش اورینٹل لائبریری (پٹنہ) ۱۹۹۵ء ص:۳۶۳

(۸۰) آب حیات، مرتبہ: ابرار عبدالسلام، ص:۴۷۷

(۸۱) قاضی نمبر ۱۵، بحوالہ: اردو کی ادبی تاریخیں، ص:۴۵

(۸۲) محمد حسین آزاد: بحیثیت محقق، ص:۱۷

(۸۳) معارضہ مظہر و آرزو، خلیق انجم، مشمولہ: نوائے ادب (بمبئی) اکتوبر ۱۹۵۶ء ص:۲۲، ۲۳

(۸۴) تاریخ ادب اردو (جلد دوم، حصہ اوّل) ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی) ۲۰۰۰ء ص:۱۴۸

(۸۵) آب حیات، محمد حسین آزاد، ص:۱۱۶

(۸۶) محمد حسین آزاد: بحیثیت محقق، ص:۲

(۸۷) محولہ بالا، ص:۳۳، ۳۴

(۸۸) ایضاً، ص:۳۳

(۸۹) آب حیات، مرتبہ: ابرار عبدالسلام، ص:۴۸۱

(۹۰) محمد حسین آزاد: بحیثیت محقق، ص:۵

(۹۱) آب حیات، مرتبہ: ابرار عبدالسلام، ص:۴۸۱

(۹۲) آب حیات، محمد حسین آزاد، ص:۱۳۱

(۹۳) معمولات مظہر، مترجم: محمود عبدالستار، بھولے پور، ضلع امبیڈکر نگر (یوپی) ۲۰۰۷ء ص:۴۶

(۹۴) محولہ بالا، ص:۳۴

(۹۵) آب حیات، محمد حسین آزاد، ص:۱۳۳

(۹۶) محمد حسین آزاد: بحیثیت محقق، ص:۹۷

(۹۷) گلِ رعنا، حکیم سید عبدالحئی، دارالمصنفین (اعظم گڑھ) ۲۰۱۴ء ص:۱۶۸

(۹۸) آب حیات کا تنقیدی مطالعہ،ص:۲۹
(۹۹) تگ وتاز، پروفیسر کامل قریشی، ہندوستانی ادبی سوسائٹی (دہلی) ۱۹۹۳ء ص:۱۱۸
(۱۰۰) آب حیات، محمد حسین آزاد،ص:۱۳۴
(۱۰۱) مقالاتِ مظہری، مترجم: شیخ غلام علی، نول کشور پریس (لاہور) سنہ اشاعت ندادرد،ص:۸
(۱۰۲) آب حیات، محمد حسین آزاد،ص:۱۳۷
(۱۰۳) گل رعنا،ص:۱۶۶
(۱۰۴) مقالات مظہری،ص:۸۷
(۱۰۵) آب حیات، مرتبہ: ابرار عبدالسلام،ص:۴۹۱
(۱۰۶) قاضی نمبر ۱۷۰، بحوالہ: اردو کی ادبی تاریخیں،ص:۴۹
(۱۰۷) آب حیات، محمد حسین آزاد،ص:۱۴۲
(۱۰۸) نادراتِ شاہی، مرتبہ: امتیاز علی عرشی، ہندوستانی پریس (لاہور) ۱۹۴۴ء ص:۳۴، ۳۵
(۱۰۹) مقالات شیرانی،ص:۹۶، بحوالہ: اردو کی ادبی تاریخیں،ص:۴۹۰
(۱۱۰) مرزا محمد رفیع سودا، ڈاکٹر خلیق انجم، انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) ۱۹۶۶ء ص:۱۰۲
(۱۱۱) اردو کی ادبی تاریخیں،ص:۴۹
(۱۱۲) آب حیات، محمد حسین آزاد،ص:۱۷۴
(۱۱۳) آب حیات، مرتبہ: ابرار عبدالسلام،ص:۵۰۶
(۱۱۴) مقالات شیرانی (جلد سوم) ص:۱۱۵
(۱۱۵) اردو کی ادبی تاریخیں،ص:۵۴
(۱۱۶) آب حیات، محمد حسین آزاد،ص:۱۷۶
(۱۱۷) آب حیات،ص:۵۴ بحوالہ: آب حیات، مرتبہ: ابرار عبدالسلام،ص:۵۰۷
(۱۱۸) محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف،ص:۱۱۸
(۱۱۹) آب حیات، محمد حسین آزاد،ص:۱۹۴
(۱۲۰) محولہ بالا،ص:۱۵۳
(۱۲۱) محمد حسین آزاد: بحیثیت محقق،ص:۳۲
(۱۲۲) آب حیات، مرتبہ: ابرار عبدالسلام،ص:۵۱۶
(۱۲۳) محمد حسین آزاد: بحیثیت محقق،ص:۳۲
(۱۲۴) آب حیات، محمد حسین آزاد،ص:۱۹۴
(۱۲۵) ذکر میر، مرتبہ: نثار احمد فاروقی، انجمن ترقی اردو ہند (نئی دہلی) ۱۹۹۶ء ص:۳۹
(۱۲۶) محمد حسین آزاد: بحیثیت محقق،ص:۶۶
(۱۲۷) محولہ بالا،ص:۳۴
(۱۲۸) جلوۂ خضر (جلد دوم) ص:۱۸۲، ۱۸۳، بحوالہ: آب حیات، مرتبہ: ابرار عبدالسلام،ص:۵۲۸
(۱۲۹) آب حیات، محمد حسین آزاد،ص:۲۷۳
(۱۳۰) انشاء اللہ خاں انشا، عابد پشاوری، اتر پردیش اردو اکادمی (لکھنؤ) ۱۹۸۵ء ص:۱۹۹

(۱۳۱) اردو کی ادبی تاریخیں،ص:۶۷
(۱۳۲) آب حیات،مرتبہ:ابرار عبدالسلام،ص:۵۳۸
(۱۳۳) آب حیات،محمد حسین آزاد،ص:۳۰۰
(۱۳۴) محمد حسین آزاد:حیات اور تصانیف،ص:۱۹۵
(۱۳۵) مصحفی:حیات وکلام،افسر صدیقی،مکتبہ نیادور(کراچی)۱۹۷۵ء،ص:۵۷
(۱۳۶) انشا کے حریف وحلیف،ص:۴۵،بحوالہ:آب حیات،مرتبہ:ابرار عبدالسلام،ص:۵۴۲
(۱۳۷) آب حیات،محمد حسین آزاد،ص:۳۵۳
(۱۳۸) آب حیات،مرتبہ:ابرار عبدالسلام،ص:۵۴۸
(۱۳۹) ناسخ کا تیسرا دیوان اور آزاد کے بعض بیانوں کی تصدیق،مسعود حسن رضوی ادیب،مشمولہ:شاعر(آگرہ)سالنامہ ۱۹۵۰ء،ص:۴۴ تا ۴۸،بحوالہ:آب حیات،مرتبہ:ابرار عبدالسلام،ص:۵۴۸
(۱۴۰) محمد حسین آزاد:بحیثیت محقق،ص:۶۰
(۱۴۱) ادبی تحقیق:مسائل اور تجزیہ،رشید حسن خاں،اتر پردیش اردو اکادمی(لکھنؤ)۲۰۰۵ء،ص:۹۱
(۱۴۲) آب حیات،مرتبہ:ابرار عبدالسلام،ص:۵۵۰
(۱۴۳) آب حیات،محمد حسین آزاد،ص:۳۸۱
(۱۴۴) لکھنؤ کا دبستانِ شاعری،ابواللیث صدیقی،شعبۂ اردو،مسلم یونیورسٹی(علی گڑھ)۱۹۴۴ء،ص:۳۴۳
(۱۴۵) محمد حسین آزاد:بحیثیت محقق،ص:۱۶
(۱۴۶) اردو کی ادبی تاریخیں،ص:۷۶
(۱۴۷) محمد حسین آزاد:حیات اور تصانیف،ص:۲۵۱
(۱۴۸) اردو کی ادبی تاریخیں،ص:۷۷
(۱۴۹) محولہ بالا،ص:۷۸
(۱۵۰) آب حیات،محمد حسین آزاد،ص:۴۲
(۱۵۱) محمد حسین آزاد:حیات اور تصانیف(حصہ دوم)ص:۲۵۸
(۱۵۲) آب حیات،محمد حسین آزاد،ص:۴۲۳
(۱۵۳) محمد حسین آزاد:حیات اور تصانیف(حصہ دوم)ص:۲۶۳
(۱۵۴) آب حیات،محمد حسین آزاد،ص:۴۳۹
(۱۵۵) مقالات شیرانی(جلد سوم)ص:۱۳۷
(۱۵۶) شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ،مرتبہ:اسلم پرویز،انجمن ترقی اردو ہند(دہلی)۱۹۹۹ء،ص:۱۵۳تا۱۶۳
(۱۵۷) محمد حسین آزاد:حیات اور تصانیف(حصہ دوم)ص:۲۸۱
(۱۵۸) آب حیات،محمد حسین آزاد،ص:۴۸۱
(۱۵۹) محمد حسین آزاد:بحیثیت محقق،ص:۴۰
(۱۶۰) غالبؔ درونِ خانہ،کالی داس گپتا رضا،ساکار پبلشرز،پرائیویٹ لمیٹڈ(بمبئی)۱۹۸۹ء،ص:۲۳۶
(۱۶۱) محمد حسین آزاد:حیات اور تصانیف(حصہ دوم)ص:۳۱۰
(۱۶۲) محمد حسین آزاد:بحیثیت محقق،ص:۲۰

(۱۶۳) محولہ بالا،ص:۲۰

(۱۶۴) آب حیات،محمد حسین آزاد،ص:۵۰۵

(۱۶۵) غالب درون خانہ،ص:۲۶۳

(۱۶۶) آب حیات،محمد حسین آزاد،ص:۵۱۶

(۱۶۷) محمد حسین آزاد: بحیثیت محقق،ص:۲۱

(۱۶۸) سلطان الذاکرین مرزا دبیر،افسر صدیقی ص:۵۱۰،بحوالہ: آب حیات،مرتبہ: ابرار عبدالسلام،ص:۵۷۶

(۱۶۹) تنقید آب حیات،میر محمد رضا ص:۷،۸،بحوالہ: محمد حسین آزاد: بحیثیت محقق،ص:۲۵

(۱۷۰) محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف (حصہ دوم) ص:۳۲۱

(۱۷۱) آب حیات،محمد حسین آزاد،ص:۵۲۸

(۱۷۲) واقعات انیسؔ،میر مہدی حسن احسن لکھنوی،دراصح المطابع،تھوپی ٹولہ (لکھنؤ) سنہ اشاعت،ندارد ص:۹۳

(۱۷۳) محمد حسین آزاد: بحیثیت محقق،ص:۲۶

(۱۷۴) محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف (حصہ دوم) ۳۲۹

(۱۷۵) گل رعنا،ص:۴۰،بحوالہ: حیات عبدالحئی،سید ابوالحسن علی ندوی،سید احمد شہید اکیڈمی،۲۰۰۴ء ص:۳۴۱

(۱۷۶) گل رعنا،حکیم سید عبدالحئی،دارالمصنفین،شبلی اکیڈمی (اعظم گڑھ) ۲۰۱۴ ص:۳۶

(۱۷۷) حیات عبدالحئی،سید ابوالحسن علی ندوی،سید احمد شہید اکیڈمی،۲۰۰۴ء ص:۳۶۲

(۱۷۸) اردو کی ادبی تاریخیں،ص:۱۰۴

(۱۷۹) حیاتِ عبدالحئی،ص:۳۴۱

(۱۸۰) اردو کی ادبی تاریخیں،ص:۱۰۴

(۱۸۱) حیات عبدالحئی،ص:۳۴۴

(۱۸۲) گل رعنا،ص:۱۹۶

(۱۸۳) محولہ بالا،ص:۳۲۴

(۱۸۴) ایضاً،ص:۱۷۸

(۱۸۵) آب حیات،محمد حسین آزاد،ص:۳۸۳،۳۸۴

(۱۸۶) گل رعنا،ص:۲۹۰

(۱۸۷) محولہ بالا،ص:۲۹۱

(۱۸۸) اردو کی ادبی تاریخیں،ص:۱۱۲

(۱۸۹) محولہ بالا،ص:۱۰۹

(۱۹۰) چند تنقیدات عبدالحق،شائع کردہ انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) ۱۹۳۹ء ص:۷۸

(۱۹۱) اردو کی ادبی تاریخیں،ص:۱۱۳

(۱۹۲) گل رعنا پر تبصرہ،مولوی عبدالحق،رسالہ 'اردو' جولائی ۱۹۲۵ء

(۱۹۳) دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات،ڈاکٹر خورشید نعمانی،مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی (بمبئی) ۱۹۷۷ء ص:۱۴۲

(۱۹۴) شعر الہند (حصہ اوّل) عبدالسلام ندوی،دارالمصنفین شبلی اکیڈمی (اعظم گڑھ) ۲۰۰۹ء ص:۲

(۱۹۵) محولہ بالا،ص:۱۲

(۱۹۶) ایضاً،ص:۷۰
(۱۹۷) تنقیدات عبدالحق،مرتب:محمد تراب علی خاں،کتب خانہ عزیزیہ(حیدرآباد،دکن)سنہ اشاعت ندادر،ص:۹۵
(۱۹۸) اردو کی ادبی تاریخیں،ص:۱۳۰
(۱۹۹) تنقیدات عبدالحق،ص:۸۶،۸۷
(۲۰۰) مقالات ہاشمی(حصہ اوّل)نصیرالدین ہاشمی،تاج کمپنی لمیٹڈ،ریلوے روڈ(لاہور)ص:۲۷۰ تا ۲۷۸
(۲۰۱) اردو تنقید پر ایک نظر،ص:۵۸
(۲۰۲) رسالہ 'نگار'۱۹۲۶ء بحوالہ:دارالمصنفین اعظم کی ادبی خدمات،ص:۱۴۶
(۲۰۳) عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات،ڈاکٹر شباب الدین،ایجوکیشنل بک ہاؤس(علی گڑھ)۱۹۹۹ء ص:۱۹۸

باب چہارم

اردو ادب کی مختصر تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے ادبی تاریخ کی روایت کا پتا چلتا ہے، جو مختلف ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی ہم تک پہنچی ہے۔اس روایت کا آغاز ان قدیم تذکروں سے ہوتا ہے جنہیں ہم باقاعدہ ادبی تاریخ تو نہیں کہہ سکتے ،لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ ادبی تاریخ نگاری کی روایت انہیں تذکروں کی بنیاد پر رکھی گئی ہے۔ان تذکروں میں بالعموم ایک دور یا عہد گذشتہ سے تذکرہ نگار کے عہد تک کے سبھی مشہور اور غیر مشہور شعرا کا مختصر ذکر ملتا ہے۔یعنی شاعر کا تعارف،اس کے حالات،شخصیت،کلام کے متعلق چند جملے اور آخر میں انتخاب کلام۔اس میں بھی تذکرہ نگار کی ذاتی پسند اور ناپسند، جماعتی اور انفرادی ترجیحات وتعصّبات کی کارفرمائی جا بہ جا نظر آتی ہے۔علاوہ ازیں ان تذکروں سے شاعروں کی پیدائش اور وفات یا دیگر اہم واقعات کے سنین وغیرہ کے متعلق معلومات بھی بالعموم حاصل نہیں ہوتیں، یوں ایک تشنگی کا احساس باقی رہ جاتا ہے،اور صحیح صورت حال کا ادراک بھی نہیں ہو پاتا۔ان قدیم تذکروں کے بارے میں علی جواد زیدی لکھتے ہیں:

> ''ان تذکروں میں بہت سے شاعروں کا صرف نام ہی درج ہے، کچھ
> ایسے بھی ہیں جن کے تخلص کے سوا کچھ اور نہیں معلوم، اکثر شعرا کی ادبی
> حیثیت مشکوک ہے اور بیشتر تاریخی اعتبار سے بھی اہم نہیں ہیں۔''[۱]

۱۸۸۰ء میں محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' شائع ہوئی۔اس کتاب میں آزاد نے اپنے سے قبل لکھے گئے تذکروں کا انداز اپنانے کے ساتھ ساتھ ایک نئی روش اختیار کی۔انہوں نے اردو شاعری کو پانچ ادوار میں تقسیم کر کے ہر دور سے صرف نمائندہ شعرا کو منتخب کیا اور جو شعرا ان کی نظر میں غیر اہم تھے انہیں نظر انداز کر دیا۔منتخب کیے گئے شعرا کے زندگی کے حالات،ان کی شکل وصورت،ان کے مزاج اور ان کی زندگی کے اہم واقعات اور ان کے کلام کی خصوصیات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کی جیتی جاگتی

تصویر لوگوں کے سامنے آجاتی ہے۔ یوں تو آزاد نے بظاہر اس کتاب کو صرف شاعری کی تاریخ کے طور پر لکھا ہے مگر اس میں بیک وقت کئی ایسے عناصر اور کئی ایسی خصوصیات شامل ہوگئی ہیں جو اسے تذکرہ اور تاریخ کے درمیان لا کھڑا کر دیتی ہے۔ بقول احسن فاروقی:

''چند مخصوص صفات میں 'آب حیات' تذکروں سے آگے بڑھ کر
تاریخ ادب کے دائرے میں آتی ہوئی ضرور معلوم ہوتی ہے۔ اس
میں کچھ باتیں ایسی ضرور ہیں جو عام تذکروں میں نہیں ملتیں۔'' ۲

'آب حیات' کے بعد دو کتابیں اور بھی ہیں جن کا نام اکثر تاریخ ادب کے سلسلے میں لیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک مولوی عبدالحئی کی ''گل رعنا'' ہے اور دوسری مولانا عبد السلام ندوی کی ''شعر الہند''۔ بقول علی جواد زیدی: ''گل رعنا'' کا تاریخی مرتبہ مشکوک ہے۔'' ان کے مطابق یہ کتاب 'آب حیات' کے بعد کی تصنیف ہے تو اسے 'آحیات' سے آگے ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وہ جا بہ جا آزاد کی نکتہ چینی کے باوجود تاریخ نویسی کی حد تک اور پیچھے رہ گئی۔ اس لیے ''گل رعنا'' تاریخ کے زمرے میں شامل نہیں کی جاسکتی۔ ۳ خود مولف نے اپنے دیباچے میں اسے تذکرہ شعرائے اردو قرار دیا ہے، اور لکھا ہے کہ پہلے انہوں نے حسب رواج ایک قدیم بیاض میں مشہور مشہور شعرا کا کلام جمع کیا تھا، بعد میں انہیں خیال ہوا کہ ان کے مختصر حالات بھی جمع کر دیئے جائیں، اس طرح یہ کتاب وجود میں آئی۔ ایسے ہی مولانا عبدالسلام ندوی کی ''شعر الہند'' ہے جس کے دیباچے میں مولانا نے یہ افسوس ظاہر کیا ہے کہ:

''آج تک اردو زبان میں کوئی ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی جو اردو
شاعری کے ان تمام انقلابات وتغیرات کو نمایاں کرتی اور اس سے یہ
معلوم ہوتا کہ انواع شاعری کے لحاظ سے موجودہ زبانوں میں اردو کا
درجہ کیا ہے۔'' ۴

مولانا عبدالسلام ندوی نے اس دیباچے میں اردو زبان سے متعلق ایک جامع کتاب کی بات کی ہے، لیکن ان کے ذہن میں جامعیت کا جو تصور ہے وہ شاعری تک محدود ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ انہوں نے اس کتاب میں بہت سا نیا مواد اکٹھا کیا ہے، مگر اس میں صرف شاعری ہی کے حوالے سے پوری بحث کی

گئی ہے۔نثر کے حوالے سے کوئی بحث نہیں ملتی۔اس لیے یہ کتاب بھی تاریخ ادب کے ذیل میں نہیں آتی۔

تذکروں کی اس مٹتی ہوئی روایت کے درمیان کئی اور تذکرے منظر عام پر آئے ان میں سے ایک منفرد تذکرہ دو جلدوں پر مشتمل مولوی یحییٰ تنہا کا ''سیر المصنفین'' ہے۔یہ دونوں جلدیں نثر نگاروں کے حالات پر مبنی ہیں۔اس کی پہلی جلد ۱۹۲۴ء میں اور دوسری جلد ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔تنہا نے یہ تذکرہ ''آب حیات'' سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔وہ پہلی جلد کے دیباچے میں یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ''آب حیات'' کے مطالعہ سے ان کے اندر نثر نگاروں کا تذکرہ مرتب کرنے کا خیال آیا۔کیوں کہ اب تک اردو شعرا کے حوالے سے بہت تذکرے ملتے ہیں،مگر نثر نگاروں کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی۔اس لحاظ سے اس کتاب کو نثر نگاروں کا اوّلین تذکرہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے،اور خود مولف نے دوسرے ایڈیشن کے دیباچے میں یہ دعویٰ کیا ہے:

> ''ہماری یہ کتاب ۱۹۲۴ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی۔اس موضوع پر اردو میں یہ سب سے پہلی کتاب تھی۔شعرا کے تذکرے تو بیسیوں لکھے جا چکے تھے،لیکن نثر نگاری کی طرف کسی کی توجہ مائل نہ ہوئی تھی۔اس وقت ہم نے یہ خیال ظاہر کیا تھا۔''[۵]

تنہا کی ''سیر المصنفین'' میں صرف ادیبوں کے حالات و واقعات کا تعارف و تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔اس سے تاریخ ادب کی مسلسل ارتقائی معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔کیوں کہ نثر کے ساتھ ساتھ شاعری کی اصناف،شاعروں کے تعارف اور تجزیہ کے بغیر کسی دور کے ادب کے بارے میں درست رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔اس لیے اسے ایک مربوط ادبی تاریخ کا مقام نہیں دیا جا سکتا۔ادبی تاریخ کی ایک لازمی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سلسلہ وار تاریخی ترتیب کا انداز اپنایا جائے جو کہ اس میں مفقود ہے۔اس کے باوجود ڈاکٹر گیان چند جین ''سیر المصنفین'' کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''سیر المصنفین کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اردو نثر کی پہلی تاریخ ہے۔تنہا نے بغیر نمونے کے یہ منصوبہ اپنے ذمے لیا اور اپنے دور کے لحاظ سے کافی معلومات پیش کر دیں۔''[۶]

''سیر المصنفین'' کے بعد عصر حاضر تک چھوٹی بڑی متعدد ادبی تاریخیں معرض وجود میں آ چکی ہیں،

ان میں سے بعض ادبی تاریخیں ایسی ہیں جن میں پورے اردو ادب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے، اور بعض ایسی ہیں جو کسی ایک پہلو یا ادب کے ایک حصے پر مشتمل ہیں۔ مثلاً اصناف سے متعلق تاریخیں، مختلف علاقوں کے اردو ادب کے جائزے پر مبنی تاریخیں، اسی طرح مختلف ادوار، رجحانات یا تحریکات سے متعلق تاریخیں وغیرہ۔ چوں کہ ہمارے تحقیقی وتنقیدی جائزے کا موضوع ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' ہے اس لیے زیر بحث باب میں ان نمائندہ ادبی تاریخوں کو شامل کیا گیا ہے جن میں خاصی حد تک تاریخی تسلسل کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور ادب کے دونوں پہلوؤں یعنی شاعری اور نثر کو مساوی اہمیت دے کر ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس باب میں تجزیئے کے لیے جن کتابوں کا انتخاب کیا گیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

(۱) تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ
(۲) اے ہسٹری آف اردو لٹریچر	ٹی. گراہم بیلی
(۳) مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر سید اعجاز حسین
(۴) اردو ادب کی تاریخ	نسیم قریشی
(۵) اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ	سلیم اختر
(۶) اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین
(۷) اردو ادب کی مختصر تاریخ	انور سدید
(۸) تاریخ ادب اردو	ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد

تاریخ ادب اردو- رام بابو سکسینہ

رام بابو سکسینہ کی کتاب انگریزی زبان میں ''اے ہسٹری آف اردو لٹریچر'' کے نام سے ۱۹۲۷ء میں رام نرائن لال، الہ آباد سے شائع ہوئی۔ گیان چند جین کے مطابق یہ کتاب ۳۸۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں رام بابو سکسینہ اور تیج بہادر سپرو کے پیش لفظ شامل کتاب ہیں، اور کتاب کے آخر میں اشاریہ بھی درج ہے۔ کتاب کا انتساب گورنر یوپی کے نام ہے۔ [۷] دو سال بعد ۱۹۲۹ء میں مرزا محمد عسکری

نے اس کتاب کا اردو ترجمہ ''تاریخ ادب اردو'' کے نام سے کیا اور یہ ترجمہ اسی سال نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ آغا محمد باقر نے سکسینہ کے کتاب کی تلخیص ''تاریخ نثر و نظم'' کے نام سے کی جو ۱۹۳۳ء میں شیخ مبارک علی اینڈ سنز لاہور سے شائع ہوئی۔

رام بابو سکسینہ کی انگریزی کتاب کے ترجمہ اور تلخیص کی اشاعت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع، مواد، مواد کی ترتیب و پیش کش کے اعتبار سے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ اردو ادب کی پہلی مکمل تاریخ ہے جو مختلف اوقات میں ترتیب دی جاتی رہی۔ اس کتاب کے مرتبین کے حوالے سے کئی نام آتے ہیں۔ مثلاً مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، قیوم نظامی اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری وغیرہ۔ اس تاریخ کے تجزیے کے لیے میرے پیش نظر موخرالذکر مرتب کی کتاب ہے جو ۲۰۱۷ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی) سے شائع ہوئی ہے۔

اس کتاب میں مرتب نے جدید تحقیق کی روشنی میں ترمیم و اضافے کے ساتھ ساتھ اغلاط کی تصحیح بھی کی ہے، جس کی پوری تفصیل وہ یوں بیان کرتے ہیں:

> ''۱۹۲۷ء میں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اس وقت تک اردو ادب پر تحقیق کے لیے اس قدر مصادر نہیں تھے، جس قدر آج حاصل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محققین کو آج اس میں بے شمار اغلاط نظر آتی ہیں، کتاب کے زیر نظر ایڈیشن کو اسی نقطۂ نظر کے مطابق جدید تحقیق کی روشنی میں از سر نو مرتب کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ کتاب کے اصل متن کے ساتھ ساتھ حواشی دیئے جا رہے ہیں۔ ان حواشی میں نہ صرف سنین و واقعات کی تصحیح کی گئی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اکثر ادیبوں کے حالات میں بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔'' ۸؎

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے پیش لفظ کے بعد کتاب کی ابتدا میں رام بابو سکسینہ کے انگریزی پیش لفظ کا اردو ترجمہ اور مرزا محمد عسکری کا طویل 'التماس مترجم' ہے۔ رام بابو سکسینہ اپنے پیش لفظ میں کتاب کی تالیف کے مقاصد بیان کرتے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ وہ زمانۂ قدیم سے لے کر اپنے عہد تک کے مشہور و

معروف شعرا اور نثر نگاروں کے احوال اور تصانیف کا ایسا تعارف پیش کرنا چاہتے تھے جس میں اردو ادب کی ارتقا کی پوری کہانی سمٹ کر آ جائے، اور عوام میں اردو ادب کا صحیح مذاق پیدا ہو سکے۔ اس تاریخ کو مرتب کرتے وقت رام بابو سکسینہ نے اس دور کے تاریخی حالات و واقعات کو خاص طور پر پیش نظر رکھا ہے۔ مزید برآں انہوں نے پروفیسر سنیٹری کی کتاب ''مختصر تاریخ انگریزی علم و ادب'' میں روا اصولوں کو مشعل راہ بنایا ہے۔ کیوں کہ وہ جدید تنقیدی اصولوں کے مطابق ایسی کتاب تیار کرنا چاہتے تھے جس سے انگریزی داں جماعت بھی اردو ادب سے کماحقہٗ واقف ہو جائے۔ اسی پیش لفظ میں سکسینہ نے اپنی کتاب کے حوالے سے چند خامیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

(۱) فٹ نوٹ نیز اصل ماخذ کے حوالے نہیں دیئے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ ایڈیشن میں یہ نقص دور کر دیا جائے گا۔

(۲) کلام کے نمونے نہیں دیئے: یہ قصداً ہے جیسا کہ پروفیسر سینٹسبری نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ نمونوں سے ضخامت بہت بڑھ جاتی ہے۔ ارادہ ہے کہ علاحدہ سے ایک جلد نمونوں اور ان کے انگریزی ترجموں کی شائع کر دی جائے۔

(۳) آخر میں کتابیات نہیں دی۔ انشاء اللہ ایک علاحدہ رسالہ تنقیدی نوٹوں کے ساتھ جس کا نام ''ماخذ ادب اردو'' ہوگا شائع کیا جائے گا۔

(۴) موجودہ دور کے اردو شعرا کا ذکر اس کتاب میں نہیں ہے، وجہ یہ ہے کہ ان کا حال ایک علاحدہ کتاب میں قلم بند کیا گیا ہے، جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔''۹

سکسینہ کے مذکورہ بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے جہاں فراخ دلی کے ساتھ کتاب کی خامیوں کا اعتراف کیا ہے وہیں ان کی تلافی کا وعدہ بھی کیا ہے۔ لیکن ان وعدوں کی حقیقت یا کیفیت گیان چند جین کے مطابق یہ ہے کہ اردو ترجمے کے آنے کے بعد انگریزی اصل کا کوئی مزید ایڈیشن نہیں نکلا۔ اس لیے حوالہ دینے کی بات رہ گئی۔ نمبر۲، اور نمبر۳، میں جن کتابوں کا وعدہ کیا گیا ہے وہ کبھی سامنے نہ آ سکیں، نمبر۴، کی موعودہ انگریزی کتاب ''موڈرن اردو لٹریچر'' ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ ۱۹۵۷ء میں سکسینہ کا انتقال ہو گیا اور یہ کتاب منصۂ شہود پر نہ آ سکی۔۱۰ ہر چند کہ سکسینہ کے کیے گئے وعدے سب کے

سب پورے نہیں ہوئے لیکن اس کتاب کی قدر و منزلت پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ کیوں کہ سکسینہ نے جس مقصد کے لیے یہ کتاب تحریر کی وہ مذکورہ خامیوں کے باوجود بھی نہایت عمدگی سے پورا ہو جاتا ہے، اور پھر اس صورت میں کہ بعض خامیاں مرزا محمد عسکری اور بعد کے مرتبین نے دور کر دی ہیں۔ مرزا سلیم بیگ کے مطابق عسکری صاحب چوں کہ ''لیجسلیٹیو ڈپارٹمنٹ'' کلکتہ میں ہیڈ ٹرانسلیٹر رہ چکے تھے، اس لیے ترجمے کے فن اور اس کے اسرار و رموز کے ساتھ ساتھ اپنے موضوع کی دیگر ضروریات سے بھی پوری طرح واقف تھے۔ پھر بھی وہ اس کتاب کے ترجمے کے سلسلے میں بعض ایسی مشکلات سے دوچار ہوئے جو خاص طور پر ترجمے کے درمیان پیش آتی ہیں۔ چنانچہ وہ 'التماس مترجم' میں لکھتے ہیں:

> ''ترجمہ کی مشکلات کے علاوہ بعض دوسری مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑا...... بعض واقعات ایسے تھے جنہیں شاید مصلحتاً اصل کتاب میں مجملاً بیان کیا گیا تھا، مگر اردو میں ان کی کسی قدر تفصیل ضروری تھی، ان کو بھی اس میں بیان کیا گیا...... چوں کہ انگریزی میں نمونۂ کلام دینا ضروری نہ تھا...... لیکن اس میں سب کا نہیں اکثر نمونۂ کلام دیا گیا ہے ...... اکثر جگہ ترجمہ میں کوہ کندن و کاہ برآوردن کا معاملہ درپیش ہے، بعض معمولی اور ادنیٰ باتوں کے لیے پوری پوری کتابیں اور تاریخیں پڑھنی پڑی ہیں جس کے بعد کوئی صحیح نتیجہ نکالا جا سکا۔''[۱۱]

ان تمام درپیش مشکلات کے باوجود عسکری صاحب نے اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لا کر اس قدر سلیس، رواں اور موزوں ترجمہ کیا ہے جس پر طبع زاد کا گمان ہوتا ہے۔ بقول مرتضیٰ حسین فاضل ''مرزا عسکری نے غیر زبان میں لکھی ہوئی کتاب کو جب خود ہی اس زبان میں لکھا تو ایسی نکھری کہ اصل کے پڑھنے والے کم اور ترجمہ دیکھنے والے زیادہ ہو گئے، اور اسی کو حوالے کے لیے استعمال کیا گیا۔[۱۲] ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ سکسینہ کی انگریزی کتاب اور مرزا عسکری کے اردو ترجمے کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے، ان کے مطابق اردو ترجمے میں عسکری نے نظم و نثر کے حصوں کو الگ الگ کر دیا ہے، جب کہ انگریزی میں پوری کتاب ایک سلسلہ میں ہے۔ میرے پیش نظر

مرزا عسکری کی ترجمہ شدہ کتاب ہے جس پر حواشی وتعلیقات کا اضافہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے کیا ہے۔ یہ کتاب بھی اصل انگریزی کتاب کی طرح ۱۹/ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے تین ابواب میں اردو زبان کے آغاز وارتقا پر بحث کی گئی ہے اور شاعری کی خصوصیات بھی بیان کی گئی ہیں۔ اس کے بعد گیارہ (۱۱) ابواب شاعری اور پانچ نثر سے متعلق ہیں۔ آخر میں کتاب سے متعلق موقر اور معزز اصحاب کی قیمتی آرا شامل کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں ایک ضمیمہ بھی شامل ہے، جس میں نظر لکھنوی، چکبستؔ اور علامہ اقبالؔ کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ گیان چند جین کے مطابق یہ ضمیمہ مرزا عسکری نے اضافہ کیا ہے۔[۱۳]

رام بابو سکسینہ نے یہ تاریخ زمانی ترتیب کے اعتبار سے مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کا پہلا باب ''زبان اردو اور اس کی اصل'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں لفظ ''اردو'' سے کیا مراد ہے، 'اردو اور ہندی کا تعلق، اردو میں فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی کثرت کے اسباب، یورپ کی زبانوں کا اردو پر اثر، اور 'اردو رسم الخط' وغیرہ کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ کتاب کا دوسرا باب ''ادب اردو کی ترقی کے ابتدائی دور'' کے عنوان سے ہے۔ یہ باب ایک طرح سے پوری کتاب کا خلاصہ ہے۔ اس میں ''نظم کا تقدم نثر پر اور اس کی وجوہ'' پہلا شاعر امیر خسروؔ، اردو کی پختگی کا زمانہ، قدیم شعرائے دکن، انشا اور مصحفیؔ کا دور، غالبؔ اور ذوقؔ کا زمانہ، آزاد اور حالی کا زمانہ، سرسید اور ان کے رفقا کا عہد زریں، ناول نویسی کی ابتدا، اردو ڈرامہ، وغیرہ کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے۔ یہی مباحث دوسرے ابواب میں قدرے تفصیل سے ملتے ہیں۔

تیسرا باب ''اردو شاعری کی عام خصوصیات'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں رام بابو سکسینہ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اردو شاعری فارسی کی مقلد اور محض نقالی ہے، اردو شاعری میں نہ صرف تکلفات ظاہری کی کثرت ہے بلکہ وہ محض رسمی اور لکیر کی فقیر ہے۔ اردو شاعری کی سب سے بڑی خرابی سکسینہ کی نظر میں یہ ہے کہ:

> ''اس میں اکثر مضامین فطرت کے خلاف باندھے جاتے ہیں۔ مثلاً مرد کا عشق مرد کے ساتھ جس کے لیے کوئی معقول وجہ یا عذر بھی نہیں پیش کیا جاتا۔ ایک لڑکے کو معشوق تصور کر کے اس کے گھنگھریالے بال، اس کا سبزہ، اس کے خدوخال اس لطف سے بیان کیے جاتے ہیں جس کی تہذیب حال کبھی متحمل نہیں ہوسکتی۔''[۱۴]

چوتھا باب ''قدیم شعرائے دکن'' سے متعلق ہے۔اس میں بہمنی ،قطب شاہی اور عادل شاہی دور کے شعرا کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔بقول افشاں زوار''اس باب میں دی گئیں معلومات زیادہ تر 'اردوئے قدیم ،دکن میں اردو،اور'شعرائے دکن' سے لی گئی ہیں۔۱۵؎ گیان چندجین کے مطابق عادل شاہیوں کے بارے میں ص:۶۴ کا پہلا پیرا عسکری کا اضافہ ہے۔انہوں نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ یہ پورا پیرا لفظ بہ لفظ شمس اللہ القادری کی ''اردوئے قدیم'' کے پہلے ایڈیشن سے نقل کیا ہے،لیکن حوالہ نہیں دیا ہے۔اسی طرح عادل شاہ کے بارے میں خافی خان کا اقتباس بھی اردو کا اضافہ ہے۔۱۶؎ اسی باب میں ولیؔ،داؤد اور سراجؔ اورنگ آبادی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ولیؔ کا ذکر کافی تفصیل سے کیا گیا ہے۔پانچواں باب ''اساتذۂ دہلی (حصہ اوّل)طبقۂ متقدمین حاتمؔ وآبروکا زمانہ'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں دہلی کے قدیم شعرا مثلاً شاہ مبارک آبروؔ،خان آرزوؔ،شاہ حاتمؔ،مظہرؔ،ناجیؔ اور یک رنگ وغیرہ کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ساتھ ہی اس عہد کے شعرا کا بیان اوران کے کلام کی خوبیوں اورخامیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔سکسینہ مرزا مظہر جان جاناں کے ذکر میں ان کے قتل کا یہ واقعہ بیان کرتے ہیں:

> ''عشرہ محرّم تھا،تعزیئے نکل رہے تھے،مرزا صاحب اپنے کوٹھے پر بیٹھے ان کی سیر کررہے تھے،مشہور ہے کہ ان کی زبان سے نکلا کہ بارہ سو برس بعد اس قدر شور وغل اور ماتم کرنا اور کاغذ اور بانس کے ڈھانچوں کا اس قدر ادب واحترام کرنا خلاف عقل ہے۔یہ جملہ تعزیہ لے جانے والوں نے سن لیا اور برسر پیکار ہوگئے۔نویں تاریخ کی رات کو دو آدمی مرزا صاحب کے مکان پر آئے اور آواز دی،مرزا صاحب باہر نکل آئے ،ایک آدمی نے دیکھتے ہی قرابین ماری،مرزا صاحب زخمی ہوئے اور یہی ہلاکت کا سبب ہوا۔یہ واقعہ ۱۱۹۴ھ مطابق ۱۷۸۰ء کا ہے۔''۱۷؎

ڈاکٹر تبسم کاشمیری مذکورہ واقعے کے بارے میں فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ ۱۱۹۴ھ میں پیش نہیں آیا، بلکہ بقول مصحفی محرّم ۱۱۸۹ھ جنوری ۱۷۸۱ء کو پیش آیا،اور مصحفی نے اس کی تاریخ بھی کہی ہے،

تبسم کاشمیری نے اس واقعے کے غلط یا صحیح ہونے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔جمیل جالبی نے اپنی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' میں اس حوالے سے بڑی تفصیلی بحث کی ہے، اور یہ لکھا ہے کہ سکسینہ نے مرزا مظہؔر کے واقعۂ قتل کی جو راویت بیان کی ہے وہ درست نہیں۔ان کے مطابق مرزا مظہر کی شہادت کا واقعہ سیاسی نوعیت کا تھا۔انگریزوں کی سفارش پر جو حکم کا درجہ رکھتا تھا۔شاہ عالم ثانی نے نجف خاں اصفہانی کو مسند وزارت پر فائز کر دیا، اور نجف خاں نے نواب مجد الدولہ عبدالاحد خان کو قید کر دیا۔مرزا مظہؔر مجد الدولہ کے حامی تھے اور نجف خاں کو ناپسند کرتے تھے۔نیز روہیلوں کی بہت بڑی تعداد ان کی مرید تھی، اور دلّی میں مرزا کی خانقاہ ان کا سب سے بڑا مرکز تھی۔یہ بات نجف خاں کے لیے سیاسی طور خطرے کا باعث تھی۔اس لیے اس نے مرزا کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے پہلے امام باڑوں میں یہ افواہ پھیلائی کہ مرزا نے محرّم کے جلوس پر لعن طعن کی ہے۔اس کے بعد اس نے ایک ایرانی کو مرزا کے قتل پر متعین کیا۔بالآخر ۷/محرّم کو قاتلانہ حملہ ہوا اور ۱۰/محرّم ۱۱۹۵ھ/۷ جنوری ۱۷۸۱ء کو ان کی وفات ہوئی۔۱۸؎

چھٹا باب ''اساتذۂ دہلی، طبقۂ متوسطین میر و سوؔدا کا زمانہ'' ہے۔اس باب میں اردو شاعری کا زریں عہد، زبان میں فارسیت کا غلبہ، الفاظ میں تذکیر و تانیث کے حوالے سے بحث کی گئی ہے، اور شعرائے دہلی کے لکھنؤ آنے کی وجہ بیان کی گئی ہے۔میؔر اور سوؔدا کے علاوہ میر حسؔن، خواجہ میر دردؔ اور میر سوؔز کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ان میں سے موخر الذکر دو شاعروں کے تذکرے مختصر ہیں۔جب کہ اوّل الذکر تینوں شعرا کا تذکرہ نسبتاً طویل ہے۔اس باب میں سکسینہ میر تقی میؔر اور سوؔدا کے کلام کا تقابلی جائزہ بھی لیتے ہیں اور اس جائزے میں وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

> ''وسعت نظر، متنوع خیالات، جزئیات کے بیان کی قدرت، دنیاوی معاملات کی واقفیت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مذاق اور ظرافت میں سوؔدا کو میؔر پر برتری ہے۔سادگی الفاظ، سلاست زبان، عاشقانہ رنگ، درد و اثر، فصاحت و بلاغت اور تصوف میں میؔر صاحب کو سوؔدا پر فضیلت ہے۔''۱۹؎

ساتواں باب بھی اساتذۂ دہلی سے متعلق ہے۔اس باب کا عنوان ہے ''اساتذۂ دہلی، طبقۂ متاخرین انشؔا اور مصحفؔی کا زمانہ''۔اس باب کے ابتدا میں سکسینہ شعرا کے طبقات کے بارے میں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں:

''شعرا کے طبقات کی ترتیب کوئی فرضی چیز نہیں جیسا کہ بادالنظر میں
وہ معلوم ہوتی ہے۔ گو یہ سچ ہے کہ اکثر شعرا ایک دوسرے کے ماقبل
دور کے بعض شعرا کے معاصر رہے ہیں۔ مگر اس کا جواب یہ ہے کہ ما
بعد کے شعرا ماقبل میں نوجوان اور نو آموز تھے، اور اس وقت انھوں
نے کوئی شہرت حاصل نہیں کی تھی، اور دور ماقبل کے شاعر کہن
سال، مشاق اور مشہور تھے۔'' [۲۰]

سکسینہ کے مطابق مذکورہ دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نظم اردو کو دربار کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا، حالاں کہ اس دور سے قبل کے شعرا بھی اپنے سرپرستوں سے انعام واکرام، وظیفے اور تنخواہ لیتے تھے، مگر اپنی خودداری کو قائم رکھتے تھے، اور اپنی حیثیت کبھی ایک ملازم کی نہیں سمجھتے تھے۔ اس دور کی شاعری کا صرف یہ کام رہ گیا کہ اس سے امیر و رئیس خوش کیے جائیں، جس کی وجہ سے ان شعرا کی قدر اور سرپرستی میں اضافہ تو ہوا، لیکن ان کی عزت و آبرو میں کمی آ گئی اور یہ اس دور کی سب سے بڑی خرابی ہے۔

اس باب میں انشاؔ، مصحفیؔ، جرأتؔ، رنگینؔ، مرزا سلیمان شکوہ، بہادر شاہ ظفرؔ، قائم چاند پوری، ممنونؔ، حسرتؔ، حزیںؔ اور راسخؔ عظیم آبادی جیسے شاعروں کے کلام کی خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسی باب میں سکسینہ نے ریختی کا تعارف اور چند ہزل گو شعرا کے نام بھی دیئے ہیں۔

آٹھواں باب ''اساتذۂ لکھنؤ، ناسخؔ و آتشؔ کا زمانہ'' کے نام سے ہے۔ اس باب میں لکھنؤ کے طرز شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لکھنؤ اور دہلی کے طرز شاعری میں کیا فرق ہے؟ اس کو واضح کرنے کے لیے مصنف نے ان دونوں جگہوں کے شاعروں کے کلام کی خصوصیات کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ:

''طرز دہلی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جذبات کی تصویر سادہ اور پر
اثر الفاظ میں کھینچی جاتی ہے۔ تخیل اور جذبات پر رعایت لفظی کو مقدم
سمجھتے ہیں، ناسخؔ اور متبعین نے برخلاف اس کے اپنی تمام تر توجہ شعر کے
حسن ظاہری اور رعایت لفظی اور صنائع بدائع پر صرف کر دی۔'' [۲۱]

اس باب میں ناسخؔ اور آتشؔ کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے، جب کہ دوسرے شعرا مثلاً برقؔ، بحرؔ، خواجہ وزیرؔ، رشکؔ، مہرؔ، رندؔ، خلیلؔ، نسیمؔ، صباؔ وغیرہ کا ذکر مختصر کیا گیا ہے۔

نواں باب ''دربار لکھنؤ اور اس کے شعرا'' سے متعلق ہے۔ اس میں آصف الدولہ، نواب وزیر علی خان، نواب سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر، واجد علی شاہ وغیرہ کے مختصر تعارف کے ساتھ ساتھ نمونۂ کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔

دسواں باب ''مرثیہ اور مرثیہ گو'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب کے ابتدا میں مرثیہ کی تعریف اور اس کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے، اور اس صنف کے مشہور و معروف شعرا کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے رام بابو سکسینہ نے دونوں کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ ان کے مطابق انیسؔ کی خاص توجہ زبان کی صفائی اور حلاوت، بندش کی چستی اور محاورے کی درستی پر ہے۔ اس کے برخلاف مرزا دبیرؔ کے یہاں جدت خیال، بلند تخیل، نئی نئی تمثیلیں اور پر شکوہ الفاظ زیور کلام ہیں۔ سکسینہ دونوں کا تقابلی جائزہ لینے کے بعد آخر میں یہ لکھتے ہیں:

> ''ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ایک فضول سی بات ہے اس معاملے میں آخری فیصلہ کن چیز ادبی ذوق ہے، اور ہر شخص کا ذوق الگ الگ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں یہ بات داخل فیشن ہوگئی ہے کہ دبیرؔ کے کلام کو کم کر کے دکھایا جائے، اور ان کا مرتبہ انیسؔ سے بہت کم رکھا جائے، مگر حق یہ ہے کہ دبیرؔ بھی مثل انیسؔ کے مسلم الثبوت استاد تھے۔'' ۲۲

گیارہواں باب ''نظیرؔ اکبرآبادی اور شاہ نصیرؔ دہلوی'' سے متعلق ہے۔ سکسینہ نے اپنی کتاب میں پہلی بار نظیرؔ اکبرآبادی کی عظمت اور اہمیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس سے پیشتر تذکروں میں نظیرؔ کو معمولی درجے کا شاعر سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ چوں کہ اس دور کی عام شعری روایت سے ہٹ کر نظیرؔ عوامی زبان میں شاعری کرنا پسند کرتے تھے، اور یہ چیز اس دور کے شعرا اور تذکرہ نگار پسند نہیں کرتے تھے، اور نظیرؔ کو عوامی اور بازاری شاعر سمجھ کر نظر انداز کر دیتے تھے۔ یہ سکسینہ کا کمال ہے کہ انھوں نے نظیرؔ کی فنی خوبیوں کو سمجھا اور ایک باقاعدہ اہم شاعر مان کر ان کی طرف توجہ کی۔ اور یہ لکھا:

> ''نظیر بڑے پائے کا شاعر نہ سہی ......مگر بایں ہمہ وہ خاص ہندوستانی شاعر ہے، اور ہندوستانی مضامین پر لکھتا ہے۔ ہندوستانی جذبات اس کے دل میں خوش زن ہیں ......اپنے متنوع مضامین، اپنی ناصحانہ روش، اپنی وسیع النظری ......اپنی خالص ہندوستانیت اور علی الخصوص ایک جدید رنگ کی ایجاد کے سبب سے نظیر پوری طرح اس کا مستحق ہے کہ اس کو شعرائے اردو کی محفل میں ایک ممتاز جگہ دی جائے۔'' ۲۳؎

گیان چند جین کے مطابق ''تنقید میں سکسینہ کی اس دور بینی کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے ترقی پسندوں سے پہلے نظیر اکبر آبادی کی اہمیت کی گرفت کی۔'' ۲۴؎ سکسینہ کی تاریخ کے بعد نظیر اکبرآبادی کو تاریخ کی کتابوں میں شامل کرنا ایک باضابطہ روایت بن گئی۔ سکسینہ کے بعد ڈاکٹر اعجاز حسین اور گراہم بیلی نے اپنی تاریخ میں جگہ دی اور بعد میں آنے والے ادبی مورخوں نے بھی نظیر کو ایک بڑا اور اہم شاعر مان کر اپنی تاریخ میں شامل کیا۔ اسی باب میں شاہ نصیر کا بھی ذکر ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر افشاں زوار لکھتی ہیں:

> ''(اس باب میں) نظیر کے ساتھ نصیر دہلوی کا جوڑنا مناسب لگتا ہے، مگر شاہ نصیر کا ذکر دور متقدمین اور دور متوسطین کے بیچ کی کڑی ہونے کی وجہ سے علاحدہ سے کیا گیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ نظیر اور شاہ نصیر میں کسی بھی نوعیت کی کوئی مماثلت نہیں ہے۔''

بارھواں باب ''طبقۂ متوسطین، شعرائے دہلی، ذوق و غالب کا زمانہ'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں ذوق اور غالب کے علاوہ مومن خاں مومن، شیفتہ، تسکین، نسیم دہلوی، مجروح اور آزردہ، وغیرہ شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ذوق اور شاہ نصیر کے معرکے کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ تیرھواں باب ''دربار رام پور و حیدرآباد، امیر و داغ کا زمانہ'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں فرخ آباد، عظیم آباد، مرشدآباد، حیدرآباد کے علاوہ فیض آباد، ٹونک، منگرول اور بھوپال جیسے چھوٹے مراکز کا ذکر ملتا ہے۔ حالاں کہ یہ ذکر خاصا مختصر اور سرسری سا ہے، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے پہلے اور بعد کی تاریخی اور نیم تاریخی کتابوں میں کہیں اس طرح ان مراکز کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ سکسینہ نے صرف ان مراکز کا ذکر ہی نہیں کیا بلکہ یہ دکھانے کی بھی کوشش کی ہے کہ ان

مراکز میں آباد شعرا کے یہاں کون کون سی چیزیں مشترک تھیں۔اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اس اجتماع شعرا کا یہ نتیجہ بہت اچھا ہوا کہ دلّی اور لکھنؤ کے مختلف طرز آپس میں مل گئے اور ایک نئے طرز کی بنیاد پڑی جس کی ابتدا نواب یوسف علی خاں کے زمانہ میں ہوئی تھی۔''۲۵

چودھواں باب ''اردو شاعری کا جدید رنگ، آزاد اور حالی کا زمانہ'' کے عنوان سے ہے۔اس باب کے ابتدا میں جدید رنگ شاعری کی خصوصیات کی وضاحت کی گئی ہے، اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انقلاب اور انگریزی تعلیم کا اردو شاعری پر کیا اثر پڑا۔ یہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف انگریزی شاعری کی خصوصیات سے مرعوب ہیں اور ان کو پسند کرتے ہیں۔اس کے بعد وہ اسی باب میں اردو ادب میں موجود تین طبقوں کا ذکر کرتے ہیں، ان کے مطابق پہلا طبقہ قدامت پسندوں کا ہے جو زمانۂ موجودہ میں ہوتے ہوئے زمانۂ قدیم کا دلدادہ ہے۔ دوسرا طبقہ پہلے کی ضد ہے اور یہ ہر مغربی چیز کا عاشق ہے، اور اپنے ملک کی پرانی روایات کو نظر حقارت سے دیکھتا ہے، مغربی شاعری کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔تیسرا طبقہ اعتدال پسندوں کا ہے جو قدیم و جدید دونوں طرزوں کی خوبیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان سے کام لیتا ہے۔سکسینہ کا اندازِ تحریر یہ بتاتا ہے کہ وہ اس آخری طبقہ کو پسند کرتے ہیں۔اس طبقہ میں حالیؔ، آزادؔ، اسماعیلؔ میرٹھی، سرورؔ جہاں آبادی، اکبرؔ الہ آبادی اور نادرؔ کاکوروی وغیرہ شامل ہیں۔

چودھویں باب کے ساتھ ہی حصۂ نظم ختم ہو جاتا ہے اور پندرھویں باب سے حصۂ نثر شروع ہوتا ہے۔ باب کا عنوان ''نثر اردو کی ابتدا اور ترقی'' ہے۔اس کے ابتدا میں اردو نثر کے آغاز وارتقا میں تاخیر کی وجہ بیان کی گئی ہے۔اس کے بعد دکنی میں قدیم اردو تصانیف ''معراج العاشقین، شرح مرغوب القلوب، جل ترنگ، گل باس، اور وجہی کی 'سب رس' کا ذکر ملتا ہے۔اس میں سکسینہ 'معراج العاشقین' کو خواجہ بندہ نواز کی تصنیف بتاتے ہیں، جب کی ڈاکٹر حسینی شاہد اور ڈاکٹر حفیظ قتیل دونوں نے اس بات کو تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ 'معرج العاشقین' خواجہ بندہ نواز کی تخلیق نہیں ہے۔''۲۶ شمالی ہند کی دو کتابیں 'دہ مجلس' اور 'نوطرز مرصع' کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔اس باب میں فورٹ ولیم کالج کے قیام اور اس سے اردو نثر کے تعلق کے اسباب بیان کیے گئے ہیں، ساتھ ہی کالج سے منسلک منشیوں کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں اٹھارہویں صدی میں جو قرآن پاک کے تراجم ہوئے اور اردو گرامر و لغات وغیرہ شائع ہوئیں اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

سولھواں باب ''نثر اردو کا دورِ متوسط اور دورِ جدید'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں فقیر محمد گویا، رجب علی بیگ سرور، غالبؔ، سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، حالیؔ، شبلیؔ، مولوی ذکاء اللہ، نذیر احمد، سید احمد دہلوی، مولوی عبدالحق وغیرہ کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ حالیؔ، شبلیؔ، آزاد اور سرسید احمد خاں کے حالات اور ان کے کارنامے کو رام بابو سکسینہ نے خاصا تفصیل سے بیان کیا ہے۔

سترہواں باب ''اردو ناول کی ابتدا، سرور اور سرشار کا زمانہ'' کے عنوان سے ہے۔ اردو ناول کا تعارف بطور صنف اسی کتاب میں ملتا ہے۔ ساتھ ہی کئی ناول نگار مثلاً سرشار، راشد الخیری، نیاز فتح پوری، خواجہ حسن نظامی اور پریم چند وغیرہ کو شامل کیا گیا ہے۔ اس باب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اس دور کے ایک بڑے مطبع منشی نول کشور پریس کی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد 'داستان امیر حمزہ'، 'بوستان خیال' اور 'فسانۂ عجائب' کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ مولوی نذیر احمد کا ذکر اس باب میں بطور ناول نگار کے سرسری طور پر کیا گیا ہے۔ بہ حیثیت اردو کے پہلے ناول نگار کے جو اہمیت و مقام دینا چاہیے وہ نہیں دیا گیا ہے۔ نذیر احمد کے مختصر تعارف کے بعد اودھ پنچ اور اس میں مضامین لکھنے والے مرزا مچھو بیگ عاشق، تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد، وغیرہ کا تعارف بھی پیش کیا گیا۔ بقول افشاں زوار ''یہ وہ لوگ ہیں جو کسی بھی طرح ناول نگار نہیں کہلا سکتے۔ ان کا تعارف ناول کے باب میں عجیب اور بھرتی کی چیز محسوس ہوتا ہے۔ اس شتر گربگی کے باعث اس باب کی خوبصورتی ختم ہوگئی ہے۔''[۲۷]

اٹھارہواں باب ''اردو ڈرامہ'' کے عنوان سے ہے۔ ابتدا میں ڈرامے کا پس منظر بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد اردو ڈرامہ کے عناصر، اس کی اقسام اور اس میں موجود نقائص وغیرہ کی بحث ملتی ہے۔ علاوہ ازیں انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے ڈرامہ نویسوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ کتاب کا یہ باب بھی سترہویں باب کی طرح ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ اردو ناول کی طرح اردو ڈارمے کا ذکر بھی اس سے قبل لکھی گئی کتابوں میں نہیں ملتا۔

انیسواں باب ''زبان اردو کی خاص خوبیاں اور اور اس سے متعلق بعض اہل الرائے لوگوں کی قیمتی

رائیں‘‘ سے متعلق ہے۔اس باب میں اردو زبان کی اہمیت اور اردو کا دیسی زبانوں کے مقابلے میں کیا مقام و مرتبہ ہے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔کتاب کے آخر میں ’’ضمیمہ تاریخ ادب اردو‘‘ ہے،جس میں نظؔر لکھنوی، چکبسؔت اور اقبالؔ کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

مذکورہ ابواب اور اس میں شامل موضوعات سے بہ خوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رام بابو سکسینہ نے اس کتاب کو مکمل ادبی تاریخ بنانے کے لیے کس حد تک محنت کی ہوگی۔یہ اس دور کی پہلی کتاب ہے جس میں نظم اور نثر دونوں کا ساتھ ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔مرزا محمد عسکری اپنے ’’التماس مترجم‘‘ میں اس کتاب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ’’مجموعی حیثیت سے آج جب اس کتاب کو دیکھا جاتا ہے تو تنہا اس کے اندر وہ تمام چیزیں نظر آتی ہیں، جو ایک ادیب کی معلومات کے لیے سرمایۂ ناز ہیں۔یعنی زبان اردو کی پیدایش ہندی بھاشا اور دوسری زبانوں سے اس کا ارتباط واتحاد......تمام اصناف نظم پر روشنی......نثر اردو کے مشہور مصنفین، ان کی تصانیف پر نقد وتبصرہ......غرض کہ سبھی کچھ ان اوراق پریشاں میں موجود ہیں۔‘‘ ۲۸

مرزا عسکری نے بالکل سچ لکھا ہے کہ ان اوراق پریشاں میں سبھی کچھ موجود ہے،لیکن تمام مباحث کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس لیے یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ کتاب میں سبھی کچھ تو ہے لیکن مکمل طور پر نہیں ہے۔اگر چہ مترجم اور بعد کے مرتبین نے حواشی اور تعلیقات سے یہ کمی بڑی حد تک پوری کر دی ہے۔یہی وجہ ہے ایک عام قاری جو ایک بار اس کا مطالعہ شروع کر دے تو کتاب کی دلچسپیاں اسے اختتام تک پڑھنے پر مجبور کر دیتی ہیں،اور اس کے بعد وہ اردو زبان و ادب کے بارے میں ایک مربوط تصور قائم کر لیتا ہے،لیکن بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار:

> ’’ایک ایسے طالب علم کے لیے جسے اردو ادبیات کے گوناگوں مسائل کا جائزہ لینا ہوتا ہے، یہ تاریخ کچھ الجھنیں بھی پیدا کر دیتی ہے،جن سے بچ کر نکلنا اور صحیح نتیجے پر پہنچنا اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔اس میں

بعض الجھنیں تو نظریاتی اختلاف سے پیدا ہوتی ہیں اور بعض بیانات
کے تضاد سے، اور بعض تحقیقی اغلاط سے۔"[۲۹]

اس نوعیت کی بعض اغلاط کی نشان دہی ڈاکٹر مختار الدین آرزو نے ایک پر از معلومات تحقیقی و تنقیدی مقالے "تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ" مشمولہ 'ادبی دنیا' لاہور بابت دسمبر ۱۹۴۰ء میں کی ہے۔ اس طویل مقالے کے پہلے حصے میں ڈاکٹر مختار الدین آرزو نے ان اغلاط سے بحث کی ہے جو کتاب پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے کھٹکنے لگتی ہے۔ انہوں نے اغلاط کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ہی اس کی تصحیح بھی کی ہے۔ ان میں سے چند کا ذکر ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) مولف سید عبدالولی عزلت کو دکنی شاعر سمجھتے ہیں، یہ صحیح نہیں، وہ سورتی تھے۔

(۲) محمد قلی قطب شاہ کا تخلص فارسی میں قطب شاہ اور اردو میں معنی لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کے اردو کلام میں تخلص قطب شاہ موجود ہے۔

(۳) شاہ میراں جی حسن خدا نما کے رسالے کا نام "شرح مرغوب القلوب" لکھا ہے، میرا موجودہ علم یہ ہے کہ ان کے رسالے کا نام "شرح تمہید ہمدانی" ہے۔

(۴) مولف کے نزدیک شاہ نصیؔر سوؔدا کے شاگرد ہیں، ہمارا موجودہ علم یہ ہے کہ نصیؔر مائل کے شاگرد تھے، اور مائل بعض تذکرہ نویسوں کے قول کے مطابق شاگرد سوؔدا کے تلامذہ میں تھے۔

(۵) مولف کے مطابق میر باقر حزیؔں نواب سعادت جنگ عظیم آبادی کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ سعادت جنگ نامی کوئی رئیس پٹنہ میں نہ تھے، اور نہ حزیؔں اس نام کے کسی رئیس کے ملازم تھے۔

(۶) مولف عین الدین گنج کو بھی اردو مصنفین میں شمار کرتے ہیں۔ ان کی کوئی تصنیف دیکھے بغیر مصنف بنا دیا۔ بڑی جرأت کا کام ہے۔ ان کی تصنیف اردو میں اب تک نہیں پائی گئی ہے۔

اس کے بعد مختار الدین آرزو نے اپنے مذکورہ مضمون میں آگے چل کر تقریباً (۱۰۰) مزید اغلاط کی نشان دہی کی ہے، جن کے مطالعے کے بعد ڈاکٹر صاحب کی نظر کی گہرائی اور تنقیدی بصیرت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

اب جب کہ تحقیق کا فن پہلے کے مقابلے بے حد ترقی کر چکا ہے اور نئے مواد و ماخذات کی دستیابی سے "تاریخ ادب اردو" کے تاریک گوشے منور ہو چکے ہیں، کئی غلطیوں کی تصحیح اور کئی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو چکا

ہے۔ پھر بھی رام بابو سکسینہ کی یہ تصنیف اپنے پرانے اسلوب کے ساتھ زندہ ہے تو اس میں سکسینہ اور عسکری کے بعد اس کتاب کے دیگر مرتبین کی کوششوں کا بھی بڑا دخل ہے۔ خاص طور پر تبسم کاشمیری کا، کیوں کہ انہیں کی تعلیقات اور ترتیب نے اس مفید کتاب کو مفید تر بنا دیا اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا۔

اے ہسٹری آف اردو لٹریچر۔ گراہم بیلی

گراہم بیلی کی یہ تصنیف ''اے ہسٹری آف اردو لٹریچر'' انگریزی زبان میں ہے۔ اور تاریخ ادب اردو کے ضمن میں یہ پہلی کوشش ہے۔ اس سے قبل انگریزی زبان میں اردو ادب کی تاریخ کسی نے مرتب نہیں کی۔ پہلی کوشش کے حوالے سے بیلی کی کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ بیلی کے علاوہ دوسرے مستشرقین نے بھی مختلف شعرا و ادبا پر تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے ہیں جن کے ذریعے اردو قارئین جدید ادبی تاریخ کے تصور سے واقف ہوئے۔ مگر گراہم بیلی کا شمار ان چند مستشرقین میں کیا جاتا ہے جنہوں نے پوری ایمان داری کے ساتھ برصغیر کے ادب، لسانیات بالخصوص اور اس کی تاریخ کو اپنی زبان میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ بیلی کی کتاب اسی نوعیت کی ایک تصنیف ہے جس کی تاریخی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۳۲ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کی اشاعت کی پوری تفصیل گیان چند جین یوں بیان کرتے ہیں:

> ''اے ہسٹری آف اردو لٹریچر' ہندوستان کی ''وراثت سلسلہ'' میں ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کے مقامات اشاعت کلکتہ، بمبئی، مدراس، لندن، نیویارک، ٹورنٹو اور ملبورن ہیں۔ گراہم بیلی کے وسائل کی داد دینی پڑتی ہے کہ ایک کتاب بیک وقت پانچ ملکوں کے سات شہروں سے شائع ہوئی۔ حیرت ہے کہ ان میں ہندوستان کا دارالسلطنت دہلی شامل نہیں۔''[۳۱]

گراہم بیلی کی کتاب کا اردو ترجمہ ''اردو ادب کی تاریخ'' کے نام سے ۱۹۹۳ء میں ترقی اردو بیورو دہلی سے شائع ہوا۔ گراہم بیلی کی کتاب کی جائزے کے لیے میرے پیش نظر یہی اردو ترجمہ ہے، جس کے مترجم و مرتب سید محمد عصیم ہیں جنہوں نے بقول شمس الرحمٰن فاروقی ''بڑی تندہی سے اس کتاب کا ترجمہ

کیا، اوراس طرح کیا کہ زبان کی سادگی، ایجاز اور قطعیت باقی رہی لیکن اردو کی سلاست کا بھی حق ادا ہو گیا۔''۳۲؎ بیلی کی کتاب میں جہاں جہاں حاشیئے یا تشریح کی ضرورت تھی مترجم نے بڑی حد تک ان کمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تحقیقی تسامح تھا وہاں مترجم نے اس کی نشان دہی کر دی۔ اس طرح جہاں سنین رہ گئے تھے وہاں حواشی میں نئی تحقیق کے مطابق سنین کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔

گراہم بیلی کی یہ تاریخ انتہائی مختصر ہے، اوراس کے مختصر ہونے کی وجہ مترجم سید محمد عصیم اپنے مقدمہ میں بتاتے ہیں کہ ''بیلی نے یہ کتاب آکسفورڈ پریس کی ''ہیرٹیج آف انڈیا سیریز'' کے لیے لکھی تھی۔ چوں کہ اس سلسلے کے تحت اختصار کو ترجیح دی جاتی تھی اس لیے ڈاکٹر بیلی نے اردو زبان و ادب کی تاریخ کو ۱۲۰/صفحات میں محدود کر دیا۔۳۳؎ ظاہر ہے کہ اس قدر مختصر ترین تاریخ میں اردو ادب کی تقریباً چھ سو سالہ تاریخ اور روایت کے ایک طویل تسلسل کا احاطہ کر لینا کسی بھی مورخ کے لیے آسا نہیں۔ لیکن بیلی نے ایک کوشش کی ہے۔ اب اس جائزے میں یہ دیکھنا ہے کہ وہ اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب رہے ہیں۔

کتاب کے دیباچے سے یہ پتا چلتا ہے کہ بیلی کی فراہم کردہ بیشتر ماخذ انیسویں صدی کے تذکرے ہیں۔ اپنے دیباچے میں بیلی جہاں ان ماخذ کا ذکر کرتے ہیں وہیں کئی ایسی مشکلات کا بھی تذکرہ کرتے ہیں جن کا سامنا انہیں اردو ادب کے مطالعے کے دوران کرنا پڑا۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

(۱) ابتدائی دور کے ادب کا بیشتر حصہ غیر مطبوعہ ہے اور اب ان مخطوطات کے طبع ہونے کی بھی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

(۲) اصل مخطوطہ تک رسائی ناممکن ہے اور ہمیں کتابوں میں موجود حوالوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔

(۳) تذکروں میں عموماً تاریخیں نہیں دی گئی ہیں اور جو تاریخیں دی گئی ہیں ان میں اکثر اختلاف پایا جاتا ہے۔۳۴؎

اس کے علاوہ اپنے دیباچے میں اردو کی اہم اصناف شاعری کا تعارف کراتے ہیں تا کہ انگریز قارئین ان سے واقف ہو جائیں، وہ نامور شعرا کی ایک فہرست بھی شعری اصناف کے حوالے سے تیار کرتے ہیں جس میں شاعروں کو وہ اپنی پسند کے مطابق جگہ دیتے ہیں۔ مثلاً پہلا گروہ ''عظیم ترین شعرا'' کا ہے۔ جس میں میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، اقبال، ولی، سودا، نظیرؔ اکبر آبادی درد وغیرہ شامل ہیں۔ دوسرا گروہ ''بہترین غزل گو شعرا'' کا ہے اس میں بیلی نے میرؔ، ولیؔ، دردؔ، غالبؔ، مصحفی، داغ وغیرہ کو جگہ دی ہے۔ تیسرا

گروہ ''بہترین قصیدہ نگار'' کا ہے۔اس گروہ میں سوداؔ، ذوقؔ اور نصرتی شامل ہیں۔ چوتھا گروہ ''مرثیہ نگار'' اور پانچواں ''بہترین مثنوی نگار'' کا گروہ ہے۔مرثیہ نگار میں انیسؔ و دبیر کے علاوہ دکنی شاعر ہاشم اور مرزا کو بھی شامل کیا گیا ہے۔اس طرح ،مثنوی نگار میں میر حسن، میر اثر،نسیم ،مومن اور دکنی شعرا میں سے غواصی، نصرتی،طبعی اور وجہی کو جگہ دی ہے۔ چھٹا گروہ بیلی کے مطابق ان شاعروں کا ہے جو عام شاعری میں عمومی کمال رکھتے تھے۔ پھر مؤلف مذکورہ ترتیب یا گروہ بندی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہاں ظاہر کیے گئے خیالات قطعیت کے دعوے کے ساتھ نہیں پیش کیے گئے ہیں بلکہ انہیں رہنمائی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔دکنی شعرا کی شمولیت حیران کن ہوسکتی ہے کیوں کہ شمالی ہندوستان میں ان کی عظمت کا احساس نہیں پایا جاتا۔قدیم تذکرہ نگاروں نے ان کے بارے میں کچھ نہیں لکھا ہے۔'' ۳۵

پھر وہ اپنے مختصر دیباچے میں اس کتاب کی تین امتیازی خصوصیات کا ذکر کرتے ہیں۔(۱) اردو کی ابتدا اور اس کی ابتدائی تاریخ سے متعلق نظریات اس سے قبل لکھی گئی کتابوں کے مصنفین سے بہت مختلف ہیں (۲) دکن اور دکنی ادیبوں سے متعلق پیش کیے گئے بیشتر خیالات نئے ہیں (۳) تحسین کی نوطرز مرصع، میر امن کی ''باغ و بہار'' اور امیر خسرو سے منسوب ''چہار درویش'' پر بھی نئی معلومات فراہم کی گئی ہیں ۳۶ مولوی عبدالحق نے گراہم بیلی کی اس کتاب پر تبصرہ کیا ہے جو ان کے مجموعے ''تنقیدات عبدالحق'' میں شامل ہے۔اس تبصرے میں گراہم بیلی کے ان دعووں کو انہوں نے رد کیا ہے۔ان کے مطابق جہاں تک پہلے دعوے کا تعلق ہے وہ کلیتاً پروفیسر شیرانی کی محققانہ تالیف ''پنجاب میں اردو'' سے ماخوذ ہے۔دوسرا دعویٰ رسالہ 'اردو' کے مضامین یا شمس اللہ القادری کی کتاب ''اردوئے قدیم'' یا ان دونوں کے خوشہ چینوں سے منقول ہے۔اور تیسرا دعویٰ مولوی عبدالحق کے مقدمہ 'باغ و بہار' کا رہین منت ہے۔ ۳۷ گیان چند جین نے اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں بیلی کی اس کتاب کا تجزیہ پیش کیا ہے۔جس میں وہ مولوی عبدالحق کے تبصرے کے متعلق یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب اپنے تبصرے میں ان تینوں دعووں پر بہت خفا ہیں۔وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب بغیر اعتراف کے دوسروں کی تحریر سے ماخوذ

ہے۔ پھر گیان چند جین بیلی کے دعووں کی توضیح پیش کرتے ہیں اور یہ توضیح مناسب حال بھی معلوم ہوتی ہے، مثلاً:

(۱) بیلی پنجاب میں قیام کر چکے ہیں بہت ممکن ہے کہ وہاں انہوں نے محمود شیرانی سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال کیا ہو۔

(۲) بیلی نے کتابیات میں ''اردوئے قدیم''، ''دکن میں اردو' عبدالجبار آصفی کے تذکرے ''محبوب الزمن'' ڈاکٹر زور کی ''اردو شہ پارے'' اور رام بابو سکسینہ کی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' کو شامل کیا ہے۔ اپنے ماسبق مصنفوں سے سبھی فائدہ اٹھاتے ہیں، بیلی نے اسے پوشیدہ نہیں رکھا۔

(۳) مولوی صاحب کی مرتبہ 'باغ و بہار' ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی لیکن ان کا مضمون 'باغ و بہار' رسالہ 'اردو' جولائی ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا۔ بیلی نے اپنی تاریخ ۱۹۲۰ء میں مکمل کر دی تھی۔ نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے اس مضمون سے استفادہ کیا کہ نہیں۔'' ۳۸؎

تمہید کے بعد کتاب کا پہلا باب ''اردو ادب کی تاریخ'' سے شروع ہوتا ہے۔ اس باب میں اردو کے آغاز اور لفظ 'اردو' پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ بیلی کے مطابق اردو کی ابتدا لاہور میں ہوئی ہے اور اس کی بنیادی زبان کھڑی بولی یا برج بھاشا نہیں بلکہ قدیم پنجابی ہے۔ اسی طرح بیلی کے نزدیک اردو کے ارتقا کے دو دور ہیں۔ ایک دور وہ جب ۱۰۲۷ء کے قریب محمود غزنوی اپنی فاتح فوج کے ساتھ لاہور میں قیام پذیر ہوا، تو اس وقت لاہوری اردو کا آغاز ہوا جو قدیم پنجابی اور فارسی کی آمیزش سے بنی تھی، اور دوسرا دور ۱۱۹۳ء میں شروع ہوا جب قطب الدین ایبک نے دہلی پر قبضہ کیا، اور اس کی افواج یہیں سکونت پذیر ہو گئیں۔ اس وقت لاہوری اردو پر قدیم کھڑی بولی کی تہہ چڑھنے لگی جس کی وجہ سے دہلوی اردو کا آغاز ہوا۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق بیلی نے پنجابی اور اردو کے مزاج کے بنیادی اختلافات کی طرف توجہ نہیں کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیلی حافظ محمود شیرانی سے متاثر ہوئے ہیں۔ کیوں کہ محمود شیرانی کا نظریہ بھی یہی تھا۔

دوسرا باب ''اردو کی ابتدائی تاریخ'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اوّل: مذہبی، دوم: ادبی۔ مقدم الذکر مذہبی دور میں ۱۹/صوفیا کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں شیخ عین الدین گنج العلم، خواجہ بندہ نواز، عبداللہ حسینی، میراں جی، شیخ فرید الدین گنج شکر، باجن، شیخ خوب محمد وغیرہ شامل

ہیں۔ یہ دور ۱۳۵۰ تا ۱۵۹۰ء پر محیط ہے۔اسی طرح ادبی دور میں ۳۷ اہل قلم کا تعارف پیش کیا گیا ہے، جن میں قطب شاہی، عادل شاہی اور مغلیہ دور کے شعرا شامل ہیں۔ یہ دور ۱۵۹۰ء تا ۱۷۳۰ء پر محیط ہے۔ بقول بیلی ''اس باب میں اردو ادب کے ابتدائی ۳۸۰ برسوں پر بحث کی گئی ہے۔''اس بحث کے دوران بیلی کے کئی بیانات ایسے نظر آتے ہیں جو اب درست نہیں مانے جاتے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بیلی کے زمانے تک تحقیق بہت تشنہ تھی۔اب جدید تحقیق کی روشنی میں بہت سی چیزیں صاف اور واضح ہو چکی ہیں۔مولوی عبدالحق اور گیان چند جین دونوں نے اپنے تبصرے میں بیلی کے ان بیانات کو نشان زد کیا ہے اور اس کی تصحیح کی ہے۔اسی طرح مترجم محمد عصیم نے بھی کتاب میں جہاں تحقیقی تسامح تھا اس کی نشان دہی اور تصحیح کرنے کوشش کی ہے۔

تیسرا باب ''دہلی میں اردو شاعری کی اوّل صدی'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں ۱۷۳۰ء سے ۱۸۳۰ء تک کے ادب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ باب کے ابتدا میں سیاسی و ادبی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ بیلی کے مطابق محمد شاہ کے عہد میں بہت سے شعرا ایسے تھے جو فارسی گو تھے مگر منھ کا مزہ بدلنے کے لیے کبھی کبھی ایک مصرع یا ایک شعر کے لیے اردو زبان استعمال کر لیا کرتے تھے۔اس ضمن میں وہ خان آرزو کا ذکر کرتے ہوئے ان سے دو کتابیں منسوب کرتے ہیں، ایک ''نوادر الفرض'' اور دوسری ''غرائب اللغات'' مقدم الذکر کا اصل نام ''نوادر الالفاظ'' ہے جسے بیلی نے ''نوادر الفرض'' لکھ دیا ہے۔اور کتاب ''غرائب اللغات'' خان آرزو کی تصنیف نہیں بلکہ عبدالواسع ہانسوی کی تصنیف ہے۔ ۳۹

اس صدی کو بیلی نے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور شاہ حاتم کا ہے۔اس دور کی نمایاں خصوصیات بیلی کے نزدیک پاکیزہ اور شائستہ زبان اور متاثر کرنے والے عشقیہ مضامین ہیں۔ دوسرا دور مرزا مظہر، سودا، میر اور درد کا ہے۔اس دور کی خصوصیت زبان کی پختگی اور تصوف کا گہرا رنگ ہے۔ تیسرا دور مصحفی، انشا اور نظیر اکبر آبادی کا ہے۔ بیلی کے مطابق اس دور کی شاعری کے مضامین میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔اسی باب میں وہ سودا کے خطاب اور ان کے غلام کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''آصف الدولہ نے سودا کا وظیفہ مقرر کیا اور ان کو ملک الشعرا کا خطاب دیا......سودا کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ جہاں جاتے ان کا نوکر قلم دوات لیے ان کے ساتھ رہتا، اگر کبھی سر راہ انہیں کسی شخص کی

حرکت ناپسند ہوتی یا غصہ آ جاتا تو وہ فوراً قلم دان اور کاغذ طلب کرتے
اور وہیں اس کی ہجو لکھنا شروع کر دیتے۔''۴۰

مولوی عبدالحق ان دونوں باتوں کا ذکر اپنے تبصرے میں کرتے ہیں۔ان کے مطابق ملک الشعرا کا خطاب سوؔدا کو آصف الدولہ نے نہیں دیا بلکہ یہ خطاب انہیں ۱۱۶۵ھ سے قبل دربار دہلی سے مل چکا تھا۔اسی طرح سوؔدا کے غلام (غنچہ) کا ذکر سوائے 'آبِ حیات' کے کسی اور تذکرے میں نہیں ملتا۔بقول مولوی عبدالحق ''ڈاکٹر صاحب نے عجب مضحکہ خیز انداز میں اس کا ذکر خیر فرمایا ہے۔''۴۱

چوتھا باب ''۱۹ویں صدی میں لکھنؤ کی اردو شاعری'' کے عنوان سے ہے۔اس میں انیسویں صدی کے ۳۲ شعرائے لکھنؤ مثلاً ضمیؔر،خلیؔق، دیا شنکر نسیؔم، آتؔش، ناسؔخ، انیسؔ، دبیؔر، محمد خان رند، رشک وغیرہ شامل ہیں۔باب کے ابتدا میں دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کے حوالے سے مختصر بحث کی گئی ہے،اور دونوں کے درمیان کے فرق کو واضح کیا گیا۔اس بارے میں بیلی نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں ان پر عبدالسلام ندوی کی 'شعرالہند' اور سکسینہ کی 'تاریخ ادب اردو' کا رنگ نظر صاف آتا ہے۔مثلاً بیلی لکھنؤ اور دہلی کی شاعری کا فرق یہ بیان کرتے ہیں:

''ادبی نقطۂ نظر کے اعتبار سے دہلی اور لکھنؤ میں اختلاف تھا۔لکھنؤ کی شاعری دربار کی عکاسی کرتی تھی،اس نے حسن خیال کے مقابلے میں مرصع بیانی کو اپنا لیا......دہلی میں الفاظ کے مقابلے میں خیال اور موضوع کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔''۴۲

رام بابو سکسینہ دونوں کا فرق یوں بیان کرتے ہیں:

> ''طرزِ دہلی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جذبات کی تصویر سادہ اور
> پر اثر انداز میں کھینچی جاتی ہے......لکھنؤ کا طرزِ شاعری دماغ کو متوجہ
> کرتا ہے،مگر دل پر کوئی اثر نہیں کرتا۔''۴۳

اسی طرح عبدالسلام ندوی شعرائے لکھنؤ اور شعرائے دہلی کا فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شعرائے لکھنؤ اور شعرائے دہلی کے کلام میں معنوی طور پر جو چیز
> مابہ الامتیاز ہے وہ یہ ہے کہ شعرائے لکھنؤ کے کلام میں داخلی جذبات بہت

کم پائے جاتے ہیں اوران کی جگہ معشوق کے خارجی اوصاف ولوازم مثلاً
زلف وکاکل، خط وخال......وغیرہ کا ذکر کثرت سے آتا ہے۔'' ۴۴؎

پانچواں باب ''دہلی میں اردو شاعری کا دوسرا دور اور رام پور کے چار شعرا'' کے عنوان سے ہے۔اس میں دہلی کے دوسرے دور سے بحث کی گئی ہے، جس میں ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، بہادر شاہ ظفرؔ ،شیفتہ اور نکہتؔ وغیرہ کا مختصر ذکر کیا گیا ہے۔دوسرے حصے میں ''دربار رام پور'' کے ان چار شعرا میں امیر مینائی، داغ، تسلیم اور ضامن علی جلال شامل ہیں۔ان میں سے موخرالذکر دو شاعروں کی شہرت کو لے کر بیلی یہ تشویش ظاہر کرتے ہیں:

''یہ سمجھنا ذرا مشکل ہے کہ تسلیمؔ اور جلالؔ جیسے اشخاص کی شہرت کا دارو مدار کن خصوصیات پر ہے۔ان کے قصائد اورغزلیں روایتی انداز کی ہیں، اوران میں احساس کی گہرائی کے بجائے طرز ادا کی ندرت اور چستی ہے۔ان کی غزلوں میں سنگ دل اور سفاک محبوب کے خلاف راویتی شکوے شکایت اور عاشق دل فگار کے مصائب کا بیان ملتا ہے۔ان کے قصائد نئے طرز کے ہیں جن کا اس وقت تک رواج نہیں ہوا تھا۔'' ۴۵؎

چھٹا باب ''اردو نثر سے متعلق ہے، جسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔(۱)ابتدائی نثر نگار (۲)فورٹ ولیم کالج کے مترجمین (۳)انیسویں صدی کے اردونثر نگار۔

'ابتدائی نثر نگار' میں خواجہ بندہ نواز، شاہ میراں جی، وجہی اور عبداللہ وغیرہ جیسے بزرگوں کی قابل قدر تصانیف اوران کے اسالیب نگارش پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اسی حصے میں میر جعفرزٹلی، فضل علی فضلی، سوداؔ، محمد عطا تحسین وغیرہ کی نگارشات پر بھی بحث کی گئی ہے۔گیان چند جین کے مطابق جعفر زٹلی کو اس کے چند جملوں کے سبب اردو کے نثر نگاروں میں جگہ دی ہے۔حالاں کہ وہ اس کا مستحق نہیں تھا۔

دوسرے حصے میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ذکر کے بعد کالج کے اہم منشیوں مثلاً مرزا علی لطف، حیدر بخش حیدری، بہادر علی حسینی اور میر امن وغیرہ کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔اس باب میں انیسویں صدی کے نثر نگاروں میں دہلی کالج کے مترجمین کا ذکر نہیں۔اس پر مولوی عبدالحق اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مترجمین کا ذکر تو تفصیل سے کیا ہے لیکن دہلی کالج کے ورنیکلر ٹرانشلیسن سوسائٹی اور اس کے مترجمین کا مطلق ذکر نہیں کیا، حالاں کہ ان کا کام فورٹ ولیم کالج کے مترجمین سے کہیں زیادہ قابل قدر اور اہم تھا۔''۴۶؎

اسی حصے میں بیلی نے میر امن کے نثری اسلوب کے بارے میں لکھا ہے کہ ''نثر میں میر امن کا اسلوب میر تقی میرؔ کے شاعرانہ اسلوب سے مشابہت رکھتا ہے۔'' جس پر افشاں زوار یہ لکھتی ہیں:

> ''یہاں بیلی کی تنقیدی صلاحیت اور بصیرت نے ٹھوکر کھائی ہے۔اس لیے کہ میر امن کی تخلیقی صلاحیتوں کا میر تقی میرؔ کی شاعرانہ تخلیقی صلاحیتوں سے مقابلہ بے معنی چیز ہے۔کیوں کہ دونوں میں بہت فرق ہے......میرؔ آپ بیتی بیان کرتے ہیں اور میر امن جگ بیتی۔''۴۷؎

اس باب کے تیسرے حصے میں انیسویں صدی کے نثر نگاروں کو مطمح نظر رکھا ہے جن میں مولوی اسماعیل، شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر مذہبی ادب سے وابستہ ہیں۔ بعدزاں رشک فیض آبادی، مرزا جان طپش، انشا، رنگین، غالب، شبلی، سید احمد خاں وغیرہ کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ساتھ ہی اس وقت کے اہم ترین ناول نگاروں مثلاً مولوی نذیر احمد، سرشار اور شرر کے فکر و فن پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

ساتواں باب ''نیا دور'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں دور جدید پر بحث کی گئی ہے۔ یہ دور حالی، آزاد، درگا سہائے سرور، محسن کاکوروی اور شاد عظیم آبادی جیسے اکابرین ادب پر مشتمل ہے۔ باب کے ابتدا میں اردو زبان کا فارسی کے بوجھل اثرات سے آزاد ہونے اور انگریزی کے زیر اثر آ کر آسان ہونے کے حوالے سے بات کرتے ہوئے بیلی لکھتے ہیں:

> ''قدیم دبستان کے ساتھ ساتھ فکر و شعور کے ایک نئے دبستان نے جنم لیا ہے جو اردو کو ماضی کی بندشوں سے نجات دلا کر اسے شعری سچائی اور خلوص کے راستے پر لے جا رہا ہے۔ یہ تعلیم اور ادب کے وسیلے سے مرتب ہونے والے انگریزی اثرات کا نتیجہ ہے۔''۴۸؎

بیلی کے مطابق اس نئے دبستان کے نقیب حالی اور آزاد تھے، جنھوں نے کرنل ہالرائڈ کی تحریک پر ۱۸۷۴ء میں ایسے مشاعروں کا آغاز کیا جس میں جدید خیالات کی حامل نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ حالی کی مسدس 'مدر جزر اسلام' کو بیلی اردو کی سب سے بہترین نظم قرار دیتے ہیں۔

آٹھواں باب ''خلاصہ'' ہے۔ اس میں بیلی اپنی مغربی تہذیب اور مغربی ادب کو پیش نظر رکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں، اور یہ لکھتے ہیں کہ شاعرانہ زبان اور فارم کے لحاظ سے اردو پر انگریزی زبان و ادب کا اثر نظر نہیں آتا اور نہ کوئی تبدیلی ملتی ہے۔ ان کے مطابق اس تبدیلی میں سب سے بڑی رکاوٹ فارسی کا اثر ہے۔ بیلی کا خیال ہے کہ اگر آج اردو کے ادیب شیکسپیئر، ملٹن، ٹینی سن اور براؤننگ کا مطالعہ کریں تو وہ اپنے پڑھنے والوں کے لیے ایک نئی دنیا بھی تخلیق کر سکتے ہیں۔[۴۹] اس خلاصے میں صرف علامہ اقبال کا ذکر کیا گیا ہے۔ بیلی کے مطابق اب تک زندہ ادیبوں کا ذکر محض اشارتاً کیا جا رہا تھا لیکن ایک ایسے شاعر کا ذکر ضروری تھا جس کا شمار اردو کے اچھے شاعروں میں ہوتا ہے۔[۵۰] بیلی علامہ اقبالؔ کے احوال میں ان کا سنہ ولادت ۱۸۵۷ء لکھتے ہیں جو درست نہیں ہے، ان کا صحیح سنہ ولادت ۱۸۷۷ء ہے۔

'خلاصہ' کے بعد ترجمہ شدہ کتاب میں تعلیقات کا اضافہ کیا گیا، جس میں مترجم سید محمد عصیم نے لفظ 'اردو' سے متعلق ضروری معلومات فراہم کی ہیں۔ آخر میں توضیحی کتابیات ہے، جس میں اردو کی سترہ، فرینچ کی ایک اور انگریزی کی تین کتابوں اور ایک مضمون کی تفصیل ہے۔ بیلی نے محمد حسین آزاد کی کتاب 'آب حیات' مولانا عبدالسلام ندوی کی 'شعر الہند' شمس اللہ القادری کی 'اردوئے قدیم' حافظ محمود شیرانی کی 'پنجاب میں اردو' اور نصیر الدین ہاشمی کی 'دکن میں اردو' کو بالخصوص ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کتابوں میں جو معلومات فراہم کی گئی تھیں وہ اپنے دور کی تحقیقات کے مطابق درست تھیں، مگر موجودہ دور تک آتے آتے نئی تحقیقات کی روشنی میں آج بہت سی معلومات غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ لہٰذا بیلی کی تاریخ کی بھی یہی کیفیت ہے کہ وہ معلومات جو ان کتابوں کے حوالے سے بغیر تحقیق و تصدیق کے دی گئی ہیں وہ آج درست نہیں ہیں۔ مولوی عبدالحق اس کتاب کے حوالے سے چند سطروں میں اپنا مجموعی تبصرہ یو بیان کرتے ہیں:

> ''اس چھوٹی سی کتاب کو جس کا حجم سو صفحے سے زیادہ نہیں ایسے شاعروں کے ذکر سے جو اردو ادب میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے یا ابتدائی دور کے

ایسے اشخاص کے تذکرے سے جنہیں شاعر کہنا بد ذوقی کی دلیل ہے، زیر بار کرنا کسی طرح جائز نہ تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ بعض ایسے غیر معروف اور نا قابل لحاظ شاعروں کے نام آ گئے ہین جن کی کوئی کتاب یا نظم دستیاب نہیں ہوئی......اس قسم کی مختصر کتابیں جزوی تذکروں اور لا حاصل اسم شماری کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب ایک ادبی فہرست ہوگئی۔''۵۱

ڈاکٹر گیان چند جین نے بھی اپنی کتاب 'اردو کی ادبی تاریخیں' میں بیلی کی تاریخ کا ۲۲ صفحے پر مبنی تجزیہ پیش کیا ہے، لیکن ان کا انداز مولوی عبدالحق کی طرح جارحانہ نہیں بلکہ معتدلانہ ہے۔ انہوں نے بیلی کی تاریخ میں جہاں سنین کے تسامحات و بیانات کی گرفت کی ہے وہیں اس تاریخ کے اچھے پہلوؤں کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ انہوں نے تمام ابواب کا تفصلی وتنقیدی جائزہ لیتے ہوئے خامیوں کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ خوبیوں کو بھی سراہا ہے۔ ان کے مطابق اپنے اختصار کے سبب بیلی کی تاریخ کو چشم کم سے دیکھا گیا ہے۔ لیکن اس کی کثرت مواد کو دیکھا جائے تو یہ دو تین سو صفحوں کی کتاب سے کم نہیں۔۵۲

مختصر تاریخ ادب اردو- ڈاکٹر سید اعجاز حسین

ڈاکٹر سید اعجاز حسین کی کتاب ''مختصر تاریخ ادب اردو'' پہلی بار ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ اپنے دور کی خاصی مشہور ومقبول کتاب تھی، جس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں اعجاز حسین کا ترمیم شدہ ایڈیشن 'ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ سے شائع ہوا، جس میں مصنف نے کئی اہل قلم کا اضافہ کیا ہے، اور بعض ابواب کی ترتیب بھی ضرورت کے لحاظ سے تبدیل کی ہے۔ یہ ردو بدل اور ترمیم وتنسیخ کا سلسلہ ہنوز جاری تھا کہ اعجاز صاحب یکا یک بیمار ہوگئے۔ اس بیماری کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں:

''بیماری بڑھتی رہی، یہاں تک کہ قلم اٹھانے کی سکت و اجازت نہیں رہی، ایسی حالت میں ڈاکٹر محمد عقیل اور پروفیسر احتشام حسین کو تکلیف دی گئی کہ جو کام میں نہ کرسکا وہ لوگ کریں، چنانچہ دونوں حضرات نے

مدد کی، بعض ادیبوں اور شاعروں پر تنقیدی مضامین لکھے جو موجودہ
ایڈیشن (۱۹۶۴ء) میں شامل ہیں۔"۵۳

کتاب میں کہیں یہ صراحت نہیں کی گئی ہے کہ کون سے بیانات یا عبارتیں ڈاکٹر عقیل اور پروفیسر احتشام حسین نے اضافے کیے ہیں۔ سید حیدر علی نے اپنی کتاب "ڈاکٹر اعجاز حسین: حیات اور کارنامے" میں یہ لکھا ہے کہ ان کے پاس جامعہ اردو علی گڑھ سے شائع ہونے والا وہ ایڈیشن موجود ہے جس میں اضافہ کر کے ۱۹۶۴ء کا ایڈیشن تیار کیا گیا۔ اس میں عقیل صاحب نے اکثر ہجری سنہ کو عیسوی میں تبدیل کیا ہے، اور پروفیسر احتشام حسین نے بعض جگہوں پر عبارتوں کا اضافہ کیا ہے۔[۵۴] لیکن سید حیدر علی نے بھی یہ صراحت نہیں کی ہے کہ عقیل صاحب اور احتشام صاحب نے کن کن ادیبوں پر لکھا ہے۔

گیان چند جین کے مطابق ۱۹۶۴ء کے بعد اعجاز حسین نے اس تاریخ میں کوئی ترمیم نہیں کی، ۲۱ر فروری ۱۹۷۵ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ کتاب کی تیسری منزل ارتقا ڈاکٹر سید محمد عقیل کا ترمیم و اضافہ ایڈیشن ہے جو ۱۹۸۴ء میں جاوید پبلشرز، نشیمن الہ آباد سے شائع ہوا۔ جائزے کے لیے میرے پیش نظر یہی ایڈیشن ہے۔ اس میں ڈاکٹر سید عقیل نے نہ صرف متعدد اہل قلم پر لکھا ہے، بلکہ ہر دور کے ادیبوں کے احوال میں ترمیم اور اضافے بھی کیے ہیں۔ مگر انہوں نے کہیں یہ صراحت یا وضاحت نہیں کہ ہے کہ کون سے حصے ان کی تصنیف ہیں۔ گیان چند جین نے اپنی کتاب "اردو کی ادبی تاریخیں" میں ڈاکٹر عقیل کی ترمیم وتصحیح اور حذف و اضافہ کی نشان دہی کی ہے، جس کا ذکر ابواب کے جائزے کے درمیان کیا جائے گا۔

کتاب کے آغاز میں 'عرض حال' ہے، جس میں کتاب کی تالیف کا مقصد بیان کیا گیا ہے۔ اعجاز حسین کے مطابق تاریخ ادب پر کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جو ابتدائے آفرینش سے ان کے عہد تک حال بتا سکے۔ شاعروں اور نثر نگاروں پر انفرادی حیثیت سے کوئی تاریخ یا تبصرہ پیش کر سکے، علاوہ ازیں طلبہ کی بنیادی ضروریات کو پورا کر سکے۔ چنانچہ اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے اس کتاب کو ترتیب دی، اور کوشش یہ کی ہے کہ اختصار کے ساتھ پورے ادب کا احاطہ کریں، اپنی اس کوشش اور مقصد میں وہ بہت حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز حسین خود لکھتے ہیں:

"اس مختصر تاریخ میں اختصار کا پہلو حالات زندگی لکھتے وقت اور تنقید

کلام کے موقع پر بھی پیش نظر رہا ہے۔تنقید میں قریب قریب ہر جگہ اس
بات کی کوشش کی گئی ہے کہ مصنف کی کوئی امتیازی خصوصیت نظر انداز
نہ ہو،لیکن بات کو بڑھایا بھی نہ جائے،اگر ممکن ہوتو پارہ کو جملوں میں
اور جملہ کو چند لفظوں میں پرمعنی طریقے سے بیان کر دیا جائے۔''۵۵

ڈاکٹر اعجاز حسین نے اس تاریخ کی ترتیب میں ادوار کی تقسیم مبہم رکھی ہے،اوران ادوار کے تحت جن شعراوادبا کا ذکر کیا ہے،ان میں تاریخی، تہجی یا ابجدی کوئی بھی ترتیب نہیں ملتی۔مصنف کا اندازتحریر بھی تذکروں والا ہے۔یعنی ابتدا میں شاعر یا ادیب کا مختصر تعارف اور حالات زندگی کا بیان، پھر تصانیف کا مختصر جائزہ اور بس،اس دور کے سماجی وسیاسی حالات کیا تھے،اور شاعر یا ادیب پر اس کا کیا اثر ہوا،اس بارے میں مصنف کوئی وضاحت نہیں کرتے۔حالاں کہ ایسا جائزہ تاریخ ادب کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ سیاسی وسماجی پس منظر سے ہی ان محرکات کا جائزہ لیا جاتا ہے جو کسی شاعر یا ادیب کی تخلیقات کا باعث بنتے ہیں۔البتہ اعجاز حسین نے ہر دور کے آخر میں اس دور کی خصوصیات کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے جس کی وجہ سے اس کتاب میں تاریخ ادب کا رنگ جھلکتا ہے۔

اعجاز حسین کی کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔حصہ 'نظم' اور حصہ 'نثر' بقول افشاں زوار'' یہ اس دور میں لکھی جانے والی تمام ادبی تاریخوں کی مشترکہ خامی رہی ہے کہ ادب کو بطور ادب یا ایک اکائی کے نہیں لیا جاتا، بلکہ اسے شاعری اور نثر نگاری کے دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر کے بالکل علاحدہ کر دیا جاتا ہے۔جس سے نقصان یہ ہوتا ہے کہ ادب کی مجموعی صورت حال سامنے نہیں آتی اور ادب دو جزیروں کی صورت میں سامنے آتا ہے۔۵۶ یہی صورت حال اعجاز حسین کی کتاب کی بھی ہے۔اس میں بھی شاعری اور نثر کو دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔حصہ 'نظم' گیارہ ابواب پر مشتمل ہے،اور حصہ 'نثر' آٹھ ابواب پر۔حصہ 'نظم' کے پہلے باب کے ابتدا میں ''زبان کی ابتدا'' کی کہانی ملتی ہے،اوراس کے بعد دکن کے ۷ اشعرا کا تذکرہ ملتا ہے۔باب کے آخر میں ''دکن کی ابتدائی خدمات'' کے نام سے ایک عنوان قائم کیا گیا ہے،جس میں دکنی ادب اوراس کی مشہور اصناف مثنوی اور مرثیہ کا مختصر تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

اس باب میں خواجہ بندہ نواز سے پانچ رسالے منسوب کیے گئے ہیں، گیان چند جین کے مطابق

۱۹۶۴ء کے ایڈیشن میں ان پانچ رسالوں میں 'معراج العاشقین' کا ذکر شامل تھا۔لیکن ۱۹۸۴ء کے ایڈیشن میں ڈاکٹر سید محمد عقیل نے 'معراج العاشقین' کو حذف کر کے اس کی جگہ 'چکی نامہ' کا اضافہ کر دیا۔حقیقت یہ ہے کہ بندہ نواز نے اردو نثر میں کوئی رسالہ نہیں لکھا ہے، ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب ''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک'' کی جلد دوم میں خواجہ بندہ نواز سے منسوب اردو رسالوں کا جائزہ لیتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ خواجہ بندہ نواز کی کوئی اردو تصنیف موجود نہیں۔وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''خواجہ بندہ نواز نے اردو نثر میں کوئی رسالہ نہیں لکھا، ان کے قریب العصر کسی مصنف نے ان سے کسی اردو کتاب کا انتساب نہیں کیا۔ کاتبوں کا انتساب بالکل نا قابل اعتبار ہے، اس کے صرف بیسویں صدی کے اردو محققین یا تذاکرت صوفیا میں ان سے اردو کتابیں منسوب کی گئی ہیں، اس سے پیشتر نہیں۔''۵۷

خواجہ بندہ نواز سے منسوب رسالوں کا یہ بیان کتاب کے حصہ 'نظم' میں ہے۔اس کا ذکر حصہ 'نثر' میں کیا جانا چاہیے۔اسی طرح وجہی کی 'سب رس' کا ذکر بھی حصہ 'نظم' میں بے موقع ہے۔'سب رس' کے سلسلے میں نصیر الدین ہاشمی کی یہ رائے نقل کی گئی ہے:

> ''یہ کتاب غالباً وجیہ الدین گجراتی کی تالیف کا ترجمہ ہے، جس کو وجہی نے ۱۰۴۵ھ کو مرتب کیا''۵۸

گیان چند جین کے مطابق 'سب رس' کا وجیہ الدین گجراتی سے کوئی تعلق نہیں۔نصیر الدین ہاشمی کی یہ رائے ۱۹۶۴ء کے ایڈیشن میں بھی نقل کی گئی تھی، اور حیرت ہے کہ عقیل ایڈیشن (۱۹۸۴ء) میں بھی اس بات کو دہرایا گیا ہے۔اس باب میں سید اعجاز حسین نے ہاشمی کی ریختی گوئی کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔۱۹۸۴ء کے ایڈیشن میں اس کا ذکر عقیل صاحب کا اضافہ ہے۔اسی طرح غواصی کی مثنوی 'طوطی نامہ' اور شاہ امین الدین اعلیٰ کا ذکر بھی سید عقیل کا اضافہ کیا ہوا ہے۔

دوسرا، تیسرا، اور چوتھا باب شعرائے دہلی سے متعلق ہے۔دوسرے باب میں آبرو، ناجی، مضمون اور خان آرزو وغیرہ کا مختصر تعارف اور کلام کے نمونے پیش کیے گئے ہیں، اور آخر کے ڈیڑھ صفحہ میں اس

دور کی مجموعی خصوصیات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ بقول اعجاز حسین ''اس دور کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں ان شاعروں نے تکلف اور ابہام کو اپنا مطمع نظر نہیں بنایا اور وہاں کلام میں بے حد لطف اور اثر پیدا ہو گیا ہے۔''۵۹؎ اعجاز حسین کے مطابق اس دور میں ابہام گوئی کا غلبہ تھا اور پھر بعد میں یہ خامی شاہ حاتم اور مرزا مظہر کی کوششوں سے دور ہو گئی۔

اس باب میں مضمونؔ کے ذکر میں ان کا سنہ وفات ۱۷۴۷ء درج ہے جو غلط ہے۔ جمیل جالبی نے صراحت کی ہے کہ تاباںؔ کے قطعۂ تاریخ وفات کے مطابق مضمونؔ کا انتقال ۱۱۴۷ھ/ ۳۵-۱۷۳۴ء میں ہوا۔۶۰؎ اسی طرح مضمونؔ کے سلسلے میں ڈاکٹر عقیل نے یہ اضافہ کیا ہے کہ جو شعر ولیؔ کے نام سے مشہور تھا، وہ دراصل مضمونؔ کا ہے، شعر یہ ہے:

دل لیا مضمون کا دلّی نے چھین

جا کہو کوئی محمد شاہ سے۶۱؎

گیان چند جین کے مطابق عقیل صاحب نے پہلا مصرع درست نہیں لکھا ہے، حمید اورنگ آبادی کے تذکرہ ''گلشن گفتار'' میں پوری غزل درج ہے جس میں اس شعر کا پہلا مصرع یوں ہے۔ ؎

اس گدا کا دل لیا دلّی نے چھین

اسی طرح شفیق کے ''چمنستان شعرا'' میں ہے۔ ع

اس گدا کا دل لیا دلّی نے چھین۶۲؎

خان آرزو کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے مصنف ان کی ایک کتاب کا نام ''مسحر'' بتاتے ہیں، جب کہ گیان چند جین کے مطابق اس کا صحیح املا 'ث' سے ''مثمر'' ہے جسے ریحانہ خاتون نے مرتب کر کے کراچی یونیورسٹی سے شائع کیا ہے۔۶۳؎ یہ کتاب علم بدیع سے متعلق ہے۔

تیسرے باب میں شاہ حاتمؔ، مرزا مظہرؔ اور فغاںؔ کا ذکر ہے۔ اعجاز حسین کے مطابق یہ وہ شعرا ہیں جن کا بیان سیدھا سادا اور بڑی حد تک نیچرل ہے۔ جو جی پر گزرتی ہے مہذب اور مزے دار الفاظ میں کہہ جاتے ہیں۔ کتاب میں ان شعرا کا ذکر بہت سرسری طور پر کیا گیا ہے جس سے ان لوگوں کی خدمات کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو پاتا۔ چوتھا باب ان لوگوں کے تذکرے پر مبنی ہے جنھوں نے اردو شاعری کو اس مقام پر پہنچا

دیا کہ بعد کے آنے والے ان مقام تک پہنچنے کی حسرت دل میں لیے رہے۔ان شعرا میں سوداؔ۔ دردؔ، میر سوزؔ، میر حسنؔ، میر تقی میرؔ اور یقینؔ شامل ہیں۔اس دور کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے اعجاز حسین لکھتے ہیں:

''غزل کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں اس دور میں اس صنف شاعری کی جو ترقی ہوئی وہ ہر آنے والے عہد کے لیے باعث رشک رہی۔اس طرح پر یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو کی دنیا میں اس وقت وہ لوگ خامہ فرسائی کر رہے تھے جن کی نظیر مثنوی، قصیدہ اور غزل میں آج تک کوئی نہ ہو سکا۔'' ۶۴

پانچویں باب میں جرأتؔ، انشاؔ، مصحفیؔ اور آتشؔ شامل ہیں۔اس باب میں شعرا کا مختصر تعارف اور ان کی تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔انشاؔ کی ''دریائے لطافت'' کا سنہ تصنیف ۱۸۰۶ء دیا گیا ہے، گیان چند جین کے مطابق کتاب کے قطعۂ تاریخ سے اس کا سنہ تصنیف ۱۲۱۲ھ نکلتا ہے جو ۸-۱۸۰۷ء کے متوازی ہے۔۱۹۶۴ء کے ایڈیشن میں ''رانی کیتکی'' کا کوئی سنہ نہیں دیا گیا ہے۔۱۹۸۴ء کے ایڈیشن میں عقیل صاحب نے ۱۸۰۵ء لکھا ہے۔گیان چند جین اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ دراصل اس کتاب میں کہیں سنہ مذکور نہیں۔ڈاکٹر عابد پشاوری نے اپنی کتاب (انشاء اللہ خاں، ص:۴۴۴) میں ایک طویل بحث کے بعد ''رانی کیتکی'' کا سنہ تصنیف ۹۰-۱۷۸۸ء قیاس کیا ہے۔۶۵

چھٹا باب نظیرؔ اکبر آبادی کے لیے مختص ہے۔بقول افشاں زوار نظیر کی یہ اہمیت رام بابو سکسینہ کی مرہون منت ہے کہ انہوں نے اپنی تاریخ میں نظیر کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے الگ باب میں اس تذکرہ کیا، اور بعد میں آنے والوں کے لیے راہ کھول دی۔'' ۶۶ نظیرؔ کے یہاں جو شاعرانہ واقفیت اور بیان کی صداقت ملتی ہے اس میں اگرچہ خیال کی گہرائی اور تاثیر کے تیز نشتر نہیں لیکن پھر بھی وہ ہمیں یہ ماننے پر مجبور کر دیتی ہے کہ ہم نظیر کو ایسا شاعر مانیں جس نے اپنی نظم کا مواد روزانہ کی زندگی سے حاصل کیا اور اسے اپنے رنگ میں پیش کیا۔ڈاکٹر اعجاز حسین سکسینہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے مختصر لفظوں میں صحیح لکھا ہے کہ نظیرؔ میں سوداؔ کا زور، میرؔ کی بلند پروازی، انشاؔ کی ظرافت، انیسؔ و دبیرؔ کا جوش و خروش نہیں ہے مگر یہ سب صفات ان میں ایک حد تک ضرور پائی جاتی ہیں۔'' ۶۷

ساتواں باب شیخ امام بخش ناسخ، آتش، دیا شنکر نسیم، نصیر، ذوق، غالب، اور مومن سے متعلق ہے۔ اس باب میں مذکورہ شعرا کا مختصر تعارف اور ان میں سے چند کے کلام کا نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ گیان چند جین کے مطابق ناسخ کے بیان میں ڈاکٹر عقیل نے آخر کے ایک پیراگراف میں ناسخ کی مثنوی اور دواوین کے ناموں اور تاریخوں کا اضافہ کیا ہے۔ اس میں مثنوی 'سراج نظم' کی تاریخ سہو کتابت سے ۱۹۳۸ء چھپ گئی ہے۔ بقول گیان چند جین جو ۱۸۳۸ء ہونی چاہیے۔ مصنف ذوق کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی کے مطابق ذوق کے کلام میں کچھ غزلیں ان کے شاگرد محمد حسین آزاد نے بھی خود کہہ کر شامل کر دی ہیں۔ (ص:۱۰۶) ڈاکٹر گیان چند جین کا خیال ہے کہ یہ تحقیق ڈاکٹر تنویر احمد علوی کی نہیں ہے۔ اس کا انکشاف سب سے پہلے محمود شیرانی نے رسالہ 'ہندوستانی' میں ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کیا، بعد میں ڈاکٹر صادق اور اسلم فرخی نے بھی اسے منظور کیا۔ ۶۸ مرزا غالب کے دیوان کے سلسلے میں مصنف لکھتے ہیں:

> ''اردو میں ڈیڑھ جزو کا دیوان ہے جو متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۸۴۱ء میں دلّی سے ہوئی۔ اتنا مختصر دیوان اس وقت کسی دوسرے اردو شاعر کا نہ تھا۔'' ۶۹

گیان چند جین کے مطابق خوش قسمتی سے کالی داس گپتا رضا نے اس ایڈیشن کا عکس چھاپ دیا ہے۔ یہ ڈیڑھ جزو کا نہیں پورے ۱۰۹ صفحوں کا ہے۔ فائز دہلوی اور نسیم لکھنوی کے دیوان اس سے بھی زیادہ مختصر ہیں۔

آٹھواں باب ''امیر، داغ، جلال اور نوح ناروی'' سے متعلق ہے۔ اس باب میں ان شعرا کا تعارف اور ان کی تصانیف کا ذکر ہے، اور آخر میں اس دور کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ جلال کے ذکر میں ان کی بعض کتابوں کے نام لکھنے میں گیان چند جین کے مطابق دونوں مولفین (سید اعجاز حسین، ڈاکٹر سید عقیل) سے تسامح ہوا ہے۔ جلال کے دونوں دیوان کے نام 'کرشمہ جات سخن' اور 'نظم رنگین' لکھے ہیں۔ صحیح 'کرشمہ گاہِ سخن' اور 'نظم نگارین' ہیں۔'' ۷۰

نواں باب مرثیہ سے متعلق ہے۔ ابتدا میں مرثیہ کا پس منظر بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد انیس اور مرزا دبیر کا ذکر کیا گیا ہے۔ دسواں باب ''دور جدید'' کے عنوان سے ہے۔ اس دور جدید میں حالی، آزاد، اسماعیل میرٹھی، سرور، اکبر، شاد عظیم آبادی، نظم طباطبائی وغیرہ شامل ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کے

مطابق اس دور میں حالی اور آزاد نے شاعری میں نئی روح پھونک دی، یہیں سے اس دور کی بنا پڑی جس کا عہد حاضر بھی ممنون ہے۔شاعری میں ایسا انقلاب آیا کہ اردو کا شاعر حسن کی رسمی دنیا سے الگ ہو کر حقیقت پسندی کی طرف مائل ہوا، اور پھر معاشی وسیاسی پہلو پر بھی نظمیں لکھی جانے لگیں۔

گیارہواں باب ''دور حاضر'' سے متعلق ہے، یعنی مصنف خود جس دور میں موجود تھا۔ یہ باب سب سے طویل ہے اور اس میں پچاس (۵۰) سے زائد شعرا کا ذکر ملتا ہے۔جس میں عزیزؔ، اقبالؔ، چکبستؔ، حسرتؔ موہانی، فانیؔ، جوش ملیح آبادی، اصغرؔ، جگرؔ، یاس یگانہؔ، سردار جعفری، تاباںؔ اور خلیل الرحمٰن وغیرہ جیسے اکابر شعرا شامل ہیں۔ڈاکٹر سید اعجاز حسین اس دور کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''موجودہ دور کی غزلوں کی ایک امتیازی شان نفسیات کا مطالعہ اور انسان وزندگی کے متعلق پر لطف اظہار خیال کیا گیا ہے، مگر ایسے موقع پر کبھی کبھی شعرا کا قدم مہملیت کی طرف بھی پڑ جاتا ہے۔''[۱]

گیان چند جین کے مطابق اس باب میں تاباںؔ کے بعد کے تمام شعرا عقیل صاحب کا اضافہ ہیں۔ان اضافی شدہ شعرا میں ن-م راشد، میراجی۔ جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، سلام مچھلی شہری، پرویز شاہدی، وحید اختر، شہریارؔ، خلیل الرحمٰن اعظمی اور نشورؔ واحدی وغیرہ شامل ہیں۔''[۲]

تاریخ کا دوسرا حصہ 'نثر' کا ہے، جو باب اوّل سے شروع ہوتا ہے۔ابتدا کے چار صفحے میں فورٹ ولیم کالج سے پہلے کی نثر کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔گیان چند جین کے مطابق سید اعجاز نے ۱۹۶۴ء کے اڈیشن میں 'معراج العاشقین' کو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تصنیف بتایا ہے۔۱۹۸۴ء کے اڈیشن میں سید عقیل نے اس انتساب کو رد تو کیا ہے لیکن اسے خواجہ بندہ نواز کے نواسے سید محمد عبد اللہ حسینی کی تصنیف قرار دیا ہے۔حالاں کہ ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تحقیق اس اڈیشن سے قبل سامنے آچکی تھی کہ ''معراج العاشقین'' بہت بعد کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف ہے۔[۳] دوسری بات یہ کہ سید عقیل عبد اللہ حسینی کو خواجہ بندہ نواز کا نواسا بتاتے ہیں۔ (ص:۲۸۰) جب کہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ 'سیر محمدؐ' کے شجرے کے حوالے سے انہیں خواجہ بندہ نواز کی نواسی کا شوہر قرار دیتی ہیں، وہ اپنی کتاب ''اردو نثر کا آغاز وارتقا'' میں لکھتی ہیں:

''مولوی سید محمد اپنی کتاب 'ارباب نثر اردو' میں عبد اللہ حسینی کو خواجہ

صاحب کا نواسہ اور حکیم شمس القادری نے ''اردوئے قدیم' میں اور
ڈاکٹر زور'اردو کے اسالیب بیان' نیز 'اردو شہہ پارے' میں انہیں
خواجہ صاحب کا پوتا بتایا ہے۔ لیکن 'سیر محمد' میں حضرت گیسو دراز کا جو
شجرہ دیا گیا ہے اس میں عبداللہ حسینی کا نام خواجہ صاحب کی نواسی کے
شوہر کی حیثیت سے بتایا گیا ہے، اور عبداللہ حسینی سید ابوالمعالی کے
فرزند بتائے گئے ہیں۔''۴ے

نثر کی تاریخ کے بعد فورٹ ولیم کالج کا تعارف اور اس سے متعلقہ اہل قلم کا مختصر ذکر کیا گیا ہے۔ مصنف نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ کو فورٹ ولیم کالج کا منتظم اعلیٰ لکھا ہے۔ (ص:۲۸۴) جمیل جالبی کے مطابق وہ منتظم اعلیٰ نہیں بلکہ شعبۂ ہندوستانی کا پروفیسر تھا۔''۵ے

ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق ۱۹۸۴ء کے ایڈیشن میں ڈاکٹر سید عقیل نے فورٹ ولیم کالج کے کئی مصنفین کے بارے میں خاصے اضافے کیے ہیں۔ بالخصوص میر امن، للّو لال جی اور بینی نرائن جہاں ہیں، مصنف کے مطابق میر امن کا انتقال غالباً ۱۸۰۶ء میں ہوا۔ گیان چند جین لکھتے ہیں کہ یہ بے بنیاد بات ہے۔ ۶ے لیکن وہ کوئی وضاحت نہیں کرتے۔ جمیل جالبی کی تاریخ بھی اس سلسلے میں خاموش ہے۔ بس اس میں اتنا لکھا ہے کہ ۴/ جون ۱۸۹۶ء کو انہیں (میر امن) ملازمت سے سبک دوش کر دیا گیا۔ اس کے بعد پتا نہیں چلتا کہ میر امن کس حال میں رہے، کیا کرتے رہے اور کب اور کہاں انہوں نے وفات پائی۔ ۷ے

دوسرا باب ان اہل قلم سے متعلق ہے جو فورٹ ولیم کالج سے تعلق نہیں رکھتے تھے، مگر اسی دور میں اپنے قلم کا جادو جگا رہے تھے۔ ان میں فقیر محمد خاں گویا، مرزا رجب علی بیگ، غالبؔ، ماسٹر رام چندر اور واجد علی شاہ اخترؔ وغیرہ کا تذکرہ شامل ہے۔ تیسرا باب ''نثر کی ترقی'' کے عنوان سے ہے۔ ابتدا میں دہلی کالج کا تعارف پیش کیا گیا ہے، اس کے بعد سر سید احمد خاں، محسن الملک، چراغ علی، آزاد، حالی، مولوی ذکاء اللہ اور شبلی وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ آخر کے دو صفحہ میں ندوۃ العلما کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ گیان چند جین کے مطابق اس باب میں دہلی کالج کا بیان، حالی اور شبلی کی تصانیف کا ذکر سید محمد عقیل نے اضافہ کیا ہے۔

چوتھا باب ''ناول اور مختصر افسانہ'' سے متعلق ہے۔ اس باب میں تقریباً ۳۵ ادیبوں کا ذکر شامل

ہے۔ابتدا میں ناول اور مختصر افسانے کے آغاز کا پس منظر بیان کیا گیا ہے۔باب کا آغاز نذیر احمد کے تذکرے سے ہوتا ہے۔نذیر کے بعد سرشار،سرور،سجاد حسین،رسوا،راشد الخیری، پریم چند، بیدی، قرۃ العین حیدر وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔گیان چند جین کے مطابق ۱۹۶۴ء کے ایڈیشن میں اعجاز حسین نے یلدرم کے مسلم یونیورسٹی کا رجسٹرار ہونے کی بات کہی تھی،معلوم نہیں کیوں عقیل صاحب نے اسے حذف کر دیا۔'' تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند،دسویں جلد،ص:۱۶۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے قیام پر وہ ۱۹۲۰ء میں پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے اور ۱۹۲۹ء میں سبک دوش ہوئے۔

اس باب کے آخر میں ''ڈرامہ'' کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔اس عنوان کے تحت آغا حسن امانت، آغا حشر اور امتیاز علی تاج کا ذکر ملتا ہے۔اس باب پر تبصرہ کرتے ہوئے گیان چند جین یہ اطلاع دیتے ہیں کہ اس باب میں شامل افسانہ نگاروں میں سے ۱۶/ ایسے افسانہ نگار ہیں جنہیں سید عقیل نے شامل کیا ہے۔ان میں خواجہ احمد عباس،سجاد ظہیر،ڈاکٹر رشید جہاں،صالحہ عابد حسین،حیات اللہ انصاری،قاضی عبد الستار،اقبال متین، جیلانی بانو،قرۃ العین حیدر،وغیرہ کا نام آتا ہے۔اسی طرح ڈارامے کی فصل بھی سید عقیل کا اضافہ کردہ ہے۔''۸ے

پانچواں باب ''مقالات وصحافت'' کے عنوان سے ہے۔اس میں مولانا محمد علی جوہر،میر بشارت علی جالب،ابوالکلام آزاد،ظفر علی خاں،خواجہ حسن نظامی،سید سلیمان ندوی،قاضی عبد الغفار،عبد الماجد دریابادی اور ڈاکٹر سید عابد حسین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

چھٹا باب ''طنز ومزاح'' کے عنوان سے ہے۔بقول مصنف اس باب میں ان مضمون نگاروں اور افسانہ نویسوں کا ذکر ہوگا جن کے یہاں اصلاح کا زاویۂ نظر تبدیل ہو گیا ہے،جنہوں نے اپنی ظرافت نگاری سے ہمارے ادب کو روشن کر دیا ہے۔ان ادیبوں میں مرزا فرحت اللہ بیگ،رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری،عظیم بیگ چغتائی،ملا رموزی،شوکت تھانوی اور کنہیالال کپور وغیرہ شامل ہیں۔گیان چند جین کے مطابق ملا رموزی کے بیان میں ڈاکٹر سید عقیل نے اعجاز صاحب کا لکھا ہوا ایک صفحہ حذف کر دیا ہے۔اور اس کی انہوں نے کوئی وضاحت بھی نہیں کی کہ انہوں نے اسے کیوں حذف کیا ہے۔

ساتواں باب تنقید کے حوالے سے ہے۔ابتدائی دو صفحے میں اردو تنقید کا پس منظر بیان کیا گیا ہے

اس کے بعد تقریباً ۲۰ ناقدین ادب کا تذکرہ کیا گیا ہے، ان میں چکبست، مولوی عبدالحق، نیاز فتح پوری، عندلیب شادانی، آل احمد سرور، احتشام حسین، کلیم الدین احمد، ڈاکٹر محی الدین قادری زور وغیرہ شامل ہیں۔ مصنف نے ڈاکٹر محی الدین قادری زور کو بطور نقاد پیش کیا ہے، حالاں کہ ان کی بنیادی حیثیت محقق کی ہے، نقاد کی نہیں۔ ان کی تحقیق کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا گیا ہے۔

آٹھواں باب ''تحقیق'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں گیارہ (۱۱) محققین کو جگہ دی گئی ہے۔ جس میں قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، رشید حسن خاں، مالک رام، گیان چند جین وغیرہ شامل ہیں۔ آخر میں ''حرف آخر'' کے عنوان سے ڈاکٹر سید عقیل نے ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے جس میں انہوں نے اپنے ہم عصر شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کا ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں ۱۹۶۴ء کے بعد اردو میں آئی تبدیلیوں پر غور وفکر بھی کیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی اردو شاعری میں ہو رہی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''سیاسی طور پر ہندوستان اور پاکستا میں بعد المشر قین ہے مگر ادبی، تہذیبی سطح پر دونوں ملکوں کے ذہن اس طرح ایک سطح پر قریب آتے جاتے ہیں کہ اس دبے پاؤں آنے والے ریلے کو ابھی دونوں ملک کے سیاستداں شعوری طور پر محسوس نہیں کر پائے ہیں۔ اس طرح نئی شاعری ادبی اور تہذیبی یگانگت کے لیے سیمنٹ کا کام کر رہی ہے۔ وہ چاہے ہم خیال ہونے کی منزل ہو، یا تکنیک اور شعری الفاظ کے انتخاب کا مسئلہ ہو، غزلیں اور نظمیں اب دونوں طرف ایک جیسی ہوتی جا رہی ہیں، جسے ایک نیک شگون سمجھنا چاہیے۔''۹ے

ڈاکٹر سید اعجاز حسین کی ''مختصر تاریخ ادب اردو'' کی فہرست کی ترتیب تقریباً وہی ہے جو رام بابو سکسینہ کی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' کی تھی۔ مثلاً نظیر اکبر آبادی کے لیے الگ باب مختص کرنا، ناول، صحافت، تنقید وغیرہ کے عنوانات قائم کرنا، ایسا معلوم ہوتا ہے یہ ساری ترتیب رام بابو سکسینہ کے زیر اثر ہیں۔ بہر حال اعجاز حسین کی تاریخ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس ترمیم شدہ ۱۹۶۴ء والے ایڈیشن میں اس

وقت کے اکثر مشہور شاعروں اور نثر نگاروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔اسی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت افادیت اس دور میں چھپنے والی دیگر تاریخی کتابوں سے زیادہ ہے۔گوکہ اس میں بہت زیادہ تفصیلات فراہم نہیں کی گئی ہیں،سنین بھی زیادہ نہیں دیئے گئے ہیں،مگران خامیوں کے باوجود طالب علموں کے لیے اس کتاب کی اہمیت آج بھی بہت زیادہ ہے،جیسا کہ اس کتاب کے ابتدائیہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر سید اعجاز حسین کے انتقال کے بعد ڈاکٹر سید محمد عقیل نے اس کتاب کا ترمیم واضافہ شدہ ایڈیشن ۱۹۸۴ء شائع کیا تھا۔ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں مذکورہ دونوں ایڈیشنوں کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے یہ واضح کرتے ہیں کہ ڈاکٹر سید عقیل نے نہ صرف متعدد نئے اہل علم پر لکھا ہے بلکہ ہر دور کے ادیبوں اور شاعروں کے احوال میں بھی ترمیم واضافے کیے ہیں۔البتہ انہوں نے کہیں یہ وضاحت نہیں کی ہے کہ کون سے حصے ان کے تحریر کردہ ہیں اور کن کن جگہوں پر انہوں نے حذ واضافہ کیا ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پوری کتاب سید اعجاز حسین کی تحریر کردہ ہے۔

اردوادب کی تاریخ-نسیم قریشی

نسیم قریشی کی کتاب ''اردوادب کی تاریخ'' کا پہلا ایڈیشن،آزاد کتاب گھر،کلاں محل (دہلی) سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔بعد میں اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری گیان چند جین کے مطابق 'فرینڈس بک ڈپو،علی گڑھ نے سنبھالی۔جائزے کے لیے میرے پیش نظر فرینڈس بک ڈپو کا تیرھواں ایڈیشن ہے جس پر سنہ اشاعت ۱۰/ اپریل ۱۹۸۷ء درج ہے۔'عرض مولف' سے یہ پتا چلتا ہے کہ نسیم قریشی نے یہ مختصر تاریخ سید ظہیر الدین علوی (رجسٹرار،جامعہ اردو۔علی گڑھ) کی فرمائش پر جامعہ اردو کی درسی ضرورتوں کو نگاہ میں رکھ کر مرتب کی تھی۔اس لیے بقول مصنف کتاب میں نہ ادبی رجحانات پر سیر حاصل تبصرہ کی گنجائش تھی اور نہ تمام قابل لحاظ ارباب فن کے تذکرہ کا امکان،بس یہ کوشش تھی کہ اردو زبان و ادب کے ارتقا کا ایک واضح تصور مجمل طور پر نگاہوں کے سامنے آجائے۔

اس کتاب میں ابواب کے نمبر نہیں دیئے گئے ہیں،صرف عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔سب سے پہلا عنوان ''اردو زبان کی پیدائش اور ترقی'' ہے۔اس میں زبان کے آغاز وارتقا سے بحث کی گئی ہے۔اس

بحث کے دوران ایک شاعر مولانا محمد افضل (م:۱۰۳۴ھ) ساکن جھنجھانہ ضلع میرٹھ کا تذکرہ ملتا ہے۔نسیم قریشی مولانا افضل کو ان شعرا میں سب سے پہلا شاعر مانتے ہیں جنہوں نے اردو شاعری میں پہلے ہندی اور پھر فارسی عروض کی پابندی کر کے اسے پروان چڑھایا۔مصنف ان کے دوشعر بھی نقل کرتے ہیں،مگر یہ واضح نہیں کرتے کہ یہ شعر کس نظم یا غزل کے ہیں۔

پڑی ہے گل میں میرے پیم پھانسی
مرن اپنا ہے اور لوگوں کی ہانسی
مسافر سے جنہوں نے دل لگایا
انہوں نے سب جنم روتے گنوایا

ڈاکٹر افشاں زوار کے مطابق مذکورہ اشعار دیگر تاریخوں مثلاً عبدالقیوم کی تاریخ ادب اردو کی جلد اوّل ،علی گڑھ تاریخ ادب اردو(جلد اوّل)انور سدید کی مختصر تاریخ ادب میں شمالی ہند کی قدیم ترین مثنوی' بکٹ کہانی' کے حوالے سے ملتے ہیں،جس کے شاعر کا نام افضل بتایا جاتا ہے۔اس شاعر کا تذکرہ علی قلی خاں والہ داغستانی کے تذکرے''ریاض الشعرا''اور میر حسن کے تذکرے''تذکرہ شعرائے اردو'' کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی تاریخ ادب کی جلد پنجم کے گیارہویں باب میں 'شمالی ہند میں اردو شاعری سترہویں صدی میں' بڑی تفصیل سے' بکٹ کہانی' اور اس کے شاعر کی اصلیت کو ظاہر کیا ہے۔ان کے مطابق مولانا محمد افضل بکٹ کہانی کے شاعر نہیں ہیں،جیسا کہ نسیم قریشی اور مسعود حسین خاں علی گڑھ تاریخ ادب اردو میں لکھا ہے۔ بلکہ کوئی ہندو شاعر گوپال اور تخلص 'افضل' ہے۔وہ بکٹ کہانی کا مصنف ہے اور اس کا وطن جھنجھانہ نہیں نارنول ہے۔[۸۲]

کتاب کا دوسرا عنوان''اردو دکن میں'' ہے جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ زبان کا نشو و نما۔ادب کا آغاز وارتقا'' ہے۔دوسرا حصہ''اردو ادب عادل شاہی سلطنت میں ۱۴۹۰ء سے ۱۶۸۶ء تک'' ہے۔تیسرا حصہ''اردو ادب قطب شاہی دور میں ۱۵۱۸ء تا ۱۶۸۷ء'' ہے۔چوتھا حصہ''دکنی ادب مغلوں کے عہد میں'' ہے پانچواں حصہ''دکنی ادب پر ایک تبصرہ'' ہے۔

پہلے حصے میں بہمنی سلطنت کا مختصر سیاسی پس منظر اور اردو زبان و ادب کے آغاز وارتقا کا حال بیان کیا

گیا ہے۔ بہمنی دور کے ادب کے تذکرے میں نسیم قریشی خواجہ بندہ نواز کی تصانیف کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''خواجہ بندہ نواز کی تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے، تصوف میں دکنی زبان میں انہوں نے تین رسالے تصنیف کیے۔ (۱) معراج العاشقین (۲) ہدایت نامہ (۳) سہ پارہ، حضرت بندہ نواز کے ایک مرید اور شاگرد نے اپنے مرشد کے ملفوظات کی ایک بڑی شرح لکھی ہے جو 'ہفت اسرار' کے نام سے موسوم ہے۔'' ۸۳

ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب ''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک'' (جلد دوم) میں بڑی تفصیل سے خواجہ بندہ نواز سے منسوب رسالوں کا تجزیہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ خواجہ بندہ نواز نے اردو یا دکنی زبان میں کوئی رسالہ تحریر نہیں کیا ہے۔ ۸۴ اسی طرح نسیم قریشی نے میراں جی شمس العشاق کے ذکر میں ان سے تین رسالے 'گل باس'، 'شرح مرغوب القلوب' اور 'جل ترنگ' منسوب کیے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے میراں جی شمس العشاق کے تذکرے میں ان تینوں رسالوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''جل ترنگ، اور گل باس اب ناپید ہیں، اس لیے تصدیق نہیں کی جا سکتی کہ یہ واقعی میراں جی شمس العشاق کی تصانیف ہیں اور 'شرح مرغوب القلوب' میراں جی خدانما کی تصنیف ہے۔'' ۸۵

دوسرے حصے کے ابتدا میں عادل شاہی سلطنت کا سیاسی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد عادل شاہی دور کے مشہور شعرا کمال خاں رستمی، ملک خوشنود، نصرتی، ہاشمی وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ تیسرے حصے میں قطب شاہی دور کے شعرا قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، ابن نشاطی وغیرہ کا ذکر ہے۔ چوتھے حصے میں عہدِ مغل کے شعرا عاجز، وجدی، ولی اور سراج اورنگ آبادی کا بیان ہے۔ آخری حصہ میں دکنی ادب پر مختصر تبصرہ ہے۔ اس پورے حصے میں چند اہم مشاہیر کا انتہائی مختصر تذکرہ کیا گیا ہے، جس میں ابتدائی معلومات تو ملتی ہیں مگر بقول افشاں زوار شعرا کے رنگ سخن اور کلام و فن کا تنقیدی تجزیہ و تبصرہ بھی نہیں ہے، اور شعرا کا مقام و مرتبہ بھی متعین نہیں کیا گیا ہے۔ صرف آخر میں دو ڈھائی صفحے کے تبصرے سے کچھ تاریخ کا رنگ در آیا ہے۔ اس تبصرے میں نسیم قریشی دکنی شعرا کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''دکن کے شاعروں میں بہ مشکل ہی کوئی شاعر ایسا بتایا جا سکتا ہے جس

> نے مثنوی نہ لکھی ہو، مثنوی کی یہ زبردست مقبولیت صاف بتاتی ہے کہ
> دکن میں علم وشعر کا بہت اچھا مذاق موجود تھا، اس لیے غزل کی طرح
> مثنوی کہہ لینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔''۸۶

کتاب کا تیسرا عنوان ''اردو ادب کا ارتقا شمالی ہند میں'' ہے۔ یہ مختلف ادوار میں تقسیم ہے۔ پہلا دور 'معاصرین ولی' کا ہے۔ دوسرا دور 'درد، سودا و میر' سے متعلق ہے۔ تیسرا دور 'آتش و ناسخ' کا ہے، چوتھا دور 'ذوق اور غالب' کا ہے۔ اس حصے کے آخر میں ایک ضمنی عنوان 'اردو نثر ۱۸۵۷ء تک' ملتا ہے۔

ان ادوار میں چند غلطیاں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً نسیم قریشی فائز دہلوی کو پہلا صاحب دیوان شاعر مانتے ہیں۔ ان کے مطابق فائز کا دیوان ولی کے دوسرے سفر دہلی سے پہلے عہد فرخ سیر (۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۶ء) میں مرتب ہو گیا تھا۔۸۷ جمیل جالبی نے اپنی تاریخ کے جلد دوم میں شمالی ہند کے پہلے صاحب دیوان شاعر کے حوالے سے بڑی تفصیلی بحث کی ہے، اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شمالی ہند کے پہلے صاحب دیوان شاعر آبرو ہیں جن کا دیوان ۱۱۳۷ھ یا ۱۱۳۹ھ/ ۲۵-۱۷۲۴ء یا ۲۷-۱۷۲۶ء میں مرتب ہو چکا تھا، اور فائز کا دیوان شاہ مبارک آبرو کے دیوان کے بعد ۱۱۴۳ھ/ ۳۲-۱۷۳۱ء میں مرتب ہوا۔۸۸ نسیم قریشی اپنی کتاب میں شاہ مبارک آبرو کا دور حیات ۱۶۹۲ء تا ۱۷۴۷ء لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی مصحفی کے بیان کی روشنی میں آبرو کا سنہ ولادت ۱۰۹۴ھ/ ۱۶۸۳ء اور دیگر شواہد کی مدد سے تاریخ وفات ۱۱۴۶ھ/ ۱۷۳۳ء بتاتے ہیں۔ اسی طرح شاہ حاتم کا دور حیات نسیم قریشی ۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۱ء لکھتے ہیں۔ جمیل جالبی کے مطابق ۱۱۱۱ھ/ ۱۷۰۰-۱۶۹۹ء تا ۱۱۹۷ھ/ ۱۷۸۳ء ہے۔ مضمون کا سال وفات نسیم قریشی ۱۷۴۵ء بتاتے ہیں۔ جب کہ جمیل جالبی ۳۵-۱۷۳۴ء متعین کرتے ہیں۔۸۹

''اردو نثر ۱۸۵۷ء تک'' کے جائزے میں وہی پرانی باتیں دہرائی گئی ہیں، یعنی 'معراج لعاشقین'' اور ''ہدایت نامہ'' کو خواجہ بندہ نواز کی تصانیف بتایا ہے۔ جب کہ بعد کی تحقیق سے اب یہ بات ثابت ہو چکی کہ خواجہ بندہ نواز کی اردو زبان میں کوئی تصنیف نہیں ہے۔ اسی طرح نسیم قریشی نے میراں جی شمس العشاق سے منسوب اردو رسالوں کا ذکر دوبارہ کیا ہے جن کے متعلق معلوم ہے کہ یہ انتساب درست نہیں۔ اس کے علاوہ نسیم قریشی سید جہانگیر اشرف سمنانی کی اردو زبان کی تصنیف کا ذکر کرتے ہیں، مگر نہ تو اس کا نام درج کرتے

ہیں اور نہ اس کی پوری کیفیت لکھتے ہیں، اور نہ کوئی اقتباس ہی درج کرتے ہیں۔ بس انہوں نے یہ لکھا ہے:

> ''پروفیسر حامد حسن قادری کی تلاش وتحقیق نے ایک اردو رسالہ کا پتا لگایا ہے جو 'دہ مجلس' سے سوا چار وسو برس پہلے ۱۳۰۸ء میں تصنیف ہوا۔ اس کے مصنف خواجہ سید جہانگیر اشرف سمنانی ہیں۔ رسالہ اخلاق وتصوف سے متعلق ہے۔''۹۰

نسیم قریشی کے ذکر کردہ رسالے کو تا حال کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ اس لیے محققین اس کی اوّلیت کو درست نہیں مانتے۔ اس کے علاوہ اس حصے میں فورٹ ولیم کالج کا مختصر تعارف اور اس سے منسلک اہل قلم میر امن، حیدر بخش حیدری، شیر علی افسوس، بہادر علی حسینی وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ نیز دہلی کالج کے پروفیسر ماسٹر رام چندر اور امام بخش صہبائی وغیرہ کا بھی مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کا چوتھا عنوان ''اردو ادب ۱۸۵۷ء کے بعد'' ہے۔ اسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ابتدا میں ۱۸۵۷ء سے لے کر مصنف کے دور تک مختصر تبصرہ شامل ہے۔ اس کے بعد اس کا پہلا حصہ ''جدید اردو ادب کے معمار'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں سر سید، آزاد، حالی، مولوی ذکاء اللہ، نذیر احمد، شبلی نعمانی کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ ''جدید اردو شاعری نظم'' سے متعلق ہے۔ تیسرا حصہ ''جدید نثر تحقیق وتنقید'' کا ہے، جو انشائیہ، مقالات وصحافت، ناول وافسانہ، طنز ومزاح پر مبنی ہے۔

نظم کے حصے میں نسیم قریشی جوش ملیح آبادی کا سنہ ولادت ۱۸۹۴ء لکھتے ہیں۔ گیان چند جین کے مطابق ۱۸۹۸ء ہے۔ اسی طرح سیماب اکبر آبادی کا تاریخ ولادت نسیم قریشی ۱۸۸۰ء اور وفات ۱۹۵۴ء تحریر کرتے ہیں۔ گیان چند جین کے مطابق سیماب اکبر آبادی کی تاریخ ولادت ۱۸۸۲ء اور سنہ وفات ۱۹۵۱ء ہے۔ مولوی عبدالحق کی تاریخ پیدائش نسیم قریشی ۱۸۶۹ء لکھتے ہیں، جب کہ ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق صحیح تاریخ پیدائش ۲۰/ اگست ۱۸۷۰ء ہے۔۹۱

ڈاکٹر نسیم قریشی نے جس وقت یہ کتاب مرتب کی تھی اس وقت یقیناً یہ کتاب نصابی ضروریات کے لیے کافی ہوگی۔ جیسا کہ مصنف نے اپنے دیباچے میں خود لکھا ہے کہ ''یہ کتاب خاص طور پر طالب علموں کی ضرورت کو نگاہ میں رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔'' مگر آج کے دور میں یہ کتاب نصابی ضروریات کو بھی پورا نہیں

کر سکتی۔سنین کے اغلاط اور کتابوں کے غلط انتسابات کی وجہ سے یہ کتاب طالب علموں کے لیے بھی گمراہ کن ہو سکتی ہے۔اس تاریخ کا انداز تذکراتی ہے۔یعنی شاعر یا نثر نگار کے نام کے بعد چند سطور میں ان کے کام کا ذکر کر دیا گیا ہے۔کسی ادیب یا شاعر کی تخلیقات کا کوئی تنقیدی تجزیہ پیش نہیں کیا گیا ہے،اور نہ ہی کسی کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔البتہ کہیں کہیں مصنف نے ادوار پر مجموعی تبصرہ کرتے ہوئے اس دور کے سیاسی و سماجی پس منظر کو مدنظر رکھا ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب تاریخ ادب سے قریب معلوم ہوتی ہے۔مگر بقول افشاں زوار''ادبی تاریخ کی روایت میں کسی نوعیت کے اضافے کا باعث نہیں ہے۔اس لیے اس روایت میں اس کتاب کا کوئی اہم مقام نہیں ہے۔

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ - ڈاکٹر سلیم اختر

ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۱ء میں سنگ میل پبلی کیشنز،اردو بازار لاہور سے شائع ہوا۔سنگ میل پبلی کیشنز سے اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۳ء میں،تیسرا ۱۹۷۴ء میں اس طرح یکے بعد دیگرے بیس ایڈیشن شائع ہوئے۔اس کا آخری ایڈیشن سنگ میل پبلی کیشنز سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔اس کے ہر ایڈیشن میں مصنف نے کچھ نہ کچھ حذف و اضافہ کیا ہے،جس کا اندازہ کتاب کے سرورق سے لگایا جا سکتا ہے۔مثلاً پہلے ایڈیشن کے سرورق پر لکھا ہے''آغاز سے ۱۹۷۱ء تک کا ادبی جائزہ'' گیارہواں ایڈیشن جو ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا اس کے سرورق پر لکھا ہے''آغاز سے ۱۹۸۵ء تک کا ادبی جائزہ''اسی طرح ۲۰۰۰ء والے ایڈیشن پر لکھا ہے''آغاز سے ۲۰۰۰ء تک نظر ثانی و اضافہ شدہ''۔اس کے بعد مصنف نے اپنی کتاب میں کوئی ترمیم و اضافہ نہیں کیا۔چنانچہ اس آخری ترمیم شدہ ایڈیشن کے بعد پچھلے تمام ایڈیشن غیر اہم ہو جاتے ہیں۔تبصرے کے لیے میرے زیر نظر اسی آخری ایڈیشن پر مبنی ۲۰۰۵ء کا ایڈیشن ہے جسے کتابی دنیا،دہلی نے شائع کیا ہے۔

پیش لفظ میں مصنف نے بڑی وضاحت کے ساتھ اس تاریخ کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ان کے مطابق ادب کے اساتذہ،طلبا اور عام قارئین کو ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جو انہیں 'کیپسول' میں اردو زبان اور ادب کے بارے میں ضروری معومات،اساسی کوائف،اور موزوں آرا فراہم کر دے۔

کتاب لکھتے وقت مصنف کے ذہن میں نہ اساتذہ کی نصابی ضروریات تھیں اور نہ ہی انہوں نے اس کتاب کو طلبا کے لیے گائڈ بنانے کی سعی کی ہے۔ جب کہ کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصل میں یہ کتاب صرف طلبا کے لیے لکھی گئی ہے خواہ وہ بی.اے.ایم.اے کے طلبا ہوں یا مقابلے کے امتحان کے۔ ہاں مصنف نے یہ ضرور کیا ہے کہ کتاب کی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لیے اسے ہر سال 'اپ ٹو ڈیٹ' کرتے رہے اور ہر سال تخلیق ہونے والے معاصر ادب کا تعارف شامل کرتے رہے، جس کی وجہ سے کتاب کی اہمیت میں اضافہ تو ہوا، لیکن دوسری طرف بقول مصنف کتاب خاصی متنازع ہوگئی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ادبی تواریخ کے نزاعات بالعموم تحقیقی اغلاط، ناقص مواد، غلط کوائف کی بنا پر جنم لیتے ہیں، لیکن یہاں ادبی، تحقیقی، تنقیدی یا تاریخی نقطۂ نظر کے برعکس خالص انا کا مسئلہ تھا۔ ناپسندیدگی ان معنوں میں سراسر ذاتی اور محض نجی تھی کہ:
>
> (۱) میرا نام کیوں نہیں آیا۔
>
> (۲) میرا ذکر تین سطروں میں ہے جب کہ 'فلاں' کا ساڑھے تین میں۔
>
> (۳) میں کیا فلاں 'سے کمتر ہوں جو 'اس' کا ذکر مجھ سے چار پانچ انچ اوپر کیا گیا۔
>
> (۴) اور یہ تو اس قابل ہی نہ تھا کہ اس کا ذکر ہوتا۔
>
> کتاب کے حوالے سے در نزاع وا ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ (ابتدائی چھ ایڈیشنوں تک) جہاں نئے ناموں اور کتابوں کے اضافے سے کتاب کو اپ ٹو ڈیٹ کیا وہاں بعض اسما کے اخراج سے بھی کتاب کو اپ ٹو ڈیٹ بنانے کی سعی کی...... ہر دو لحاظ سے اپ ٹو ڈیٹ بنائے رکھنے کا یہ تجربہ کہاں تک سود مند ثابت ہوا؟ گالیوں کی بوچھار سے تو لگتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ کامیاب رہا۔''[۹۲]

پیش لفظ کے بعد ''تاریخ ادب، مقاصد و محرکات'' کے عنوان سے دس صفحے کا مقدمہ ہے جس میں ڈاکٹر اسلیم اختر تاریخ اور ادبی تاریخ کی وضاحت کرتے ہوئے ایک اچھی ادبی تاریخ تحریر کرنے کے اصول و ضوابط بیان کرتے ہیں۔ ان کے مطابق کسی ملک کی تاریخ اور ادب کی تاریخ میں خاصا فرق ہوتا ہے۔ کیوں کہ ادب کی تاریخ کا معاملہ عام تاریخ کے مقابلے میں خاصا نازک اور پیچیدہ ہوتا ہے، اس لیے

کہ یہ تاریخ کے مروج تصور کے مطابق محض ایام شماری نہیں اور نہ ہی معلومات وکوائف مرتب کرنا ہے۔اگر چہ تاریخ میں یہ سب کچھ شامل ہے لیکن بنیادی طور پر یہ تخلیق یا تخلیق کاروں کا مطالعہ ہے۔۹۳؎ مقدمہ میں سلیم اختر نے مورخ کے کام کی نوعیت اور فرائض سے بھی بحث کی ہے۔ان کے مطابق مورخ کے لیے حسن ذوق کے ساتھ تنقیدی نگاہ، تخلیقی ذہن اور زندگی کے بارے سائنٹفک شعور کا ہونا بھی ضروری ہے۔

پیش لفظ اور مقدمہ کے بعد کتاب میں چوبیس ابواب ہیں۔ان چوبیس ابواب میں سے اٹھارہ ابواب قیام پاکستان سے پہلے کے ادب پر مشتمل ہیں اور باقی چھ ابواب قیام پاکستان سے لے کر ۱۹۹۹ء تک کے ادبی جائزے پر مبنی ہے۔ بقول گیان چند جین موخر الذکر چھ ابواب پاکستانی ادیبوں تک ہی محدود ہیں۔کسی ہندوستانی ادیب کا نام نہیں لیا گیا۔یہ تفریق حیران کن ہے۔۹۴؎

کتاب کے پہلے باب کا عنوان ''طاؤس، تخت طاؤس اور تخلیق'' ہے۔اس باب میں سلیم اختر ادبی انداز میں (جو کہ ایک تاریخی کتاب کے لیے غیر موزوں ہے) ادب کی ابتدائی کیفیات، ادب کا اپنے معاشرے، جغرافیائی تاریخ اور ماحول سے تعلق اور ایک دوسرے پر ان کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے مثالوں سے ان کو واضح کرتے ہیں۔اس باب کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''جاندار کے بغیر خوش رنگ منظر تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔پرندوں کے بغیر شجر سونا ہوتا ہے۔بلبل کے بغیر شاخ گل اجڑی اجڑی نظر آتی ہے۔کونجوں کی ڈار سے سوئے آسماں میں زندگی کی لہر بن کر ابھرتی ہے اور رم آہوریت کی انگڑائی ثابت ہوتا ہے......ہوا، جنگل، میدان، پانی سب اپنی اپنی مخلوق سے آباد ہوں تو خوبصورت اور زندہ لگتے ہیں......شاعر اپنے خطہ کے مخصوص مناظر کے ساتھ ساتھ مناظر سے وابستہ متحرک حیات سے بھی تشبیہات اور استعارات اخذ کرتا ہے۔''۹۵؎

دوسرا باب اصلاح زبان سے متعلق ہے، جس کا عنوان ہے ''اردو ہے جس کا نام'' اس باب میں مصنف ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے حوالے سے بیجاپور کے سرکاری کتب خانے (جسے مصنف عجائب گھر سے موسوم کرتے ہیں) میں موجود رسالہ 'جنونیہ' کو اردو کی پہلی نثری تصنیف قرار دیتے ہیں، اور دلیل کے طور پر

مصنفہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

''رسالے کی زبان، اس کا اسلوب، جملوں کی وضع اور بندش سے بھی یہی پایا جاتا ہے کہ یہ آٹھویں صدی ہجری کے اواخر کی تصنیف ہے۔ اس رسالہ کا موضوع بھی اردو کے ابتدائی رسالوں کی طرح جواب دستیاب ہوئے ہیں اخلاق اور تصوف کے نکات پر مشتمل ہے۔'' ۹۶

ڈاکٹر افشاں زوار کے مطابق ڈاکٹر گیان چند جین نے ''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک'' کی جلد دوم کے چھٹے باب میں رسالہ 'جنونیہ' کے حوالے سے بڑی تفصیلی بحث کی ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ رسالہ 'جنونیہ' اردو کی پہلی نثری تصنیف نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کے دستیاب شدہ صرف دو نسخوں میں چند سطریں ہی اردو کی ہیں۔ باقی رسالہ فارسی میں ہے۔ اس لیے اس رسالے کو یہ اعزاز نہیں دیا جا سکتا۔'' ۹۷

تیسرا باب ''اردو زبان: آغاز کے بارے میں نظریات'' کے حوالے سے ہے۔ اس باب میں سلیم اختر تمام مختلف نظریات کا ذکر کرتے ہیں۔ لیکن کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچتے، اور نہ کوئی حتمی رائے پیش کرتے ہیں۔ اس پوری بحث کا نچوڑ بزبان مصنف یہ ہے کہ ان نظریات میں کلیتاً نہ تو کسی کی تردید کی جا سکتی ہے اور نہ ہی کسی ایک پر دوسرے کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔ سب میں کسی نہ کسی حد تک صداقت موجود ہے۔ یہ جزوی سہی مگر اس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

چوتھا باب ''اصلاح زبان'' سے متعلق ہے۔ اس باب میں چھوٹے چھوٹے کئی اور عنوان قائم کیے گئے ہیں۔ مثلاً 'حسن گلشن'، 'لفظ کی توانائی'، 'باغ کا جھنکار'، 'اچھوت الفاظ'، 'متروکات'، 'منفی عمل' وغیرہ۔ حقیقتاً اس باب کا عنوان اصلاح زبان ہے۔ لیکن اس باب کی پوری بحث میں مصنف نے جو انداز تحریر اپنایا ہے وہ عملی سنجیدگی سے پوری طرح خالی ہے۔ گیان چند جین اس کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے مصنف کے انداز گفتگو کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''تحقیقی کتاب میں ہم گفتگو کا یہ انداز سوچ بھی نہیں سکتے۔ پھر اس کتاب میں ذاتی نوک جھونک بھی ہے۔ مثلاً یہ عنوان:

تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، المعروف بہ حکایت عجیب و غریب اور لطایف دلپذیر۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے لیے لکھتے ہیں:

''اردو شاعری کا مزاج'' ایک نزاعی کتاب ہے جس کا رشید ملک نے 'معاصر' میں مطبوعہ مقالہ 'طلائی تثلیث' میں جدید تریں علوم کی روشنی میں پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے اس کے بنیادی تھیسس کو لغو اور بے معنی ثابت کیا۔ انہوں نے سرقے کی مثالیں پیش کر کے ڈاکٹر صاحب کی علمیت کا بھانڈا پھوڑ دیا۔'' ۹۸

پانچواں باب ''تخلیقی رویئے اور اصناف ادب'' کے حوالے سے ہے۔ اس باب میں مصنف نے اپنے وہی مخصوص انداز میں اصناف شاعری کا تعارف پیش کرتے ہیں۔ چھٹے باب میں ''جنوبی ہند کے اردو ادب'' کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ اس جائزے میں بہمنی دور حکومت سے لے کر اورنگ زیب کے قبضۂ دکن تک کی روایت کا ذکر کرتے ہوئے مصنف اس دور کے مشہور شعرا و ادبا کا تعارف بھی پیش کرتے ہیں۔ اس باب میں نصیر الدین ہاشمی کے حوالے سے مصنف یہ بتاتے ہیں کہ اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ مہ لقا چندا نہیں، لطف النسا امتیاز ہے، جس کا دیوان ۱۲۱۲ھ میں یعنی چندا کے دیوان سے ایک سال قبل مرتب ہوا تھا۔ لطف النسا امتیاز کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''تخلص کی بنا پر پہلے اسے مرد سمجھا جاتا رہا بعد میں اس کی ایک مثنوی 'گلشن شعرا' کی دستابی سے علم ہوا کہ امتیاز عورت ہے۔'' ۹۹

ساتواں باب ''شمالی ہند میں اردو ادب'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں دبستان دہلی کے چند نامور شعرا افضل، فائز، جعفر، حاتم، میر، سودا، درد وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی باب میں مصنف ''تنقید کا آغاز: تذکرے'' کے ذیلی عنوان کے تحت تذکروں کا تعارف اور تنقید کی روایت کے آغاز کا ذکر کرتے ہیں۔ میر تقی میرؔ کو ان کے تذکرے 'نکات الشعرا' کی بنیاد پر پہلا نقاد بتاتے ہیں، مصنف نظیرؔ اکبر آبادی کا تعارف اس باب میں 'چٹکلے باز شاعر' کے ذیلی عنوان کے تحت کراتے ہیں۔ بقول افشاں زوار نظیرؔ جیسے مزاج و شخصیت کے حامل شاعر کے لیے چٹکلے باز کا خطاب سنجیدہ مورخ کے قلم سے زیب نہیں دیتا۔ علاوہ ازیں ایک مبسوط ادبی تاریخ کے لیے ایسے عنوانات اس کی حیثیت کو کم تر بنا دیتے ہیں۔ مصنف

نظیراکبرآبادی کی شخصیت وفن کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے ان کی غزلوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''نظیر کی نظم نگاری پر اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ غزل دب کر رہ گئی ہے...... یہ واضح رہے کہ نظیر کی غزلیات بالعموم دستیاب نہیں۔ اتفاقاً آغا حسن دہلوی کے کتب خانہ سے نظیر کے دیوان کے دو مخطوطے مرزا فرحت اللہ بیگ کے ہاتھ لگے جنہیں انہوں نے ۱۹۴۲ء مرتب کر کے انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام شائع کرادیا......ان کی غزلوں میں فلسفہ، تصوف، نفسیاتی حقائق اور اخلاق کا اظہار ملے یا نہ ملے مگر ایک چیز ضرور ملے گی اور ہے زندگی، اپنی پوری دلآویزیوں، تابانیوں اور گوناگوں کیفیات کی حامل زندگی۔''[۱۰۰]

آٹھواں باب ''لکھنؤ کا دبستان شاعری'' ہے۔ باب کے ابتدا میں سیاسی وسماجی پس نظر بیان کیا گیا ہے۔ اور لکھنؤ کی اصطلاح میں اودھ ولکھنؤ کی نفسیاتی وسماجی زندگی کے اثرات کو واضح کیا گیا ہے۔ لکھنؤ کی سماجی زندگی میں طوائف کی کیا اہمیت تھی، اس کے اثرات کیا تھے، اس کا ذکر ''ناز وادا کا اسلحہ خانہ :ریختی'' کے ذیلی عنوان کے تحت کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی لکھنؤ میں مروج دیگر اصناف مثنوی اور مرثیے کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے، جس میں مرزا شوق کی ''زہر عشق'' (مصنف جسے اردو کی بدنام ترین مثنوی سے موسوم کرتے ہیں۔) کا نسبتاً مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ لکھنوی دبستان کے ضمن میں مصحفیؔ، جراتؔ، انشاؔ، ناسخؔ اور آتشؔ کا مختصر ذکر کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اردو کا پہلا سفرنامہ ''عجائبات فرنگ'' کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر اسے لکھنؤ کا اعزاز گردانتے ہیں۔

نواں باب ''دہلی کے نامور شعرا'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی دلّی کا مختصر سیاسی وتاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ ''دہلویت کیا نہیں ہے؟'' کے عنوان سے دہلوی اور لکھنوی رنگ کو واضح کیا گیا ہے۔ مصنف کے مطابق دہلویت اور لکھنویت تقریباً ایک ہی چیز کے دو رخ ہیں اور خصوصیات کے اعتبار سے دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ ڈاکٹر افشاں زوار کے مطابق یہ اصطلاح عبد السلام ندوی کی 'شعر الہند' سے سامنے آتی ہے۔ ''دبستان بہار'' کے ذیلی عنوان کے تحت

مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، افشاں زوار کے مطابق وہ دراصل نیاز فتح پوری کا مضمون ہے، جو ''دبستان بہار'' کے نام سے ہفت روزہ رسالہ 'نصرت' لاہور ۱۱/ستمبر ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۰۱؎ حالاں کہ مصنف نے اس مضمون کے بارے میں اپنی کتاب میں کوئی وضاحت نہیں کی ہے۔ اس باب میں مومنؔ، ذوقؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، غالبؔ، شیفتہؔ، نصیرؔ اور مرزا داغؔ کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

دسواں باب ''اردو نثر کا ظہور، مستشرقین اور یورپین شعرائے اردو'' کے حوالے سے ہے۔ اس باب میں مستشرقین اور انگریز شعرا کا تعارف اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اردو میں ان کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے مصنف ان کے کلام کا تجزیہ بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کے مطابق مستشرقین اور یورپین شعرا کا مزاق لکھنوی طرز اظہار کا حامل ہے، اور ان کے یہاں بھی الفاظ سے سماں باندھنے کی شعوری کوشش ملتی ہے۔

گیارہواں باب ''داستان سرائے'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں داستان امیر حمزہ، فسانۂ عجائب، الف لیلہ، رانی کیتکی کی کہانی، بیتال پچیسی، اور 'بوستانِ خیال' کا فنی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ قدیم داستانوں اور جدید سائنس میں مشابہت اور تعلق کے حوالے سے بھی بحث کی گئی ہے۔

بارہواں باب ''فورٹ ولیم کالج اور باغ و بہار'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں فورٹ ولیم کالج اور اس سے منسلک مصنفین کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے ضمن میں کالج کی مطبوعہ، غیر مطبوعہ ۱۴۷ تالیفات کی فہرست ڈاکٹر سمیع اللہ کے حوالے سے پیش کی گئی ہے، جن میں ۹۴ مطبوعہ اور ۵۳ غیر مطبوعہ ہیں۔ مصنف کے مطابق ان غیر مطبوعہ کتابوں میں سے کئی کتابیں نجی اداروں کی طرف سے چھپ چکی ہیں۔ ۱۰۲؎ اس باب میں میر امن کی ''باغ و بہار'' کا تجزیہ بڑا تفصیلی پیش کیا گیا ہے۔ اس کا اسلوب، فنی خصوصیات، دیگر زبانوں میں اس کے ترجمے، اس کے ماخذ اور اسی نام کی دوسری داستانوں کا ذکر یہ سب باغ و بہار کے تجزیہ میں شامل ہے۔

تیرہواں باب ''سرسید تحریک اور ادبی نشاۃ الثانیہ'' کے عنوان سے ہے۔ باب کے ابتدا میں ڈاکٹر سلیم اختر سرسید کے بارے میں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں:

''حقیقی عظمت کا اگر کوئی انسان مستحق ہو سکتا ہے تو یقیناً سرسید احمد خاں

اس کے مستحق تھے۔تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں بڑے آدمی اکثر گزرے ہیں لیکن ان میں بہت کم ایسے نکلیں گے جن میں یہ حیرت انگیز مہارتیں اور اوصاف مجتمع ہوں۔وہ ایک ہی وقت میں اسلام کا محقق،علم کا حامی،قوم کا سوشل ریفارمر،پولیٹیشین،مصنف اور مضمون نگار تھے۔اس کا اثر اس عالم کا نہ تھا جو گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اپنی تحریروں سے لوگوں کے دل اکسائے بلکہ وہ اعلانیہ دنیا کے سامنے لوگوں میں لوگوں کا رہبر بن کر اس لیے آیا کہ جس بات کو سچ اور صحیح سمجھے اگر اس کی دنیا مخالف ہو تو ساری دنیا سے لڑنے کے لیے ہر وقت تیار اور آمادہ رہے۔''۱۰۳

سلیم اختر کے مطابق سرسید کی شخصیت اور تحریک دونوں نزاعی تھی،آج سے ایک صدی قبل بھی اور آج بھی۔اسی حوالے سے انہوں نے سرسید تحریک کا ۱۸۵۷ء کے بعد کے ملکی حالات اور سیاسی پس منظر میں بڑی تفصیل سے جائزہ پیش کیا ہے۔ساتھ ہی الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نعمانی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔''ردعمل'' کے ضمنی عنوان کے تحت سرسید اور سرسید تحریک کے مخالفین کا سرسری ذکر کیا گیا ہے۔جس میں اکبر الہ آبادی اور اودھ پنچ میں لکھنے والے مرزا مچھو بیگ،ستم ظریف،احمد علی شوق،تربھون ناتھ ہجر،نواب سید محمد آزاد،جوالا پرشاد برق،احمد علی کسمنڈوی،وغیرہ شامل ہیں۔''نئی اصناف کی کونپلیں'' کے تحت مضمون، ناول،تنقید،اور آزاد نظم وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔اسی طرح ''پہلا ناول نگار کون؟'' کا ایک عنوان قائم کیا گیا ہے جس میں مصنف یہ پتا لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پہلا ناول نگار کسے تسلیم کیا جائے،مگر وہ کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ پاتے۔ان کے مطابق سب سے پہلا ناول ''مرأۃ العروس'' ہے۔مگر ڈاکٹر احسن فاروقی نذیر احمد کے کسی ناول کو ناول تسلیم ہی نہیں کرتے اور ان کے سب ناولوں کو تمثیلیں قرار دیتے ہیں۔

چودھواں باب ''مرثیہ:عہد بہ عہد'' ہے۔باب کے ابتدا میں مرثیہ کے مقاصد و محرکات کا ذکر ہے۔اس کے بعد شمالی ہند اور دکن میں مرثیہ کی روایت اور وہاں کے اہم مرثیہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے۔اس باب میں بھی ایک ضمنی عنوان ''پہلا مرثیہ نگار کون؟'' قائم کیا گیا ہے اور اس حوالے سے ڈاکٹر مسیح الزماں

کی تحقیق کومن وعن اس میں پیش کر دیا گیا ہے۔

پندرھواں باب ''اردو ڈراما'' سے متعلق ہے۔اس باب میں اردو کے پہلے ڈرامہ سے لے کر ٹیلی ویژن ڈرامہ تک کی مختصر داستان بیان کی گئی ہے۔کتاب میں ''پہلے ڈرامہ نگار'' کی حیثیت سے واجد علی شاہ کا ذکر کیا گیا ہے۔بقول افشاں زوار یہ تحقیق ڈاکٹر اسلم قریشی کی ہے جسے مصنف نے یہاں پیش کیا ہے۔خود انھوں نے اس پر کوئی تحقیقی بحث نہیں کی ہے۔

سولھواں باب ''عبوری دور کا ادب'' کے عنوان سے ہے۔اس میں مصنف کے مطابق ان ادیبوں اور شعرا کا تذکرہ ہے جو بہ لحاظ زمانہ یا مخصوص فکری سانچوں اور طرز احساس کی بنا پر ترقی پسند ادب کی تحریک سے قبل گنے جا سکتے ہیں۔ان میں عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار اور مرزا رسوا وغیرہ شامل ہیں۔''پہلی خاتون ناول نگار'' کے ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر وقار عظیم کے ایک مضمون کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''سید وقار عظیم نے اپنے مقالہ 'اصلاح النسا ۱۸۸۱ء کا ایک ناول' میں پٹنہ سے مطبوعہ ایسے ہی ایک ناول کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں کوئی عورت کتاب پر اپنا نام نہ دے سکتی تھی، کیوں کہ سرورق پر خاوند کا نام خفیہ رکھ کر رشتہ داروں کے حوالے سے اپنی پہچان یوں کرائی:
> تاج النسا فخر نسواں والدہ مسٹر محمد سلیمان سلمہ الرحمٰن بیرسٹر ایٹ لا نسبت شمس العلما، سید وحید الدین خاں بہادر مرحوم و مغفور و ہمشیرہ شمس العلما مولوی سید امداد صاحب و آنریبل سید فضل امام خان بہادر حسب فرمائش جناب مسٹر محمد سلمان بیرسٹر ایٹ لا فرزند باوقار مصنفہ۔''[۱۰۵]

پھر آگے یہ مطلع کرتے ہیں کہ ڈاکٹر اختر اورینوی کی تحقیق کے مطابق مصنفہ کا نام رشیدۃ النسا بیگم ہے اور وقار عظیم نے اسے درست تسلیم کیا ہے۔

سترھواں باب ''محرم راز درون مے خانہ......اقبالؔ'' کے عنوان سے ہے۔باب کے ابتدا میں علامہ اقبال کا شجرۂ نسب اور افکار اقبال کا نقشہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔پھر ان کے کلام و فن کا تجزیہ اور پاکستان میں گزشتہ پچاس برسوں میں اقبال سے متعلق کیے گئے کاموں کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے علاوہ

اس باب میں کلام اقبال کے تراجم وتشریح اور نظریات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز اقبال کی آمدنی وٹیکس کا گوشوارہ بھی دیا گیا ہے۔ بقول افشاں زوار یہ سب معلومات اپنی جگہ دلچسپ ضرور ہیں مگر تاریخ ادب اور مختصر ترین تاریخ ادب کے لیے قطعاً غیر ضروری ہیں۔

اٹھارھواں باب ''ترقی پسند ادب کی تحریک'' کے عنوان سے ہے۔ یہ باب ترقی پسند تحریک اور اس سے متعلق ادب کے تعارف اور جائزے پر مبنی ہے۔ ابتدا میں ترقی پسند تحریک کے آغاز اور اس کی بنیاد کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق ترقی پسند ادب کی تحریک کا انداز فکر ہندوستان اور اس کے ادیبوں کے لیے نئی چیز تھی۔ اس سے قبل نہ تو ادب کی تحریک یا اس کے مقاصد کا ہم نوا ہوا۔ نہ تخلیق کو منشور کے تابع کرنے کی ضرورت سمجھی گئی، نہ ہی قلم کو ہتھیار قرار دے کر ادیبوں کو پرچم تلے جمع ہونے کی تلقین کی گئی تھی۔ ''افسانہ اور عصری شعور'' کے ضمنی عنوان سے چند اہم ترقی پسند افسانہ نگاروں کا ایک ایک سطر کا فنی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ مختصر ترین تجزیے انتہائی مختصر اور ناکافی ہیں، جس کا احساس مصنف کو بھی ہے۔ اسی باب میں ۱۹۳۰ء کے بعد کے حالات کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے اس دور کی اہم ادبی تنظیم ''حلقۂ ارباب ذوق'' کا بھی مصنف تعارف پیش کرتے ہیں، اور اس حلقہ سے متعلق یہ سوال قائم کرتے ہیں کہ کیا یہ حلقہ ایک تحریک ہے۔؟ پھر وہ خود اس سوال کا جواب نفی میں دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ایک بہترین ہفت روزہ اجلاس کا انعقاد اہم سہی مگر حلقہ کو ایک تحریک قرار دینا غلط ہے۔ تحریک، دبستان، رجحان، میلان کا محرک خاص تصور حیات، ادبی شعور یا تنقیدی تصور ہوتا ہے۔ جب کہ حلقۂ ارباب ذوق ان ہی سے عاری نظر آتا ہے۔''[۱۰۶]

انیسواں باب ''پاکستان میں اردو ادب کی نصف صدی'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں قیام پاکستان کے بعد ادب کی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس جائزے میں قیام پاکستان کے وقت اور بعد کے مسائل، ادب پر ان کا اثر، فکری مباحث وغیرہ شامل ہیں۔ اس جائزے کے آخر میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ''اسے بہ حیثیت پاکستانی میرا تعصب نہ سمجھا جائے، لیکن میں ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے پوری دیانت داری سے یہ محسوس کرتا

ہوں کہ ہم نے فکشن اور جدید شاعری کے سلسلہ میں جو کام کیا، وہ قدر و قیمت میں بھارت میں کیے گئے کام سے کہیں بہتر ہے۔'' ۱۰۷؎

اس اقتباس کے ایک ایک لفظ سے احساس تفاخر جھلک رہا ہے۔ بہر حال یہ مصنف کی ذاتی رائے ہے،ہمیں اس سے کوئی اختلاف نہیں،حقیقت اس کے بر عکس ہی کیوں نہ ہو۔بیسواں باب ''پاکستان میں اردو نثر کا تخلیقی منظر نامہ'' ہے۔اس باب میں نثری اصناف مثلاً ناول، ناولٹ، انشائیہ، خود نوشت، وغیرہ کا فنی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اسی باب میں ایک عنوان ''انشائیہ کا سیاپا'' جس میں ڈاکٹر سلیم اختر انشائیہ کی صنف کی قدامت کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر وزیر آغا کو ان کے دعویٰ کے بموجب انشائیہ کی صنف یا اصطلاح کا موجد تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔جس پر افشاں زوار لکھتی ہیں:

''گو تحقیقی اعتبار سے ایسا کرنا غلط نہیں،مگر گزشتہ ایڈیشنوں میں اور موجودہ ایڈیشن کے بیان اور لب ولہجہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے تعصب اور ناراضگی کا احساس ابھرتا ہے۔اگر ڈاکٹر سلیم اختر یہاں غیر جانب داری اور معروضی انداز اپناتے تو یقیناً یہ موجودہ صورت سے زیادہ بہتر ہوتا۔'' ۱۰۸؎

اکیسواں باب ''پاکستان میں تحقیق و تنقید'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں گزشتہ پچاس سالوں میں جن موضوعات پر جو کچھ لکھا گیا ہے اور جن ادیبوں نے لکھا ہے ان سب کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔اس باب میں کئی اور ضمنی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔مثلاً یونیورسٹی اور تحقیق، ڈاکٹریٹ اور محقق، پھول جمع کرنے،تنقید میں تنوع وغیرہ۔'یونیورسٹی اور تحقیق' کے ضمن میں جو باتیں کی گئی ہیں اس سے یہ انداز ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر یونیورسٹیوں میں کیے جانے والے تحقیقی کام سے خوش نہیں ہیں۔وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''تحقیق کے لیے اب یونیورسٹیوں کے پاس مناسب موضوعات نہیں رہے،لہٰذا جیسے ہی کوئی اہم ادیب یا شاعر مرا،ابھی اس کا کفن بھی میلا نہیں ہوتا کہ یار لوگ اس پر ڈاکٹریٹ کے مقالہ کی منظوری کے لیے تگ و دو شروع کر دیتے ہیں...... یہ بھی عجب اتفاق بلکہ حسن اتفاق ہے کہ ڈاکٹریٹ کے بہانے کچھ

اچھے اور کارآمد تحقیقی مقالات بھی قلم بند ہو گئے ہیں۔''۱۰۹؎

بائیسواں باب ''پاکستان میں شعر کی صورت حال'' سے متعلق ہے۔اس میں بقول افشاں زوار ''اظہار و اسالیب کے نئے امکانات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔چوں کہ اس باب میں سبھی ہم عصر شعرا ہیں،اس لیے تفصیل سے کسی کے فن کا تجزیہ نہیں کیا گیا۔بلکہ سبھی شعرا کی تعریف کا انداز اپنایا گیا ہے۔''۱۱۰؎

تئیسواں باب ''نئے رجحانات،تصورات نو،نزاعی مباحث'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں پچھلے پچاس سالوں میں پاکستان کے ادب میں جو نئے رجحانات یا تصورات و خیالات ابھر کر سامنے آئے ہیں ان سب کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔چوبیسواں باب ''معاصر تخلیقات کا جھروکہ'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۹ء تک یعنی بیسویں صدی کے اختتام تک چھپنے والی کتابوں کا تعارف مع مصنف پیش کیا گیا ہے۔کتاب اور صاحب کتاب پر تبصرہ کے دوران کتاب کی قدر قیمت بھی متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔باب کا آخری حصہ ''۱۹۹۹ء الوداع'' کے عنوان سے ہے،جس میں ڈاکٹر سلیم اختر کئی تند و تلخ باتیں کرتے ہوئے ترقی یافتہ مستقبل کے ہاتھوں غائب ہونے والی کتاب کا نوحہ کہتے ہیں۔ساتھ ہی آنے والی صدی کے لیے رجائی اور خوش فہم بھی نظر آتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

> ''آج ہم جب اکیسویں صدی کے دروازہ پر دستک دینے کو ہیں تو ہم نے موجودہ صدی میں متنوع طریقوں سے تخلیقی فعیلت کا ثبوت دیا ہے۔لہٰذا رخصت ہوتی صدی ہم سے ناخوش نہ جائے گی...... یہ عجیب اتفاق ہے کہ 'اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ' کا نظر ثانی اور اضافہ شدہ ایڈیشن صدی کے اختتام پر طبع ہو رہا ہے،یہ کتاب جہاں چار صدیوں کی تخلیقی مساعی کا پیمانہ ثابت ہوتی ہے وہاں ایک طرح سے اکیسویں صدی کی تخلیقی فضا کے لیے اشارہ بھی ہے۔مبہم ہی سہی......''۱۱۱؎

ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کا خاکہ اس سے قبل مرتب کی گئی تاریخوں سے تھوڑا مختلف ہے۔اس کتاب کے پہلے پانچ ابواب تمہید کے طور پر ہیں جن میں لسانی مباحث کا جائزہ اور مختلف اصناف کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔چھٹے باب سے ادب کا جائزہ ہے،اور ہر باب مختلف

حصوں میں تقسیم ہے جن میں ادوار بھی ہیں، علاقائی رنگ بھی ہیں، تحریکیں بھی ہیں، اصناف بھی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یوں چار صدیوں کی پوری تاریخ کو مختلف حصوں میں بانٹ کر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کتاب میں بقول ڈاکٹر افشاں زوار سنین کے بارے میں بڑا غیر محتاط انداز ملتا ہے۔ مصنف کہیں صرف ہجری سنہ دیتے ہیں اور کہیں صرف عیسوی سنہ، اور ان دونوں میں مطابقت پیدا کر کے درست سنہ نہیں لکھتے۔ جس کے باعث اکثر الجھن ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں کتاب میں ابواب کے عنوانات کے ساتھ ساتھ ضمنی عنوانات کے بے جا استعمال سے بھی اکتاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر افشاں زوار لکھتی ہیں:

> ''ڈاکٹر سلیم اختر ابواب کے عنوانات دینے کے ساتھ ساتھ ہر باب میں ضمنی عنوانات بھی تحریر کرتے ہیں۔ ضمنی عنوانات کا یہ جا و بے جا استعمال تاریخ ادب کی سنجیدگی اور وقعت سے متصادم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ ضمنی عنوانات بسا اوقات غیر ادبی، غیر سنجیدہ اور غیر معیاری ہوتے ہیں۔ جس کے باعث وہ ناگواری کا تاثر قائم کرتے ہیں۔ مثلاً 'فلسفہ اور تنقید کی مکھیاں' انشائیہ کا سیاپا' حضرت موسیٰ کی بہن' شاعری کا جاپانی پھل'' وغیرہ وغیرہ۔''۱۱۲

ڈاکٹر انور سدید اس کتاب پر سخت تبصرہ کرتے ہوئے کتاب اور صاحب کتاب سے متعلق کئی اعتراضات اور کئی ایسی باتیں کہی ہیں کہ ان سب کا ذکر یہاں مناسب حال نہیں۔ ہاں ان میں چند یہ ہیں:

(۱) اس کتاب کے مختلف ایڈیشنوں کا مطالعہ کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر کے یہاں ادب اور معاصر ادب کے درمیان ایک واضح حد فاصل موجود ہے۔

(۲) مولف نے ادب کی تاریخ مرتب کرنے کے بجائے بعض ادبا کی جنسی معلومات مہیا کرنے میں زیادہ دلچسپی لی ہے۔

(۳) ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب کے عنوان میں جو سب سے پہلے متوجہ کرتا ہے وہ 'مختصر ترین' ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلیم اختر اس لفظ کے لغوی معنی سے واقف تھے۔

(۴) انہوں نے لکھا ہے کہ 'مختصر ترین' صرف اظہار عجز مقصود تھا۔ لفظ مختصر کو یہ نئے معنی عطا کرنا ڈاکٹر سلیم

اختر کا اوریجنل کارنامہ ہے۔

(۵) ڈاکٹر صاحب نے ادبا کے ادب پر نظر ڈالنے کے بجائے ان کی زندگی کے مالی امور اور کاروباری زاویوں کو زیادہ اہمیت دی ہے۔

(۶) ڈاختر سلیم اختر اپنے قاری کو بالعموم یوں مخاطب کرتے ہیں جیسے کوئی نالائق استاد کلاس میں بچوں کو سرزنش کر رہا ہو۔'' ۱۱۳

بہر حال ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب تاریخ ادب کی مقبول عام کتاب ہونے کے ساتھ متنازع تاریخ بھی رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب میں جہاں ابتدائی دور کے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے، وہاں معاصر ادب کا بھی مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ معاصر ادب اور ادبی رویوں پر لکھنا یا کوئی تبصرہ کرنا بہت مشکل کام ہے، بلکہ ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔ اس لیے سلیم اختر خود کو داد کا مستحق سمجھتے ہیں، اور واقعی یہ قابل تعریف کام ہے۔ انہوں نے بڑی جرأت و ہمت کے ساتھ اس مشکل کام کو سرانجام دیا ہے، اس سے پہلے لکھی جانے والی تمام ادبی تاریخیں صرف کلاسیکی ادب کے جائزے تک محدود ہیں۔ مورخین حضرات نے معاصر ادب کا بھاری بھرکم بوجھ دیکھ کر چھوڑ دینے میں ہی عافیت محسوس کی، مگر یہ بوجھ کسی نہ کسی کو تو اٹھانا ہی تھا۔ اس کی ابتدا ڈاکٹر سلیم اختر نے کی، یہ ضرور ہے کہ معاصر ادب پر لکھتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر بعض اوقات ذاتیات پر اتر آئے ہیں۔ حالاں کہ مورخ کو غیر جانبدار اور ذاتی تعصّبات سے بلند صرف ادبی معیارات کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب کی خوبیوں اور خامیوں پر نظر ڈالنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ بے شک یہ کتاب بقول مصنف مقبول عام اور بیسٹ سیلر ہے، مگر ادبی تاریخوں کے سخت معیار پر پوری نہیں اترتی۔ اس لیے اس روایت میں اس کا کوئی خاص مقام نہیں۔

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ - احتشام حسین

یہ کتاب ''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' سید احتشام حسین کی وفات (۱۹۷۲ء) سے قبل تیار ہو چکی تھی، لیکن اس کی اشاعت ان کی وفات کے ۱۱ سال بعد ہوئی۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ترقی اردو بیورو نئی دہلی سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں۔ مزید دو اور ایڈیشن اس ادارے سے شائع

ہوئے۔ ۲۰۰۴ء میں اس کا پانچواں ایڈیشن قومی کونسل نے شائع کیا، اور اب یہ کتاب مستقل اسی ادارے سے شائع ہو رہی ہے۔ میرے پیش نظر جائزے کے لیے قومی کونسل کا آٹھواں ایڈیشن ہے جس پر سنہ اشاعت ۲۰۱۱ء درج ہے۔ ابتدا میں پیش لفظ ہے جس میں قومی کونسل کے مقاصد اور اہمیت کو بیان کیا گیا ہے، مگر کتاب کے موضوع اور اس کی اہمیت کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ البتہ کتاب کی غلطیوں سے آگاہ کرنے کی درخواست ضرور کی گئی ہے تاکہ اس کے اگلے ایڈیشن میں اس کی تصحیح کی جا سکے۔ گیان چند جین کے مطابق احتشام حسین کی یہ کتاب دراصل (اردو ساہتیہ کا اتیہاس، دسمبر ۱۹۵۴ء) کا اردو ترجمہ ہے۔ انھوں اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں زیر نظر کتاب کے حوالے سے کئی اہم معلومات فراہم کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''احتشام صاحب نے سوچا کہ ہندی کے علاوہ یہ کتاب اردو میں بھی شائع ہونی چاہیے۔ غالباً مصروفیت کی وجہ سے احتشام صاحب نے خود یہ کام نہیں کیا، بلکہ لکھنؤ کے اہل علم چودھری سبط محمد نقوی سے کرایا۔ چودھری صاحب قسطوں میں ترجمہ کر کے احتشام صاحب کو بھیجتے رہتے تھے، احتشام صاحب کو کہیں کوئی خفیف سی ترمیم یا اضافہ کرنا ہوتا تو کر دیتے...... میں نے ہندی کے نقش اول 'اردو ساہتیہ کا اتیہاس ۱۹۵۴ء' اور اردو کتاب کا مقابلہ کیا ہے۔ دونوں کتابیں بہت کچھ یکساں ہیں۔''[۱۱۴]

اس کتاب میں چودہ ابواب ہیں جنھیں مختلف عنوانات کے تحت ترتیب دیا گیا ہے۔ پہلا باب ''اردو زبان اور ادب کی ابتدا'' کے عنوان سے ہے جس میں مصنف نے اردو کی لسانی تاریخ کو سیاسی، سماجی اور تاریخی پس منظر میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ سلجھے ہوئے انداز میں پیش کیا ہے۔ مصنف کے مطابق ہندوستان میں ۱۷۹ زبانیں اور ۵۴۴ بولیاں پائی جاتی ہیں، مگر ان میں بہت سی وہ زبانیں بھی شامل ہیں جن کے بولنے والے یا تو کسی چھوٹے سے علاقے میں محدود ہیں یا اتنے کم ہیں کہ ملک کی لسانی تاریخ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اسی طرح بیشتر بولیاں ایسی ہیں جو دوسری زبانوں کی تابع ہیں۔ اس لیے جب کسی ایسی زبان کی تاریخ لکھنے کا اہتمام کیا جائے جس نے ملک کی ثقافتی ترقی میں موثر حصہ لیا ہے اس وقت

یہاں ان سبھی بڑی بڑی زبانوں اور بولیوں کو نظر میں رکھنا ہوگا، جن سے تہذیبی اختلاط، علاقائی قرب یا لسانی تعلق کی بنا پر اس کا رابطہ رہا ہے۔۱۱۵

اردو زبان کی تشکیل کے ضمن میں مصنف کا غالب رجحان دہلی کو اردو کی جنم بھومی ماننے کی طرف ہے، اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ دلّی کی فوجوں میں ہر جگہ کے لوگ ہوتے تھے، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں تھے۔ ان میں سے بیشتر فارسی اور سنسکرت سے ناواقف تھے۔ اس لیے ان کے باہم ربط کا وسیلہ کوئی ایسی زبان ہوسکتی تھی جس میں ضرورت کے مطابق فارسی، عربی اور سنسکرت الفاظ کا استعمال ہوتا ہو، اور یہ زبان مصنف کے مطابق دلّی کے دارلسلطنت ہونے کے سبب سے کھڑی بولی کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتی تھی۔ اس حوالے سے مصنف کئی اور نظریات کا ذکر کرتے ہیں لیکن وہ ان میں سے کسی نظریہ کو صحیح نہیں مانتے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''کچھ مصنف اردو کا ارتقا سندھی میں ڈھونڈتے ہیں (جیسے مولانا سید سلیمان ندوی) کچھ دراوڑ زبان سے اس کا رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں (جیسے پاکستان کے سہیل بخاری) کچھ یہ کہتے ہیں اس کے قواعد کا خاکہ پالی میں ملے گا (جیسے پاکستان کے شوکت سبزواری) مگر جسے بھی لسانیات اور ہندوستان میں لسانی ارتقا کا علم ہے وہ ان میں سے کوئی بات تسلیم نہیں کرسکتا......اردو نہ بدیسی بھاشا ہے، نہ وہ سندھ میں پیدا ہوئی ہے نہ جنوبی ہند میں، نہ پنجاب سے نکلی نہ برج بھاشا سے، بلکہ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے (یعنی دلّی اور اس کے اطراف)''۱۱۶

اردو کے ارتقا کے سلسلے میں یہ نظریہ مسعود حسین خاں، سید احتشام حسین سے قبل پیش کر چکے ہیں، جو کہ اب تک کی تحقیق کے مطابق سب سے راجح نظریہ ہے۔ اسی باب میں امیر خسرو کا ذکر کرتے ہوئے احتشام حسین ان سے منسوب ہندی کلام میں سے بعض کو خسرو کی تخلیق مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور ایسا کرنے کا وہ کوئی جواز بھی پیش نہیں کرتے۔ ان کے مطابق:

''فارسی کے علاوہ خسرو نے عوامی زبان میں بہت سی نظمیں، دوہے،

پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں لکھی ہیں۔اس میں شبہہ نہیں کہ ان میں سے
سبھی تخلیقات جوان سے منسوب ہیں ان کی نہیں......''۱۱۷

اسی طرح 'خالق باری' کے بارے میں احتشام حسین یہ لکھتے ہیں:

''جو خالق باری ہم کو آج دستیاب ہوتی ہے اس میں بہت سا حصہ بعد
میں دوسروں نے اضافہ کر دیا ہے، اور جو کچھ خسرو نے لکھا تھا اسی میں
گم ہو گیا ہے۔''۱۱۸

مگر اس سلسلے میں بھی سید احتشام حسین نے کوئی وضاحت نہیں کی کہ کون سا حصہ 'خالق باری' میں اضافہ شدہ ہے اور اصل کیا ہے جو اس میں گم ہو گیا ہے۔اسی طرح وہ خسرو کے کچھ اشعار یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ ''اگر چہ کچھ علما کو انہیں بھی خسرو کی تصنیف ماننے میں کلام ہے۔'' مگر یہاں بھی انہوں نے کوئی وضاحت یا صراحت نہیں کی ہے کہ کس غزل کے کون سے اشعار ہیں جنہیں علما امیر خسرو کی تصنیف نہیں مانتے ہیں۔بہر حال ان میں سے ایک غزل ''زحال مسکیں مکن تغافل دورائے نینا بنائے بتیاں'' کے تین اشعار نقل کیے گئے ہیں۔اس غزل کے حوالے سے گیان چند جین نے اپنی تاریخ کے جلد اول میں بڑی تفصیلی بحث کی ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ غزل امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے۔بلکہ گیارہویں صدی ہجری کی تحریر کردہ ایک بیاض کے مطابق کسی مجہول الحال شاعر جعفر سے منسوب ہے۔نیز چند اور روایتوں سے بھی اس غزل کا انتساب جعفر سے ہوتا ہے۔اس بنا پر گیان چند جین قطعی فیصلہ دیتے ہیں کہ یہ غزل امیر خسرو کی نہیں ہے۔''۱۱۹

دوسرا باب ''اردو دکن میں'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں احتشام حسین نے دکنی ادب کو تین حصے میں تقسیم کر کے اسے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔پہلا حصہ صوفیانہ ادب کا حامل ہے۔دوسرا حصہ بہمنی سلطنت کے خاتمے اور اور بیجا پور و گولکنڈہ میں تخلیق ہونے والے ادب کا ہے۔تیسرا حصہ مغل دور میں جمع ہونے والے سرمایۂ ادب کا ہے۔ان تینوں حصوں کے ادب کو احتشام حسین نے اپنی کتاب میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔مگر یہاں بھی پچھلے باب کی طرح احتشام حسین بسا اوقات اختلافی باتوں کا ذکر بھی اپنی حتمی رائے کے بغیر کرتے نظر آتے ہیں۔مثلاً خواجہ بندہ نواز سے منسوب کتاب 'معراج العاشقین' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کوئی پچاس برس پہلے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی ایک کتاب جس کا نام معراج العاشقین ہے، ملی اور اسے اردو کی پہلی نثری کتاب مان کر شائع کیا گیا۔ کئی علما کو اس میں شک ہے کہ یہ خود گیسو دراز کی تصنیف ہے، بلکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کے خیالات کو کچھ دن بعد کسی دوسرے شخص نے مدون کر دیا یا یہ کسی اور صوفی کی کتاب ہے جو ان سے منسوب ہوگئی ہے۔''۱۲۰

یہاں احتشام حسین یہ نہیں بتاتے کہ وہ کون سے علما ہیں جنہوں نے اس کتاب کو خواجہ بندہ نواز سے انتساب کو غلط سمجھا ہے، اور نہ خود انھوں نے اس کتاب کے سلسلے میں کوئی واضح اور تحقیقی بات کہی ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے جو گیان چند جین اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''احتشام حسین صاحب نے اپنی ہندی تاریخ جب پریس میں دی ہوگی اس وقت تک ڈاکٹر حفیظ قتیل کی تحقیق سامنے نہیں آئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ گیسو دراز کی کتابوں میں 'معراج العاشقین'، 'شکارنامہ' اور 'تلاوۃ الوجود' کا ذکر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر حسینی شاہد اور بنگلور کے ڈاکٹر محمد نورالدین سعید نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ خواجہ سے منسوب کوئی اردو رسالہ ان کا نہیں ہے۔''۱۲۱

احتشام حسین مثنوی ''چندر بدن و مہیار'' کا مصنف فارسی شاعر مقیمی کو بتاتے ہیں (ص:۳۲) ڈاکٹر جمیل جالبی نے یہ واضح کیا ہے کہ محمد مقیم فارسی کا شاعر تھا، مقیمی مصنف ''چندر بدن و مہیار'' اس سے الگ شخصیت ہے جو دکنی کا شاعر ہے۔۱۲۲ نصرتی کی ''تاریخ سکندری'' کے بارے میں احتشام حسین یہ لکھتے ہیں کہ ''بعض علما کا خیال ہے کہ یہ نصرتی کی تصنیف نہیں ہے۔ (ص:۳۳) گیان چند جین لکھتے ہیں کہ مصنف کا یہ شبہہ بے بنیاد ہے۔ یہ مثنوی بالیقین نصرتی کی ہے۔۱۲۳ رستمی کی طویل مثنوی 'خاور نامہ' کا زمانۂ تصنیف احتشام کے مطابق تقریباً ۱۶۴۹ء ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء ہے۔۱۲۴ اسی طرح ولی دکنی کا سال وفات احتشام حسین کے مطابق ۱۷۰۷ء ہے۔ جمیل جالبی کی تحقیق یہ ہے کہ

ولؔی کی وفات ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۰ء- ۱۱۳۸ھ/ ۱۷۲۵ء کے درمیانی عرصے میں ہوئی ہے۔[۱۲۵]

تیسرا باب ''ولؔی اٹھارہویں صدی میں'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں احتشام حسین زمانی تسلسل کو پیش نظر رکھتے ہوئے متقدمین ،متوسطین اور متاخرین کی مبہم تقسیم کے حوالے سے ادب کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ باب کے ابتدا میں اردو کی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے وہ جائسی ،قطبن ،میرؔا اور تلسی داس کی تخلیقات کے کچھ حصوں کو اردو کا ابتدائی روپ بتاتے ہیں،مگر کوئی دائمی اور حتمی رائے نہیں دیتے کہ کیا ان شعرا کا کلام اردو کی تاریخ میں شامل کرنا چاہیے یا نہیں۔اور نہ ہی ان شعرا کے بارے میں کوئی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔اس باب میں مصنف کے مطابق صرف انہیں ادیبوں اور شاعروں کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے جن سے واقفیت اردو ادب کی ترقی اور توسیع کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

اس باب میں جن شعرا و ادبا کا ذکر کیا گیا ہے ان سے متعلق کوئی خاص تفصیل نہیں ملتی،اسی طرح اس باب میں کہیں سنین کا التزام کیا گیا ہے اور کہیں نہیں کیا گیا ہے۔اور جہاں سنین کا التزام کیا گیا ہے ان میں سے بعض درست نہیں۔مثلاً احتشام حسین شاہ مبارک آبرؔو کا سنہ وفات ۱۷۳۴ء لکھتے ہیں،جمیل جالبی کے مطابق ۱۱۴۶ھ/ ۱۷۳۳ء ہے۔شاکر ناجی کا انتقال احتشام حسین کے مطابق تقریباً ۱۷۵۴ء میں ہوا ،جمیل جالبی کی تحقیق یہ ہے کہ شاکر ناجی کا انتقال ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء کے بعد اور ۱۱۶۵ھ/ ۱۷۵۲ء سے پہلے ہو چکا تھا۔اسی طرح شاہ حاتم کا سنہ وفات احتشام حسین کے مطابق ۱۷۸۱ء یا ۱۷۹۲ء ہے۔جمیل جالبی کے مطابق شاہ حاتم کی وفات ۱۱۹۷ھ/ ۱۷۸۳ء میں ہوئی۔[۱۲۶] مرزا مظہر کا سنہ وفات احتشام حسین ۱۷۹۱ء لکھتے ہیں،جب کہ جمیل جالبی درست سال وفات ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء بتاتے ہیں۔[۱۲۷]

اس باب میں جہاں چند خامیاں ہیں وہیں بہت ساری خوبیاں بھی موجود ہیں۔ان میں ایک خوبی یہ ہے کہ شمالی ہند کے شعرا کا تعارف کراتے ہوئے احتشام حسین نے صرف ان کے کلام وفن کا جائزہ نہیں لیا بلکہ ان کے کلام میں موجود سماجی ،سیاسی اور تہذیبی حالات کے اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے،جس سے اس تاریخ میں تاریخی واقعات کے مختصر بیان کے باوجود ایک وسعت اور تازگی کا احساس ابھرتا ہے۔اس باب کے آخر میں پورے دور پر تبصرہ کرتے ہوئے احتشام حسین لکھتے ہیں:

''اردو شاعری کا یہ دور صرف اس لیے اہم نہیں کہ اس دور نے

> دؔرد، سوؔدا، میؔر کو پیدا کیا، بلکہ اس دور میں اردو ادب کی جڑیں پوری طرح زندگی میں پھیلیں اور عظیم شاعروں نے اس مٹتی ہوئی ثقافت کی تصویر کشی کر کے تاریخی اہمیت کا کام انجام دیا۔" ۱۲۸

چوتھا باب ''اردو نثر کی ابتدا اور تشکیل'' ہے۔ اس باب میں صنف نثر کے تین سو سالہ دور کے آغاز وارتقا کی داستان مختصراً بیان کی گئی ہے۔ بقول افشاں زوار اس باب میں بھی مصنف کے دور کی روایتی غلطی یعنی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کو تین اردو کتابوں کا مصنف بتانا، دہرائی گئی ہے۔ جب کہ بعد کی تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ خواجہ بندہ نواز سے منسوب اردو رسائل یا کتب ان کے دور کے بعد کی تصنیف ہے۔ اسی طرح احتشام حسین شاہ عماد پھلواروی کو ایک نثری تصنیف ''سیدھا راستہ'' کا مصنف بتاتے ہیں۔ گیان چند جین کے مطابق یہ کتاب شاہ عماد پھلواروی کی نہیں، بلکہ یہ تمنا عمادی مجیبی پھلواروی کی وضع کی ہوئی جعلی کتاب ہے۔ ۱۲۹ اس باب کے آخر میں احتشام حسین دکنی نثر کی دو غیر معروف کتابوں کا ذکر کرتے ہیں۔ پہلی ایک تاریخی کتاب ہے جس میں تیمور کے حملۂ ہندوستان سے لے کر ۱۷۸۰ء تک کے تاریخی واقائع کا ذکر ہے۔ دوسری کتاب ۱۷۹۸ء کی ''بہار نامہ'' ہے جس میں شرنگا پٹم کی تاریخ ٹیپو سلطان کی جنگ تک بیان کی گئی ہے۔ گیان چند جین کے مطابق مذکورہ پہلی کتاب غلام امام خاں ہجر کی ۷۹۰ صفحات کی ''تاریخ رشید الدین فانی''، طبع ۱۲۷۰ھ ہے۔ اس کتاب کا ذکر ''دکن میں اردو'' اور ''فہرست مخطوطات آصفیہ لائبریری''، جلد اول ص: ۴۴-۲۴۱ پر ہے۔ دوسری کتاب ''بہادر نامہ'' کے بارے میں گیان چند جین بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ ۱۳۰

پانچواں باب ''اودھ کی دنیائے شاعری'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں لکھنوی شعرا کا مختصر تعارف اور ان کی شاعری کے خصائص بیان کیے گئے ہیں۔ بعض شعرا کے تعارف میں کچھ غلطیاں بھی ہیں، جن کی تصحیح گیان چند جین نے اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' (ص: ۴۵۹) میں کی ہے۔ مثلاً انشؔا کے بیان میں احتشام حسین لکھتے ہیں ''انشؔا اس زمانے میں دہلی آئے جس وقت شاہ عالم کی آنکھیں نکالی جا چکی تھیں۔'' گیان چند جین کے مطابق یہ درست نہیں ہے۔ انشؔا شاہ عالم کے اندھا کیے جانے سے قبل دہلی جا چکے تھے۔ اسی طرح ناسؔخ کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ ''انہوں نے ایک مثنوی مذہبی موضوع پر لکھی

ہے،جس کا نام ''سراج نظم'' ہے۔ یہ اس لحاظ سے غلط ہے کہ ناسخ نے ایک مثنوی نہیں بلکہ چار مثنویاں لکھی تھیں۔ دبیر کے بارے میں احتشام کا یہ خیال ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد مرشد آباد اور پٹنہ گئے۔قاضی عبدالودود کے حوالے سے گیان چند جین یہ لکھتے ہیں کہ ''پٹنہ جانے کی بات درست ہے، مرشد آباد جانے کی بات غلط ہے۔ دبیر کے شاگرد میر محمد رضا نے یہ واضح کیا ہے کہ دبیر نے مرشد آباد کبھی نہیں دیکھا۔'' دیا شنکر نسیم کے ذکر میں احتشام حسین لکھتے ہیں'' کہا جاتا ہے کہ انہوں نے 'الف لیلہٰ' کی کچھ کہانیوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا تھا،لیکن وہ دستیاب نہیں۔'' گیان چند جین کے مطابق یہ تسامح افسوس ناک ہے۔'الف لیلہٰ' کے ابتدائی حصے کا منظوم ترجمہ اصغر علی خان نسیم دہلوی نے کیا تھا جو نول کشور پریس سے شائع ہوا اور اب بھی 'الف لیلہٰ منظوم' کے حصہ اوّل کی شکل میں ملتا ہے۔''[۱۳۱]

چھٹا باب ''نظیر اکبرآبادی اور ایک خاص روایت کا ارتقا'' کے عنوان سے ہے۔نظیر اکبرآبادی کے لیے سب سے پہلے رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' میں ایک باب مختص کیا تھا۔اس کے بعد اکثر مورخین نے اپنی کتابوں میں نظیر اکبرآبادی کو الگ باب میں جگہ دی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ نظیر کی شاعری اپنی ایک الگ شناخت رکھتی ہے۔انہوں نے دبستان لکھنؤ کی جوانی کا نکھار بھی دیکھا اور میر وسودا کی بہار سخن بھی دیکھی،لیکن ان کی آزاد طبیعت نے انہیں کسی دبستان کا پابند نہیں ہونے دیا۔وہ زندگی کے ہر پہلو کو شدت سے محسوس کرتے تھے،اور غور وفکر کے بعد اپنی شاعری کا موضوع انہیں مسائل کو بناتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ مورخین ادب نے انہیں ایک الگ باب میں جگہ دے کر ان کی شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔بقول احتشام حسین:

> ''نظیر کی شعر گوئی کا بیان اس لیے کیا گیا ہے کہ تھوڑا بہت رسمی اور مروج شاعری کی پیروی کرنے کے بعد بھی نظیر نے اپنا طرز سب سے الگ نکالا، وہ نہ دلّی کے مرکز میں رکھے جاسکتے ہیں اور نہ لکھنؤ کے مرکز میں۔وہ خود نئی روش کے موجد ہیں اور کسی بنائے راستے پر چلنے کے بجائے اپنی راہ آپ بنانے والے......''[۱۳۲]

ساتواں باب ''قدیم دلّی کی آخری بہار'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں ذوق، غالب،

مومنؔ، شاہ نصیر وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ خصوصاً غالبؔ کے ذکر میں احتشام حسین کی اپنی محبت اور پسندیدگی جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس پورے عہد کا سہرا غالبؔ کے سر یوں باندھتے ہیں:

''جو چراغ دلّی میں سوداؔ، دردؔ اور میرؔ نے جلایا تھا اسے اس عہد کے شعرا نے درخشاں کر دیا۔ خاص کر غالبؔ نے زندگی کی بجھتی ہوئی راکھ کو کرید کر ایسی چنگاری نکالیں جن میں جوالامکھی کی گرمی اور روشنی دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے شیریں نغمات میں ایک ایسی دردمندی کا احساس ہوتا ہے جو ایک فنا ہوتی ہوئی ثقافت ہی عطا کر سکتی ہے۔''۱۳۳؎

آٹھواں باب ''اردو نثر: فورٹ ولیم کالج اور اس کے بعد'' کے عنوان سے ہے۔ باب کے ابتدا میں مغلیہ سلطنت کے کمزور ہونے کی وجہ اور انگریز کی نئی حکمت عملی اور عیسائی مبلغین کی پالیسی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد فورٹ ولیم کالج اور اسے باہر لکھی جانے والی نثر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ میر امن کے ذکر میں احتشام حسین ان کے نام کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''غالباً ان کا نام میر امان تھا۔'' رشید حسن خاں کے مطابق ان کا صحیح نام میر امن ہے۔''۱۳۴؎ رجب علی بیگ سرور کے بارے میں احتشام حسین یہ لکھتے ہیں کہ: ''اودھ کے بادشاہ غازی الدین حیدر نے کسی بات پر ناراض ہو کر انہیں لکھنؤ بدر کر دیا اور سرور کان پور چلے گئے۔'' (ص: ۱۵) یہ درست نہیں ہے۔ گیان چند جین نیر مسعود کی کتاب ''رجب علی بیگ سرور'' کے حوالے سے یہ واضح کرتے ہیں کہ سرور قتل کے ایک معاملے میں ملوث تھے، اس سے بچنے کے لیے از خود لکھنؤ سے کان پور چلے گئے تھے۔۱۳۵؎

نواں باب ''نئے دور سے پہلے: نظم و نثر'' اس باب میں رام پور، حیدر آباد اور لکھنؤ کے آخری دور کے شعرا کا ذکر کیا گیا ہے، اور باب آخر میں پورے دور سے متعلق مختصر تبصرہ پیش کیا گیا ہے۔ احتشام حسین کے مطابق یہ وہ دور تھا کہ ملک کا جاگیردارانہ عہد مٹ کے بھی مٹا نہیں تھا اور نئی بیداری ابھی کچھ لوگوں کے ذہنی افق ہی کو چھو سکی تھی، اس لیے نئی اور پرانی لہریں متوازی چل رہی تھیں، جس کی وجہ سے اس عہد کا تجزیہ کرنا ان کے لیے آسان نہیں تھا۔ باوجود اس کے احتشام حسین نے اس عہد کے شعرا اور ان کی شاعری پر جو تبصرہ کیا ہے وہ ان کے مشاہدے کی گہرائی اور وسعت نظر کا ثبوت ہے۔ اس باب میں داغؔ کے ذکر میں

احتشام حسین لکھتے ہیں:

''ابتدا میں حیدر آباد میں ان کی زیادہ پوچھ گچھ نہ ہوئی اور وہ دلّی لوٹ آئے، مگر ۱۸۹۱ء میں حیدر آباد کے نظام محبوب علی خان نے انہیں بلا بھیجا اور ایک ہزار روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔''۱۳۶

''مطالعۂ داغ'' میں حقیقت اس سے مختلف نظر آتی ہے، محمد علی زیدی کے مطابق محبوب علی خان نظام نے داغ کو نہیں بلوا بھیجا تھا، بلکہ داغ خود پریشان حال ۳ یا ۴ اپریل ۱۸۹۰ء کو حیدر آباد پہنچے، اور مولوی ظہور علی ساکن اٹاوہ کے مکان پر قیام کیا۔ ۶/فروری ۱۸۹۱ء کو نظام نے اپنی غزل اصلاح کے لیے بھیجی اور داغ نے اسی وقت غزل کی اصلاح کی اور اسے واپس کر دیا۔ اس وقت تک کوئی تنخواہ مقرر نہیں ہوئی تھی۔ اس واقعہ کے تقریباً ۹/ مہینے بعد ۱۴/ اکتوبر ۱۸۹۱ء کو ان کی تنخواہ ۴۵۰ روپے مقرر کی گئی۔ ۱۳۷

دسواں باب ''نیا شعور اور نیا نثری ادب'' ہے۔ اس باب میں احتشام حسین نے یہ تجزیہ پیش کیا ہے کہ انگریزی تسلط اور انگریزی تعلیم کے اثرات سیاسی، سماجی اور ادبی ماحول پر کیا پڑے۔ اس پس منظر میں وہ سماجی وتہذیبی تبدیلیوں کا جائزہ لیتے ہیں اور ان کے زیر اثر ہونے والی ادبی تبدیلیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ احتشام حسین کے مطابق اس نئے سیاسی، سماجی اور اقتصادی پس منظر میں بہت سی نئی اصناف پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں۔ بقول افشاں زوار اس تاریخ میں پہلی بار اقتصادی اور معاشی عنصر کو ایسی طاقت تسلیم کیا گیا جو سیاسی وسماجی حالات کی طرح شعر وادب پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ۱۳۸ علاوہ ازیں ایسٹ انڈیا کمپنی اور انگریزی تعلیم کے زیر اثر پیدا شدہ متوسط طبقے کے مزاج اور ذہنیت کے حوالے سے بھی اس باب میں بحث کی گئی ہے۔ اس بحث کے بعد سر سید احمد خاں، محمد حسین آزاد، حالی، شبلی، نذیر احمد، محمود شیرانی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور وغیرہ کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ سر سید احمد خاں کے ذکر میں ان کے اخبار کا نام احتشام حسین ''علی گڑھ سائنٹفک گزٹ'' بتاتے ہیں، جب کہ صحیح نام ''علی گڑھ انسٹیوٹ گزٹ'' ہے۔

گیارہواں باب ''نشاۃ ثانیہ کی اردو شاعری'' کے عنوان سے ہے۔ احتشام حسین کے مطابق اس باب میں نئے شعور سے معمور اور رسوم وقیود کی پیروی کرنے والے ان شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے کسی قسم کی اہمیت حاصل کی ہے۔ ایسے شاعروں میں حالی، اکبر الہ آبادی، چکبست، سرور جہاں آبادی،

اقبال، اصغر گونڈوی، فانی اور یگانہ وغیرہ شامل ہیں۔اس باب میں وقت اور زمانے کا تعین سنین کے حوالے سے نہیں کیا گیا ہے جس کی بنا پر اس کا تاریخی پہلو کمزور سا محسوس ہوتا ہے۔اس باب میں چکبست کا شعری مجموعہ ''صبح وطن'' کے بارے میں احتشام حسین یہ لکھتے ہیں کہ چکبست نے اپنا یہ شعری مجموعہ انتقال سے قبل ہی شائع ہونے کے لیے بھیج دیا تھا،مگر وہ ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔گیان چند جین اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں ''مقدمۂ کلیات چکبست'' سے کالی داس گپتا رضا کا بیان نقل کر کے یہ بتاتے ہیں کہ ان کا یہ شعری مجموعہ پہلے ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا جس وقت وہ باحیات تھے۔اس کا دوسرا ایڈیشن ان کے انتقال (۱۲/فروری ۱۹۲۶ء) کے بعد اسی سال میں سر تیج بہادر سپرو کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا۔۱۳۹ علامہ اقبال کی تخلیقات کا ذکر کرتے ہوئے احتشام حسین ان کی پہلی نظم کا نام ''ہمالیہ'' بتاتے ہیں یا یہ ہوسکتا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہو۔اس کا صحیح نام ''ہمالہ'' ہے۔

بارہواں باب ''نظم میں نئی سمتیں'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں ۱۹۳۰ء کے بعد کی سیاسی،معاشی اور معاشرتی حالات کے زیر اثر ادب میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں اور اس دور کے اہم شعرا مثلاً جوشؔ،فراقؔ،حفیظ جالندھری،اختر شیرانی،مجاز،جاں نثار اختر،سردار جعفری وغیرہ کی شاعری کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ویسے یہ باب گیارہویں باب کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔

تیرہواں باب ''نثر کے نئے روپ'' کے نام سے ہے۔اس باب میں ناول،افسانہ،تنقید،تحقیق اور مزاحیہ ادب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔مزاحیہ ادب کے ضمن میں اس کے موضوعات کے حوالے سے احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''اردو میں مزاحیہ نگاری کی روایت انیسویں صدی کے آخری برسوں میں 'اودھ پنچ' نے شروع کی تھی،اور جیسے جیسے ہندوستان میں نئے اور پرانے کی کشمکش بڑھتی گئی،اخلاقی زندگی مضمحل ہوتی گئی اور سیاسی وسماجی کیفیت پیچیدہ ہوتی گئی،اتنا ہی طنز ومزاح کے لیے موضوع ملتے گئے۔''۱۴۰

اس باب میں اختر اورینوی کی تخلیقات کے ذکر میں ان کی دو کتابوں کا نام یوں لکھا ہے۔

''بہار میں اردو''،''زبان وادب'' دراصل یہ دو نہیں بلکہ ایک ہی کتاب ہے جسے کاتب نے دو بنا

دیا ہے۔ یہ اختر اورینوی کا تحقیقی مقالہ ''بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا'' ہے۔

چودھواں باب ''موجودہ ادبی صورت حال'' ہے۔اس باب میں آزادی کے بعد کی سیاسی وسماجی صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے،اور یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس صورت حال کے ادب پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ساتھ اس باب میں احتشام حسین نے معاصر شعرا وادبا کا بھی ذکر کیا ہے۔ان کے مطابق ادب کی ایک مبسوط تاریخ میں محض ان مصنفوں اور شاعروں کا ذکر کافی نہیں جنہوں نے تخلیقی ادب کی تصنیف کی بلکہ ادب کے لیے فضا تیار کرنے میں اخبارات ورسائل،ادبی انجمنوں اور افراد کی جدوجہد کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے، جو فنکار کی تخلیقی قوت کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔[۱۴۱]

ڈاکٹر سید احتشام حسین کی یہ تاریخ چوں کہ موضوع کے اعتبار سے تنقیدی تاریخ ہے،اور اس میں پہلے سے معلوم تاریخ کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا گیا ہے،لہٰذا اس کتاب میں کسی نئی معلومات یا کسی گم شدہ کڑی کا سراغ نہیں ملتا۔بقول افشاں زوار ایک اچھی ادبی تاریخ میں زبان وادب کے ارتقائی مطالعے کے ساتھ ساتھ شعرا وادبا کا ذہنی ونفسیاتی مطالعہ،اس کے سماج اور معاشرے سے تعلقات، نیز ان کے سیاسی،سماجی اور اخلاقی افکار، ہر پہلو سے جائزہ لیا جاتا ہے۔احتشام حسین کی تاریخ میں بھی ان باتوں کا خیال رکھا گیا ہے،اور جن باتوں کا خیال نہیں رکھا گیا ہے اس حوالے سے گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''یہ مسلم ہے کہ احتشام حسین صاحب محقق نہ تھے،لیکن جب انہوں نے تاریخ ادب لکھنے کی ذمہ داری لی اور اس میں جگہ جگہ سنین درج کیے تو ان سے توقع کی جاتی ہے کہ ان کی درستی میں تھوڑی بہت کد بھی کریں گے، انہوں نے نہیں کی۔معلوم ہوتا ہے کہ جہاں بھی کوئی تاریخ لکھی دکھائی، اسے صدق ایمان کے ساتھ قبول کرلیا۔نتیجہ یہ کہ تاریخوں کے معاملے میں اس تاریخ ادب پر مطلق بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔''[۱۴۲]

اردو ادب کی مختصر تاریخ - ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' پہلی بار مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد سے ۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن اسی ادارے سے ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اس کتاب کے اب تک کئی اور ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔ میرے پیش نظر اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ہے جس کے آغاز میں 'عرض ناشر' کے تحت یہ بتایا گیا ہے کہ یہ تاریخ خاص طور پر ایم.اے اردو کی نصابی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ ۲۱ صفحے کی طویل فہرست کے بعد 'روبرو' کے عنوان سے ڈاکٹر انور سدید کتاب لکھنے کے مقصد، اہمیت وضرورت سے آگاہ کرتے ہیں۔ وہ اس کتاب کو اپنے پرانے خواب کی تعبیر بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ خواب میں نے 'اردو ادب کی تحریکیں' لکھنے کے بعد دیکھا تھا۔ اس کے عناصر ترکیبی میں ایک بات یہ بھی تھی کہ 'اردو ادب کی تحریکیں' میں متعدد ایسے ادیبوں کے کارنامے زیر بحث نہیں آسکے تھے جو تاریخ میں تو نمایاں مقام حاصل کر چکے ہیں، لیکن جنہیں کسی مخصوص تحریک کے مدار میں شامل کرنا ممکن نہ تھا......اس کتاب کو لکھنے کے بعد بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ ادبا کا حق ادا نہیں ہوا۔''[۱۴۳]

ڈاکٹر انور سدید کا یہ احساس کہ ادبا کا حق ادا نہ ہوا بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ اردو ادب کا دائرہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ سات سو صفحوں کی کتاب میں محض اشارے ہی کیے جا سکتے ہیں، تاریخ کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اردو ادب کی تاریخ ایک جلد میں چاہے وہ ہزار صفحات پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو لکھی نہیں جا سکتی۔ اگر لکھی بھی گئی تو اس میں موضوع کے ساتھ انصاف نہیں ہوسکتا۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر انور سدید کی کوشش یہ رہی ہے کہ کوئی صنف، کوئی موضوع، کوئی نام چھوٹنے نہ پائے۔ ہمارے عہد کا کوئی معمولی سے معمولی ادیب

کیوں نہ ہو، وہ اپنا نام اس تاریخ میں تلاش کرے۔ کہیں نہ کہیں ٹنکا ہو
اضرور پائے گا۔ اس درگاہ سے کوئی نا امید نہیں جا سکتا۔ بدقسمت ہے وہ
ادیب جس کا نام اس تاریخ زریں میں رقم نہ کیا گیا ہو۔'' ۱۴۴؎

زیر بحث کتاب ۱۳/ ابواب پر مشتمل ہے، اور یہ تمام ابواب زیادہ تر زمانی دور کے مطابق ہیں۔ مورخ ادب کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ یہ رہتا ہے کہ تاریخ کے ابواب دور کے اعتبار سے دیئے جائیں، تحریکات یا رجحانات کے اعتبار سے دیئے جائیں یا اصناف کے اعتبار سے۔ ان میں سے کسی ایک کو ملحوظ خاطر رکھیں تو دوسرے تقاضے مسخ ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے اس کتاب میں زمانی تسلسل کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے، مگر ہر زمانی دور میں انہوں نے جو تقسیم کی ہے اس میں کہیں رجحانات، کہیں تحریکات اور کہیں اصناف کے حوالے سے کی ہے۔ یوں ایک زمانی دور میں موجود اصناف اور ان کے حوالے سے مشہور افراد کا جائزہ سامنے آ جاتا ہے۔ کتاب کا پہلا باب ''اردو زبان کی ابتدا: پس منظر اور قدیم'' روایت کے عنوان سے ہے۔ باب کے ابتدا میں سیاسی و معاشی پس منظر بیان کیا گیا ہے، اور اردو زبان کی ابتدا کے بارے میں مختلف نظریات کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں کئی ضمنی عنوانات بھی ملتے ہیں، مثلاً 'اردو کے مختلف نام'، 'اردو رسم الخط'، 'اردو طباعت'، 'قدیم اردو ادب کی اصناف' وغیرہ۔ 'اردو رسم الخط' کے ضمن میں ڈاکٹر انور سدید دو ہندوستانی لپیوں (رسم الخط) کا نام 'برہمی' اور 'کھر وشتی' بتاتے ہیں۔ ان میں سے موخر الذکر کا صحیح نام گیان چند جین کے مطابق 'کھروشٹھی' ہے۔ اس باب میں شاستروں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''اُپنشد ہندو فلسفہ و فکر کے اہم ماخذات ہیں، اور انہیں علم و دانش کی
تصنیفات میں شمار کیا جاتا ہے۔ کپل کا سانکو شاستر، پاتنجلی کا یوگ شاستر، اور
ویاس کا اترہما چند اہم شاستر ہیں جن کا اطلاق امور حیات پر بھی ہوتا
ہے۔ کچھ عرصے بعد 'رامائن' اور 'مہابھارت' جیسی کتابیں لکھی گئیں۔'' ۱۴۵؎

ان معلومات کی تصحیح کرتے ہوئے گیان چند جین لکھتے ہیں:

''کپل منی سانکیہ فلسفے کے اہم ستون ہیں۔ 'سانکو شاستر' ان کی کتاب

نہیں۔(اسی طرح)'اتر مہمانسا' کا صحیح نام'اتر میمانسا' ہے۔ یہ کتابیں
رامائن اور مہابھارت پر مقدم نہیں، کئی صدی موخر ہیں۔''۱۴۶؎

یہ باب اپنی جزئیات اور عنوانات کے اعتبار سے رام بابو سکسینہ کے باب اول کا عکس نظر آتا ہے، کیوں کہ ڈاکٹر انور سدید کی تاریخ میں بھی اردو رسم الخط، اردو کے مختلف نام، شاعری کے چند متعلقات، تخلص اور مشاعرہ کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

دوسرا باب ''اردو زبان وادب کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیا اور بھگتوں کا حصہ'' ہے۔اس باب میں خواجہ فرید گنج شکر، امیر خسرو، خواجہ بندہ نواز اور شاہ میراں جی شمس العشاق سے متعدد ایسی تخلیقات ڈاکٹر انور سدید نے منسوب کی ہیں جنہیں جدید تحقیق غلط ثابت کر چکی ہے۔ بقول گیان چند جین حیرت ہے کہ وہ ۱۸۹۸ء میں 'معراج العاشقین' کو خواجہ بندہ نواز کی تصنیف قرار دیتے ہیں، اور ان سے اس صاف زبان کے شعر منسوب کرتے ہیں:

پانی میں نمک ڈال مزا دیکھنا اسے
جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا اسے
(ص:۷۲)

یہ غزل بھی خواجہ بندہ نواز کی تخلیقات میں درج کرتے ہیں:

توں تو صحی ہے لشکری کر نفس گھوڑا سار توں

گیان چند جین کے مطابق اگر ڈاکٹر انور سدید 'علی گڑھ تاریخ ادب اردو' ص:۲۶۹ یا جمیل جالبی کی تاریخ جلد اوّل ص:۲۲۸ دیکھ لیتے تو انہیں پتا چل جاتا کہ یہ غزل خواجہ بندہ نواز کی نہیں خواجہ شہباز حسینی کی ہے۔۱۴۷؎ دوسری غزل کے تیسرے مصرع سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ غزل شہباز حسینی کی ہے۔

شہباز حسینی کھوئے کر، ہر دو جہاں دل دھوئے کر
(ص:۷۳)

تیسرا باب ''شمالی ہندوستان میں اردو ادب کا ارتقائی فروغ'' ہے۔اس باب کے ابتدا میں مختصر تمہید ہے جس میں مختصراً حضرت داتا گنج، اور مسعود سعد سلمان کا ذکر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے مطابق

مسعود سعد سلمان کے زمانے سے پہلے اردو زبان میں تخلیق شعر کا عمل شروع ہو چکا تھا، لیکن تا حال اس کا دستاویزی ثبوت نہیں ملا۔ اس کی ایک مثال خود مسعود سعد سلمان ہیں۔ لیکن دوسری طرف خود انور سدید انہیں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تصور کرتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

''مسعود سعد سلمان کو اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہونے کا اعزاز اس وقت تک حاصل رہے گا جب تک ان سے پہلے زمانے کے کسی شاعر کا دیوان دریافت نہیں ہوتا۔'' ۱۴۸؎

اس اقتباس میں ڈاکٹر انور سدید کا انداز بقول افشاں زوار مورخ سا نہیں ہے۔ کیوں کہ کوئی بھی مورخ بنا ثبوت وشہادت کے کسی بات کو بیان نہیں کرتا۔ ایک طرف ڈاکٹر انور سدید خود مانتے ہیں کہ مسعود سعد سلمان کا دیوان دریافت نہیں ہوا۔ دوسری طرف اس دیوان کو دیکھے بغیر انہیں اردو کا پہلا صاحب شاعر بھی تسلیم کرتے ہیں۔'' ۱۴۹؎

چوتھا باب ''جنوبی ہند میں اردو ادب کا ابتدائی فروغ'' ہے۔ یہ باب پانچ حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ 'اردو کا قدیم دکنی ادب ہے' دوسرا حصہ بیجاپور، تیسرا گولکنڈہ، چوتھا حصہ 'دکن میں اردو نثر' اور پانچواں حصہ ولؔی کا عہد ہے۔

اردو کے قدیم دکنی ادب میں 'بہمنی دور کے ملفوظات اور نظامی کی مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' کا ذکر ہے۔ اسی حصہ میں نظامی کی ایک اور مثنوی 'خوف نامہ' کا ذکر کرتے ہوئے مصنف اس کے دو شعر بھی نقل کرتے ہیں:

نہ بھائی کو بھائی مدد گار ہوئے
نہ کوئی یار کوں یار غمخوار ہوئے
میاں کوں نہ کوئی بھی آوے غلام
گواہ دین اس وقت اعضا غلام
(ص:۹۸)

گیان چند جین مثنوی 'خوف نامہ' کو نظامی کی تخلیق نہیں مانتے۔ ان کے مطابق مثنوی کی زبان بہت صاف ہے۔ یہ 'کدم راؤ پدم راؤ' کے شاعر کی تصنیف نہیں ہوسکتی۔ اس مثنوی کا ذکر کہیں اور نہیں

ملتا۔مولف کو اپنے ماخذ کی تفصیل دینی چاہیے تھی تا کہ انتساب کو پرکھا جا سکے۔اسی طرح ڈاکٹر انور سدید نے اشرف بیابانی کے ذکر میں ان سے ایک مثنوی 'واحد باری' منسوب کی ہے۔گیان چند جین کے مطابق یہ نظم نظام سکندر جاہ کے عہد کے کسی اشرف نامی شاعر کی ہے۔وہ مزید لکھتے ہیں کہ میں نے اس نظم کا مخطوطہ دیکھا ہے جس میں شاعر نے یہ اطلاع دی ہے کہ وہ بریلی یوپی کا رہنے والا ہے، جہاں سے حیدرآباد گیا۔۱۵۰ بیجا پور کے ضمن میں خواجہ بندہ نواز سے منسوب 'معراج العاشقین' کا انتساب بھی درست نہیں۔جدید تحقیق کے مطابق خواجہ بندہ نواز نے اردو میں کوئی رسالہ نہیں لکھا۔

پانچواں باب ''شمالی ہند میں اردو ادب کا صبح صادق'' کے عنوان سے ہے۔یہ باب چھ حصوں میں تقسیم ہے۔پہلے حصے میں شمالی ہند میں اردو شاعری کی روایت کا ذکر ہے۔اسی میں ایہام گو شعرا خان آرزوؔ، شاکر ناجیؔ، مضمونؔ، یک رنگؔ، اور غیر ایہام گو شعرا مظہر جان جاناں، یقینؔ، تاباںؔ، سوزؔ، فغاں وغیرہ کا مختصر تعارف اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔دوسرے حصے میں دردؔ، سوداؔ، میرؔ اور میر سوزؔ کی شاعری کا پر اثر تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔باب کے آخری حصے میں پورے دور پر تبصرہ ہے جو بہ ظاہر ایک صفحہ پر مشتمل ہے۔مگر اس اختصار میں جامعیت کی ہلکی سی جھلک بھی موجود ہے۔

چھٹا باب ''اردو ادب کا نیا مرکز: لکھنؤ'' کے عنوان سے ہے۔اس باب کے ابتدا میں مختصر سیاسی پس منظر اور نئے مرکز کے فروغ کے اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ساتھ ہی اصناف نظم و نثر کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔واسوخت کے ابتدائی نقوش کے سلسلے میں مصنف کا خیال ہے کہ سوداؔ کی ان غزلوں میں ملتے ہیں جن میں معاملہ بندی کا انداز موجود ہے۔گیان چند جین کے مطابق واسوخت کے ابتدائی نقوش سوداؔ سے قبل آبروؔ کے دیوان میں ملتے ہیں۔۱۵۱ ڈاکٹر انور سدید اس باب میں جرأت کا سنہ وفات ۱۸۱۰ء لکھتے ہیں، جمیل جالبی کے مطابق جرأت کا سنہ وفات ۱۸۰۹ء ہے۔اسی طرح آتشؔ کا سنہ وفات انور سدید کے مطابق ۱۸۴۶ء ہے اور جمیل جالبی کے نزدیک درست سنہ وفات ۱۸۴۷ء ہے۔۱۵۲

ساتواں باب ''نظیرؔ اکبر آبادی'' سے متعلق ہے۔غالباً رام بابو سکسینہ کے تتبع میں ڈاکٹر انور سدید نے نظیرؔ اکبر آبادی کا ذکر الگ باب میں کیا ہے، مگر نظیرؔ کے حوالے سے انہوں نے کوئی ایسی تفصیلی بحث نہیں کی ہے جس سے ان کا رنگ سخن واضح ہو سکے۔ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے باب کے آخر میں وہ لکھتے ہیں:

''نظیر کی خاص بات یہ ہے کہ وہ زمین کے ساتھ چمٹ جاتے ہیں اور
جملہ حواس خمسہ کو سیراب کرتے ہیں۔اس عمل میں ان کی عمومی پرواز
مدھم پڑ جاتی ہے۔نظیر کی بے تکلفی دل کو جھنجھلاتی ہے،لیکن روح کو
متحرک نہیں کرتی، وہ ہمیں لذیذ لگتے ہیں لیکن اکثر اوقات ابتذال
میں بھی بے محابا کود جاتے ہیں۔'' ۱۵۳؎

آٹھواں باب ''اردو نثر کے فروغ کے دوادارے'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں فورٹ ولیم کالج اور دلّی کالج کی ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے،اور ساتھ ہی ان اداروں سے متعلقہ افراد کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔میر امن کے ذکر میں ڈاکٹر انور سدید 'باغ و بہار' کے ماخذ کے سلسلے میں مولوی عبدالحق کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''باغ و بہار'' کا ماخذ نوطرز مرصع ہے۔لیکن میر امن نے اس کا ذکر دیباچے میں نہیں کیا۔(ص:۲۲۷) ڈاکٹر گیان چند جین یہ یاد دلاتے ہیں کہ انہیں محمود شیرانی کی اس تصحیح کا علم نہیں کہ 'باغ و بہار' کی طبع اول کے سرورق پر برملا اعلان تھا کہ:

''ماخذ اس کا 'نوطرز مرصع' کہ وہ ترجمہ کیا ہوا عطا حسین خاں کا'' ۱۵۴؎

آگے ڈاکٹر انور سدید یہ بھی لکھے ہیں کہ:''یہ داستان اتنی دلچسپ تھی کہ میر امن سے پہلے محمد عوض زرین نے بھی اس کا ترجمہ کیا۔''ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق اس بیان میں دو خرابیاں ہیں،اوّل یہ کہ زریں کا نام عوض نہیں،محمد غوث تھا،دوسرے یہ کہ اس نے میر امن سے پہلے ترجمہ نہیں کیا، بلکہ دونوں نے ۱۲۱۷ھ میں ترجمہ کر کے تاریخ 'باغ و بہار' نکالی ہے۔۱۵۵؎ نواں باب ''غالبؔ کا عہد'' ہے۔یہ باب چھ حصوں پر مشتمل ہے۔پہلا حصہ غالب کے عہد کے حوالے سے ہے۔اس میں غالبؔ اور ان کے ہم عصروں کا ذکر ہے۔دوسرا حصہ ''عہد غالبؔ کی نثر'' ہے۔اس میں اعظم علی مہجور،خواجہ امان،غلام غوث بے خبر وغیرہ کو جگہ دی گئی ہے۔تیسرا حصہ ''سفر نامہ'' کے ذکر پر مشتمل ہے۔چوتھا ''دینی ادب نثر میں'' پانچواں باب ''صحافت کا فروغ'' اور چھٹا باب ''تذکرہ نگاری کا زریں دور'' ہے۔

باب کے آغاز میں مختصر انداز میں انیسویں صدی کے نصف آخر کی منظر کشی کی گئی ہے،اور اس دور کا سیاسی و تہذیبی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔اس باب میں غالبؔ کا ذکر خاصا تفصیلی ہے۔ڈاکٹر انور سدید

نے خواجہ منظور حسین کی کتاب ''تحریک جدو جہاد بطور موضوع سخن'' کے حوالے سے غالبؔ کی شخصیت کا ایک نیا زاویہ پیش کیا ہے۔ان کے مطابق قوت عمل کا جذبہ غالبؔ نے غزل کے ایمائی انداز میں پیش کیا تو اس کا واقعاتی پس منظر تعمیم میں چھپ گیا،اور مستقبل کے نقاد جو اس پس منظر سے واقف نہیں تھے انہیں نئے معنی پہنانے لگے۔خواجہ منظور حسین نے غالبؔ کے بعض اشعار کا پس منظر متعین کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غالبؔ سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد کے ہم نوا تھے۔۱۵۶؎ علاوہ ازیں اس باب میں ڈاکٹر انور سدید 'دینی ادب' کا ذکر کرتے ہوئے اس سے متعلق اہل قلم کا تعارف بھی پیش کرتے ہیں۔باب کے آخر میں اس پورے دور پر مختصر تبصرہ ہے جس میں وہ ۱۸۵۷ء کو زمانی اور تاریخی اعتبار سے اہم قرار دیتے ہیں۔ان کے مطابق اس دور میں تین اصناف ادب کی طرف اولین پیش قدمی کے آثار نظر آتے ہیں۔اول 'ڈرامہ، دوم'سفر نامہ' سوم 'ڈائری نویسی' اس تبصرے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید ایک گہری بصیرت کے حامل نقاد ہیں جن کی نظر پورے دور پر ہے،وہ مورخانہ انداز میں کسی واقعہ کو مختصراً پیش کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔

دسواں باب ''سرسید احمد خاں کا عہد'' ہے۔یہ باب اٹھارہ حصوں میں تقسیم ہے۔اس باب کے پہلے حصے میں مختصر پس نظر ہے جس میں اس دور کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور سرسید کے ساتھ ان کے رفقا کا ذکر ''دبستان سرسید'' کے عنوان سے کیا گیا ہے۔دوسرے حصے میں ان افراد کا ذکر ہے جنہوں نے سرسید کے مقاصد اور نصب العین سے اختلاف کیا تھا۔تیسرے حصے میں ''فروغ نثر کے چند زاویئے'' کے عنوان سے نثر کی چند نئی ابھرنے والی اصناف کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔سفر ناموں کے ضمن میں بقول افشاں زوار اب تک دستیاب سفر ناموں میں حج کے قدیم ترین سفر نامے حاجی منصب علی خاں میرٹھی کے ماہ 'مغرب' کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔اس کے علاوہ اردو کے نئے مرکز لاہور اور انجمن پنجاب کا بھی تعارف پیش کیا گیا ہے۔باب کے آخر میں پورے عہد سرسید پر ایک مختصر مگر جامع تبصرہ ہے جس میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''سرسید تحریک کے اثرات بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں نظر آتے ہیں۔اس تمام عرصے میں ایک شکست خوردہ قوم نے

معاشرے میں باعزت طور پر بحال ہونے کی جدو جہد کی اوراس جد
وجہد کے مختلف زاویئے سامنے آئے۔سر سید نے علوم نو کے حصول
کے لیے انگریز سے مفاہمت کی راہ ہموار کی۔اکبر الہ آبادی نے
تہذیب مشرق کے تحفظ کی سبیل پیدا کی......اس تمام عرصے میں
انگریزی علوم اور سائنسی ایجادات کی یلغار اور انہیں مقبول بنانے کی
حکمت عملی اتنی تیز تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کا فکری تدبر بھی اس کے
آگے مناسب رکاوٹ کھڑی نہ کرسکا۔''۱۵۷

گیارہواں باب ''اقبال کا عہد'' ہے۔اس باب میں کئی اور ضمنی عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔مثلاً 'عہد اقبال میں اردو غزل' اردو نظم، مرثیہ بعد انیس، رومانی نثر کے معمار، مختصر افسانہ، ناول خطوط نگاری، خودنوشت، سفرنامہ، وغیرہ گویا یہ عنوانات قائم کر کے ڈاکٹر انور سدید نے اس پورے عہد کی مختلف اصناف اوران سے متعلق ادبا وشعرا کا جائزہ لیا ہے۔باب کے آغاز میں مختصر سیاسی، علمی وادبی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔اس کے بعد اقبال کے حالات زندگی اور ان کے کلام وفن کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔میر انیسؔ کے بعد کے مرثیہ نگاروں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔اس باب کے اگلے حصے میں ''رومانی نثر کے معمار'' کے عنوان سے رومانی دور کے نثر نگاروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔''مختصر افسانہ'' کے ضمنی عنوانات کے تحت اردو کے پہلے افسانہ نگار کی بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کے شائع شدہ افسانوں کا جائزہ لیتے ہیں، اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

''غربت وطن (اکتوبر،۱۹۰۶ء) جسے خود یلدرم نے طبع زاد قرار دیا ہے
اور یہ افسانہ چوں کہ پریم چند کے پہلے افسانے (روٹھی رانی،۱۹۰۷ء)
سے تقریباً ایک سال پہلے چھپ چکا تھا اس لیے اسے اردو کا پہلا طبع زاد
افسانہ اور یلدرم کو پہلا افسانہ نگار تسلیم کرنا مناسب ہے۔''۱۵۸

ڈاکٹر گیان چند جین اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں ص:۸۰۳ میں لکھتے ہیں کہ مرزا حامد بیگ نے ''اردو افسانے کی تاریخ'' میں راشد الخیری کے افسانے 'نصیر اور خدیجہ' (۱۹۰۳ء) کو اردو کا پہلا

افسانہ قرار دیا ہے۔اسی باب میں محققین اوراس وقت کے اہم نقادوں کا ذکر ملتا ہے۔ساتھ ہی سوانح نگار اورعہد اقبال میں جوخطوط سامنے آئے ہیں ان کا بھی مختصراً ذکر کیا گیا ہے۔

بارھواں باب''اردو ادب کی جدید تحریکیں'' کے عنوان سے ہے۔باب کے آغاز میں اقبال کی تحریک کے اثرات بیان کیے گئے ہیں۔اس کے بعد رومانی تحریک،ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق کے حوال وآثار دیئے گئے ہیں۔رومانی شعرا کے ضمن میں جوش،اختر شیرانی،حفیظ جالندھری،ڈاکٹر تاثیر، احسان دانش،روش صدیقی،وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔اسی باب میں''شاعری کا جہان دیگر'' کے ضمنی عنوان میں ڈاکٹر انور سدید ایسے شعرا کا ذکر کرتے ہیں جن کا فنی رویہ سبھی تحریکوں سے بالکل مختلف ہے۔ان میں مجید امجد،تخت سنگھ،شاد عارفی،مخمور جالندھری،اختر ہوشیار پوری وغیرہ شامل ہیں۔''تنقید کے تین زاویئے'' کے ضمنی عنوان میں رومانی تنقید،ترقی پسند تنقید اور نفسیاتی تنقید کے لکھنے والوں کا جائزہ لیا ہے۔'تنقید کا جہان دیگر''میں ڈاکٹر انور سدید ایسے ناقدین کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے کسی مخصوص تحریک سے وابستگی کے بجائے غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کیا۔ان میں صلاح الدین احمد،کلیم الدین احمد،عندلیب شادانی، اعجاز حسین،مسعود حسن رضوی ادیب اوراختر اور ینوی وغیرہ کا نام شامل ہے۔

اس باب کے آخر میں''دنیائے افسانہ'' کے ضمنی عنوان کے تحت افسانے کی مختلف اقسام اوران کے لکھنے والوں کا مختصر تجزیہ پیش کیا گیا ہے،اور ساتھ ہی رومانی اور ترقی پسند افسانہ نگاروں کا بھی مصنف نے جائزہ لیا ہے۔اس باب کی سب سے بڑی کمی بقول افشاں زوار یہ ہے کہ مصنف نے طرز تحریر اور اسلوب بیان کو سمجھنے کے لیے نمونے نہیں دیئے۔سب کے نہ سہی صرف اہم شعرا و ادبا کے ہی نمونے دے دیئے جاتے تو ایک طرف جہاں ان کے طرز تحریر سے آگاہی ہوتی وہیں یہ باب اور بھی زیادہ مفید ہو جاتا۔۱۵۹؎ اس باب کی دوسری خامی یہ ہے کہ اس میں سنین سے بے توجہی برتی گئی ہے،اس لیے یہ باب مکمل ہوتے ہوئے بھی تشنگی کا احساس رکھتا ہے۔

تیرھواں باب''آزادی کے بعد اردو ادب کا جدید دور'' کے عنوان سے ہے۔بقول مصنف یہاں لفظ'جدید'بہ اعتبار زمانہ استعمال کیا گیا۔باب کے آغاز میں سیاسی و ادبی پس منظر کا بیان ہے۔اس کے بعد اردو شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں سب سے پہلے غزل اور اینٹی غزل کا تعارف وتجزیہ پیش کیا

گیا ہے۔اینٹی غزل کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں:

''اینٹی غزل اکہری اور منفی تھی،اس نے غزل کی ایمائی اور رمزیاتی مزاج کو مجروح کیا،اس نے اردو غزل کی قدیم روایت کو شکستہ کیا۔گہری معنویت اور داخلی آہنگ کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور کھردرے،غیر حسی، ناشائستہ اور بے جذبہ اظہار کی طرح ڈالی۔چنانچہ اسے غزل کے بجائے غزل کی مضحک پیروڈی شمار کیا گیا۔''۱۶۰

'اردو نظم' کے ضمن میں بہت سے نظم گو شعرا کا تعارف کرایا گیا ہے۔جدید نظم کے علاوہ نثری نظم کا تعارف اور اس کے تجربہ کرنے والے شاعروں کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔مگر کسی شاعر کے کلام کا نمونہ پیش نہیں کیا گیا ہے۔'چند نئی اصناف سخن' کے ضمن میں ہائیکو،ترائیلے ،کافی ،سہ حرفی ،نظمانہ،خودفریبی اور آزاد غزل وغیرہ کا تعارف اور ساتھ ہی ایک ایک دو دو مثالیں بھی دی گئی ہیں۔'دینی شاعری' کے ضمن میں نعت اور مرثیہ لکھنے والوں کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔

نثر کی اصناف میں ناول،افسانہ،ناولٹ لکھنے والے مصنفین کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔اسی باب میں انشائیہ کا تعارف اور ساتھ ہی ''طنزیہ اور مزاحیہ ادب'' کے تحت نثر نگاروں،شاعروں اور کالم نگاروں کا تذکرہ بھی ہے۔'سفر نامے' کے ضمن میں اندرون ملک کے سفر ناموں،حج کے سفر ناموں کے ساتھ ساتھ ادبی سفر ناموں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں 'رپورتاژ' سوانحی ادب،اردو ڈرامہ،قلمی خاکے،اور خطوط نگاری کا تعارف اور لکھنے والوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔سوانحی ادب کی اقسام میں ڈاکٹر انور سدید نے 'یادنگاری' کے عنوان سے ماضی کی یادوں کو مجتمع کر کے لکھنے کے رجحان کو متعارف کرایا ہے۔ان کے مطابق معنوی طور پر یادنگاری کے نقوش بھی آپ بیتی کے ساتھ ملے ہوئے نظر آتے ہیں۔مثال کے طور پر انہوں نے سجاد ظہیر کی کتاب 'روشنائی' فیض احمد فیض کی 'مہ و سال آشنائی' اشفاق نقوی کی تصنیف 'جونا گڑھ کے آخری ایام' اور سبط حسن کی کتاب 'شہر نگاراں' کو پیش کیا ہے۔ادبی تحقیق کے ضمن میں ڈاکٹر انور سدید نے پہلی بار 'دبستانِ لاہور' اور 'دبستان کراچی' کی اصطلاحیں وضع کی ہیں۔اس حوالے سے گیان چند جین لکھتے ہیں:

''مجھے ان دونوں شہروں (لاہور،کراچی) کی تحقیق کا مابہ الامتیاز کا

عرفان نہیں۔شاید مولف دبستان کے لیے ایک مقام پر کچھ افراد کے
اجتماع کو کافی سمجھتے ہیں۔'' [۶۱]

ڈاکٹر افشاں زوار غالباً ڈاکٹر گیان چند جین کی اسی بات کی تردید کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''ڈاکٹر انور سدید نے صرف کسی ایک جگہ چند لوگوں کے اجتماع کو
دبستان سے تعبیر نہیں کیا بلکہ اس کے لیے انہوں نے چند مخصوص
مقاصد اور اصولوں کی پاس داری کو ضروری سمجھا ہے۔'' [۶۲]

پھر افشاں زوار دونوں دبستان کی خصوصیات سے معلق وہ اقتباس نقل کرتی ہیں جو انور سدید نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔طوالت کی وجہ سے ان اقتباس کو یہاں نقل نہیں کیا جا رہا ہے۔دبستان لاہور اور دبستان کراچی کے علاوہ بھی کئی دبستانوں کا ذکر انور سدید نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔مثلاً 'دبستان حسن عسکری، ایک منفرد تنقیدی دبستان (جس میں وزیر آغا، غلام جیلانی، اصغر، اعجاز فاروقی، مشتاق قمر وغیرہ شامل ہیں) ترقی پسند تنقید کا دبستان وغیرہ۔ایسے میں گیان چند جین کی بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ مولف دبستان کے لیے ایک مقام پر کچھ افراد کے اجتماع کو کافی سمجھتے ہیں۔

''ادبی صحافت'' کے ضمن میں ڈاکٹر انور سدید ایسے ادبی رسائل کا ذکر کرتے ہیں جو آزادی کے بعد ادب کی محرک قوت ثابت ہوئے۔مثلاً ادب لطیف، سویرا، مخزن، جریدہ، احساس، نیا دور اور صحیفہ وغیرہ۔اس کا اگلا حصہ ادبی تاریخ نگاری کا ہے، جس میں چند اہم ادبی تاریخوں کا نام اور اس کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔باب کے آخر میں 'آزادی کے بعد کے ادب پر عمومی تبصرہ' ہے۔اس حصے میں ڈاکٹر انور سدید نے مختلف اصناف کی اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں جو آزادی کے بعد انہیں درپیش تھیں، اس کے بعد ڈیڑھ صفحے کا 'اختتامیہ' ہے اور سب سے آخر میں ۳۰/صفحوں پر مشتمل کتابیات ہے جنہیں دیکھ کر بہ خوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید نے کتنے زیادہ ماخذوں سے استفادہ کیا ہے اور ان میں دی گئیں معلومات کا بلا واسطہ یا بالواسطہ فائدہ اٹھایا ہے۔بقول گیان چند جین کتاب میں اشاریہ نہیں جو تاریخ ادب کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔یوسف حسن نے زیر بحث کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مختلف قسم کی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ان میں سے چند کا ذکر یہاں مناسب حال ہوگا۔مگر اس سے قبل

انہوں نے چندسطروں میں ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' کا جو مجموعی جائزہ پیش کیا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں:

''اس کتاب میں مختلف اقسام کی غلطیاں اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ شاید ہی کوئی کتاب اس اعتبار سے اس کے مقابل ٹھہر سکے۔ راقم نے ابھی اس کے صرف پونے تین سو صفحات پڑھے ہیں، جن میں تقریباً ہر دوسرے، تیسرے صفحے پر کتابت یا املا کی اغلاط موجود ہیں۔ تحقیقی غلطیاں پچاس سے زیادہ ہیں۔ سرقوں اور تحریفوں کے نمونے تیس سے زائد ہیں۔ قواعد کی غلطیاں بھی جگہ جگہ موجود ہیں...... پچاس نثری اقتباسات ایسے ملتے ہیں جن کے مصنفوں اور کتابوں یا مخطوطوں کے نام تو لکھے گئے ہیں مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ اقتباسات متعلقہ کتابوں کے کون سے ایڈیشن اور کس صفحات پر موجود ہیں...... بعض اقتباسات ایسے بھی ہیں جن کے صرف مصنفین کے نام لکھے گئے ہیں اور ان کے ماخذ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا ہے۔''[۱۶۳]

اب وہ مثالیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا بقول یوسف حسن قارئین کی تفریح طبع کے لیے صرف تحریفوں اور سرقوں کی چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں:

(۱) حافظ محمود شیرانی کی رائے:

''سندھ پر محمد بن قاسم کے حملے کے وقت اردو کی داغ بیل پڑنا شروع ہو چکی تھی۔'' (اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص:۴۲)

مولف نے حافظ محمود شیرانی سے منسوب کر کے یہ فقرہ واوین میں لکھا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ یہ فقرہ انہیں الفاظ میں حافظ محمود شیرانی نے کہیں لکھا ہے۔ لیکن کس کتاب میں اس کے کون سے ایڈیشن میں اور اس کے کون سے صفحے پر درج ہے، مولف نے کچھ نہیں بتایا۔''

(۲) ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں: سر سید احمد خاں نے لکھا ہے کہ:

''جو زبان شاہی بازاروں میں مروج تھی اسی کو اردو زبان کہتے ہیں۔''

(ص،۴۹)

سرسید سے منسوب کر کے یہ فقرہ واوین میں لکھا ہے۔لیکن اس فقرے کے ماخذ کے بارے میں کوئی خبر نہیں دی گئی۔سرسید کے مقالات کے ایک مجموعے میں درج ذیل عبارت ملتی ہے۔اور مندرجہ بالا فقرہ دراصل اسی عبارت کی تحریف شدہ صورت ہے۔اصل عبارت یہ ہے:

''غرض کہ بادشاہی اور اردوئے معلیٰ میں ان دونوں زبان کی ترتیب سے نئی زبان پیدا ہو گئی،اور اسی سبب سے زبان کا اردو نام ہوا۔''

(مقالات ہفتہ،مجلس ترقی ادب لاہور،اکتوبر ۱۹۶۲ءص:۲۵۴)

(۳) اب سرقہ کی ایک مثال دیکھیے:

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

''تاریخی لحاظ سے ہمیں ہندوستانی لپی کا پہلا نمونہ اشلوک کے کتبوں میں ملتا ہے۔یہ لپی دو طرح کی ہے،برہمی اور کھروشٹی۔''(اردو شاعری کا مزاج،مکتبہ عالیہ،لاہور،۱۹۷۸ءص:۶۳۵)

ڈاکٹر انور سدید،ڈاکٹر وزیر آغا کے نام اور ان کی کتاب کا حوالہ دیئے بغیر لکھتے ہیں:

''تاریخی لحاظ سے ہندوستانی لپی کا پہلا نمونہ اشلوک کی کتابوں میں ملتا ہے،ان میں سے ایک لپی برہمی تھی دوسری کھروشٹی۔''(ص:۵۳)

(۴) ''برصغیر کے ایک وسیع خطے پر خودمختار اسلامی ریاست قائم ہوگی۔''(ص:۳۸)

یہ پورا فقرہ لفظ بہ لفظ سرقہ ہے اور اصل فقرہ شیخ محمد اکرام کا ہے وہ لکھتے ہیں:

''برصغیر کے ایک وسیع خطے پر ایک خودمختار اسلامی ریاست قائم ہوگی۔''(موج کوثر،ادارہ ثقافت اسلامیہ،لاہور،۱۹۸۴ءص:۵)

(۵) ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں کہ:

''زبان روح اور لپی اس کا جسم ہوتی ہے۔''(نقوش،لاہور،مئی

۱۹۶۵ء ص:۸۳)

ڈاکٹر انور سدید نے لپی کا مترادف رسم الخط لگا کر ڈاکٹر سہیل بخاری کے فقرے کو اپنانے کی یوں ناکام کوشش کی ہے کہ:

''زبان روح ہے اور رسم الخط اس کا جسم ہے۔'' (ص:۵۳) ۱۶۴؎

اس طرح کی کئی اور مثالیں یوسف حسن نے اپنے مضمون (اردو ادب کی تاریخ۔ مشمولہ: کڑوے کسیلے مضامین) میں پیش کی ہیں۔ مگر طوالت کی وجہ سے ان سب مثالوں کو یہاں پیش نہیں کیا جا رہا ہے۔ یوسف حسن کے تبصرے کو دیکھ کر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے انور سدید کی کتاب کی خوبیوں کی طرف نگاہ نہیں کی۔ اس کتاب میں ایسی کئی خوبیاں ہیں جو دوسری تاریخ ادب میں نہیں ہیں۔ مثلاً انور سدید جب کسی دور، واقعہ، یا شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو ساتھ ہی اس پر اپنی رائے یا تبصرے ضرور کرتے ہیں جس سے کسی بھی واقعہ یا ادوار کو سمجھنے میں قارئین کو مدد ملتی ہے۔ دوسری خوبی اس کتاب کی یہ ہے کہ اس میں معاصر ادب پر اچھی خاصی گفتگو کی گئی ہے۔ جس کا فائدہ یہ ہے کہ آنے والے مورخ کے لیے نئے سماجی حالات میں نئی تاریخ کے رقم کرنے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اچھے خاصے مواد مل جائیں گے۔ بقول گیان چند جین:

''ڈاکٹر انور سدید نے جس غیر معمولی طور پر وسیع موضوع کو جس سلیقے سے ایک متوسط حجم کی کتاب میں سما دیا ہے اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ اتنے زیادہ مواد کو ترتیب دینے میں انہیں کتنی مشقت شاقہ کرنی پڑی ہوگی۔ بیسویں صدی کے ادب کے لیے یہ تاریخ خصوصیت سے ابل قدر ہے جس سے ہر قاری کے علم میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوگا۔''

تاریخ ادب اردو- مرتبہ وشائع کردہ ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد

اردو میں صرف دو ادبی تاریخیں ایسی ہیں جن کا کوئی ایک فرد مرتب یا مدیر نہیں، بلکہ وہ کسی ادرہ کی مرتبہ ہیں، ایک ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد سے شائع ہونے والی ''تاریخ ادب اردو'' اور دوسری پنجاب یونیورسٹی لاہور سے شائع ہونے والی ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' ۱۶۵؎ اول الذکر تاریخ پہلی

بار۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی۔۱۹۷۲ء میں اس کتاب کا ساتواں ایڈیشن منظر عام پر آیا اور یہی ایڈیشن میرے پیش نظر ہے۔ یہ کتاب ۱۶۰ اصفحات پر مشتمل ہے جسے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ابتدا میں دیباچہ عمومی ہے جس میں ڈاکٹر زور نے یہ اعتراف اور دعویٰ کیا ہے کہ:

''اس کتاب کی ترتیب میں یوں تو بہت کچھ ڈاکٹر بیلی کی 'تاریخ ادب اردو' سے فائدہ اٹھایا گیا ہے ،لیکن دوسری مطبوعہ تاریخوں اور تذکروں اور خود میرے مسودہ تاریخ ادب اردو کے مطالعے کے نتیجے بھی اس میں جگہ جگہ شامل ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کی ترتیب بالکل تحقیقی وسائنٹفک بنیاد پر کی گئی ہے۔''[۱۶۶]

مذکورہ بالا اقتباس کا ذکر کرتے ہوئے گیان چند جین اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں لکھتے ہیں:

''مجھے اس اقتباس کے ہر دعوے سے اختلاف ہے۔ یہ تاریخ کم از کم ۹۰ فیصد بیلی کی تاریخ سے ماخوذ ہے،شعرا کے حالات بیلی کے الفاظ میں اسی کی ترتیب سے درج کیے گئے ہیں۔اس میں بہت کم بیانات ایسے ہیں جو ۱۹۳۲ء یا ۱۹۴۰ء کے بعد اضافے ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ 'سائنٹفک' تاریخ کس کو کہتے ہیں۔سائنس سے مرعوبیت کے دور میں کسی کارنامے کو سائنٹفک کہہ دینا اسم اعظم کی طرح کارگر سمجھا جاتا ہے۔ یہ تاریخ کہیں سے بھی سائنٹفک نہیں۔''[۱۶۷]

یہ کتاب جیسا کہ ڈاکٹر زور نے دعویٰ کیا ہے کہ ڈاکٹر بیلی کی کتاب پر فوقیت رکھتی ہے تو یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔ یوں تو کتاب کے حصے،ابواب،عنوانات سب بیلی کے چربہ معلوم ہوتے ہیں۔مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ تحقیق وتنقید کے لحاظ سے اس کتاب کا کیا مقام ومرتبہ ہے۔کتاب کا پہلا حصہ زبان اردو کی تاریخ،اردو ادب کا آغاز،نیز دکنی ادب سے متعلق ہے۔''زبان اردو کی تاریخ'' کے ضمن میں لفظ 'اردو' کی حقیقت اور اس کی ابتدائی شکل وصورت کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔اور اردو کی دو منزلیں طے کی گئی ہیں:

''پہلی منزل وہ ہے جو ۱۰۲۷ء میں شروع ہوئی،اور جسے لاہوری اردو

کہنا چاہیے۔اسی دور میں زبان اردو پرانی پنجابی اور فارسی کے ملاپ
سے بنی تھی۔دوسری منزل وہ ہے جو ۱۱۹۳ء سے شروع ہوئی۔اس
دور میں لاہوری اردو کا ملاپ پرانی کھڑی بولی سے ہوا۔''۱۶۸

اس حصے میں لفظ 'اردو' اور اس کی شکل وصورت کے حوالے سے کی گئیں بحثیں، اردو کے آغاز کا نظریہ اور مذکورہ بالا اقتباس کی ہر ایک بات بیلی کی کتاب میں بہ آسانی دیکھی جا سکتی ہے۔اسی طرح 'اردو کا ابتدائی ادب' میں جو دور قائم کیے گئے ہیں (یعنی مذہبی اور ادبی) یہ بھی بیلی کی کتاب سے ماخوذ ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جو غلطیاں بیلی کی کتاب میں تھیں وہ یہاں بھی در آئی ہیں۔بیلی کی کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے بعض اغلاط کی نشان دہی اور جدید تحقیق کی روشنی میں اس کی تصحیح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔پھر بھی یہاں چند تصحیحات کا اعادہ کرنا ضروری ہے۔

خواجہ بندہ نواز سے دو رسالے 'معراج العاشقین' اور 'ہدایت نامہ' منسوب کیے گئے ہیں، جب کہ بہت سے محققین خصوصاً ڈاکٹر حسینی شاہد اور بنگلور کے ڈاکٹر محمد نورالدین سعید نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ خواجہ بندہ نواز سے منسوب کوئی بھی اردو رسالہ ان کا نہیں ہے۔جمیل جالبی کے مطابق 'معراج العاشقین' کے مصنف مخدوم شاہ حسینی بیجاپوری ہیں۔''۱۶۹

دوسری کتاب 'ہدایت نامہ' کے بارے میں گیان چند جین لکھتے ہیں کہ اس کتاب کا صرف نام سننے میں آیا ہے۔دنیا میں کسی نے اسے دیکھا نہیں۔جس کی وجہ سے اس کا وجود ہی مشتبہ ہو جاتا ہے۔میراں جی شمس العشاق سے منسوب نثری کتاب 'شرح مرغوب القلوب' کے مصنف میراں جی خدا نما ہیں۔۱۷۰ بیلی کی طرح اس کتاب کے مرتبین نے بھی نثری کتاب 'مفتاح الخیرات' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ ایک نثر کی کتاب ہے مگر اس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہے۔
غالباً یہ ۱۶۳۰ء میں تصنیف ہوئی ہے۔اس میں احکام مذہب سے
بحث کی گئی ہے۔''۱۷۱

گیان چند جین کے مطابق اس کتاب کا ذکر نصیرالدین ہاشمی نے ''دکن میں اردو'' میں ص:۱۶۴ پر کیا ہے، لیکن اس کا سنہ تالیف نہیں دیا۔اسے عبداللہ کی 'احکام الصلوٰۃ' کے دور کی کہا ہے۔بیلی یا ادارے کو

اس کا تخمینی سنہ ۱۶۳۰ء میں نہیں لکھنا چاہیے تھا۔'' ۲ ۷ا

مذہبی دور کے بعد ادبی دور آتا ہے جس کے تین حصے ہیں۔ پہلا گولکنڈہ کے شعرا، دوسرا بیجا پور کے شعرا، تیسرا مغلوں کے دور کے شعرا۔ پہلے دور میں قلی قطب شاہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ لکھی گئی ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق قلی قطب شاہ کے اشعار کی تعداد پچاس ہزار ہے۔ ۳ ۷ا قلی قطب شاہ کے علاوہ قدیم شعرا فیروز، ملا خیالی، محمود اور احمد گجراتی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ قطبی کی مثنوی 'تحفۃ النصائح' کے اشعار کی تعداد (۱۵۰۰) لکھی گئی ہے۔ جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق یہ مثنوی ۱۷۸۶ اشعار اور ۴۵ ابواب پر مشتمل ہے۔ ادارہ ادبیات کے مطابق مترجم کا نام قطبی اور فارسی کی اصل کتاب 'تحفۃ النصائح' کے مصنف کا نام شیخ یوسف ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق مترجم کا درست نام قطب زاہدی اور اصل کتاب کے مصنف کا مشہور نام یوسف شاہ راجو قتال ہے۔ ۴ ۷ا اسی حصے میں محمد امین سے مثنوی 'قصہ ابوشحمہ'، فارسی سے ترجمہ کی ہوئی مثنوی 'جنگ نامہ' اور ایک مرثیہ منسوب ہے۔ (ص: ۴۰) مولوی عبدالحق نے بیلی کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ صراحت کی ہے کہ: 'قصہ ابوشحمہ' کا مصنف اولیا ہے نہ کہ امین۔ ۵ ۷ا بیلی نے اپنی کتاب میں محمد امین کے بعد ابوالقاسم مرزا کا ذکر کیا ہے جس سے فارسی سے ترجمہ شدہ مثنوی 'جنگ نامہ' اور ایک مرثیہ منسوب کیا ہے۔ ۶ ۷ا ادارہ ادبیات نے خلط مبحث کر کے 'قصہ ابوشحمہ' کی طرح ان دونوں کو بھی محمد امین سے منسوب کر دیا ہے۔

عادل شاہی دور میں ملک خوشنود کی تین مثنویوں کا ذکر ہے۔ ہشت بہشت، یوسف زلیخا، اور جنت سنگھار' معروف بہ بہرام و دل آرام (ص: ۴۳) گیان چند جین کے مطابق ''تاریخ ادب اردو'' مرتبہ: عبدالقیوم (کراچی، ۱۹۶۶ء) میں سخاوت مرزا نے یہ واضح کیا ہے کہ 'ہشت بہشت' ہی کا صحیح نام 'جنت سنگھار' ہے۔ ادارہ نے اس کے اشعار کی تعداد دوگنی کر کے ۶۵۰۰ بتائی ہے، جب کہ خود شاعر کے مطابق ۳۲۲۵ ہے (جمیل جالبی، جلد اول، ص: ۲۵۳) دوسری مثنوی 'یوسف زلیخا' کے لیے مولوی عبدالحق نے بیلی کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ خوشنود نے کوئی 'یوسف زلیخا' نہیں لکھی۔ ۷ ۷ا نصرتی کی تصنیفات کے ضمن میں اس کی ایک نظم 'معراج نامہ' کا ذکر ملتا ہے۔ (ص ۴۴) گیان چند جین کے مطابق یہ بات مرتبین نے بیلی سے اور اس نے 'گل رعنا' سے لی ہے۔ نصرتی نے کوئی 'معراج نامہ' نہیں لکھا۔ اس کے

قصدہ 'چرخیہ' کو معراج نامہ' سمجھ لیا گیا۔ اسی طرح 'گلشن عشق' کے اشعار کی تعداد آٹھ ہزار لکھی گئی ہے۔ گیان چند جین لکھتے ہیں کہ یہ اشعار کی تعداد نہیں بلکہ مصرعوں کی تعداد ہے۔۱۷۸ ہاشمی کی مثنوی ''یوسف زلیخا'' کے اشعار کی تعداد تقریباً اکیاون ہزار ہے۔۱۷۹

پہلے حصے کا تیسرا جز ومغلوں کے عہد (۱۶۸۷ء تا ۱۷۲۰ء) کا ادب ہے۔ اس کے ابتدا میں محمد علی عاجز کی مثنوی 'قصہ فیروز شاہ وملکۂ مصر' کا ذکر ہے (ص: ۴۷) مولوی عبدالحق نے بیلی کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ 'قصہ فیروز شاہ وملکۂ مصر' کے شاعر کا نام نہ محمد علی ہے نہ تخلص عاجز، بلکہ دونوں محمود ہیں، جیسا کی شاعر نے خود مثنوی میں درج کیا ہے:

اے محمود اب پیر کا ناؤں لے
ختم کر درازی سو اب چھوڑ دے

مزید مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ یہ غلطی 'اردوئے قدیم' سے بے سمجھے نقل کرنے سے ہوئی ہے۔۱۸۰ وہی بات ادارے کے اس کتاب کے سلسلے میں کہی جاسکتی ہے۔ شاہ ذوقی کی سب رس منظوم کا نام ''کتاب العاشقین'' رکھا گیا ہے۔ (ص: ۴۸) جب کہ صحیح نام مولوی عبدالحق کے مطابق ''وصال العاشقین'' ہے۔۱۸۱ اسی طرح شاہ بیر اللہ کی سب رس منظوم کا نام 'گلشن حسن ودل' لکھا گیا ہے۔ مولوی عبدالحق بیلی کے تبصرے میں واضح کر چکے ہیں کہ مثنوی کا صحیح نام 'گلشن جشن دل' ہے۔۱۸۲ محبوب عالم کا دوسرا نام شیخ جیون لکھا گیا ہے، اور اس سے تین مثنویاں منسوب کی گئی ہیں۔ محشر نامہ، خواب نامہ اور جہیز نامہ (ص: ۵۰) محمود شیرانی نے اپنے ایک مضمون میں واضح کیا ہے کہ شیخ جیون، محبوب عالم سے الگ شخصیت ہے۔ یعنی اس کا دوست ہے۔ محشر نامہ محبوب عالم کی مثنوی ہے۔ جب کہ خواب نامہ اور جہیز نامہ عبدالحکیم مہمی کی ہیں۔''۱۸۳

تاریخ کے دوسرے حصے کا پہلا عنوان ''دہلی میں اردو ادب کے سو سال' اس کی ابتدا میں تاریخی وسیاسی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد دہلی کی ابتدائی شاعری کے ادوار کے حوالے سے یہ لکھا گیا ہے کہ:

''اردو شاعری کا یہ زمانہ آسانی کے ساتھ تین دوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، اور یہ دور (۱) حاتم (۲) میرؔ، سوداؔ، دردؔ (۳) انشاؔ، مصحفی

اور نظیرؔ کے ناموں سے منسوب ہیں۔لیکن ایک دور دوسرے دور سے
اس طرح ملا ہوا ہے کہ تیسرے دور کے شعرا پہلے دور کے شعرا کے نوعمر
معاصر کہے جا سکتے ہیں۔'' ۱۸۴

قاضی عبدالودود کا یہ اعتراض بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ پہلے دور میں افضلؔ، جعفر زٹلیؔ اور حاتم شامل ہیں۔تیسرے دور میں مصحفیؔ، رنگینؔ، ناسخؔ ہیں۔یہ تینوں افضل اور جعفر زٹلی کے نوعمر کسی طرح نہیں ہو سکے۔تیسرے دور کے شاعر در کنار۔پہلے دور کے شاعر حاتمؔ، مضمونؔ، آبرو وغیرہ بھی افضل کی وفات کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔قاضی عبدالودود لکھتے ہیں کہ یہ بات بھی ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ افضل سے لے کر حاتم کے زمانے تک سو سال کیوں کر ہوئے۔'' ۱۸۵

شاہ مبارک آبرو کے ذکر میں یہ لکھا گیا ہے کہ ان کے کلام کا پہلا مجموعہ غدر کے ہنگامے میں تلف ہو گیا۔بیلی کی کتاب میں بھی یہی لکھا گیا ہے، اور یہ بات وہیں سے نقل کی گئی ہے۔عام طور پر غدر سے ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ مراد لیا جاتا ہے۔پتا نہیں یہاں کون سا غدر مراد ہے۔آبروؔ انیسویں صدی کے نہیں بلکہ اٹھارہویں صدی کے شاعر ہیں۔ان کی وفات ۱۷۳۳ء میں ہوئی ہے۔ان کے پہلے دیوان کے تلف ہونے کی بات گیان چند جین کے مطابق کسی نے نہیں لکھی۔نہ 'آب حیات' میں محمد حسین آزاد نے، نہ قاضی عبدالودود نے 'عیارستان' میں، نہ ڈاکٹر محمد حسن نے مقدمہ دیوان آبرو میں، اور نہ جمیل جالبی نے اپنی کتاب 'تاریخ ادب اردو' میں دیوان کے تلف ہونے کے حوالے سے کوئی بات لکھی ہے۔

مرزا محمد رفیع سوداؔ کا سنہ ولادت ۱۷۱۳ء لکھا ہے۔(ص:۳۷) جمیل جالبی کے مطابق ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶-۷ء ہے۔ ۱۸۶ اسی طرح سودا کے لیے یہ لکھا گیا ہے کہ آصف الدولہ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا۔مولوی عبدالحق نے بیلی کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ سوداؔ کو ۱۱۶۵ھ سے قبل یہ خطاب مل چکا تھا۔میرؔ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ ۱۸۷ بیلی نے اپنی تاریخ میں مصحفی کے حوالے سے لکھا تھا کہ ۱۷۹۴ء میں انہوں نے ایک اہم فارسی تذکرہ مکمل کیا جس میں ۳۵۰ شعرا کا ذکر شامل ہے۔''اس پر مولوی عبدالحق نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مصحفیؔ نے ایک نہیں تین تذکرے لکھے ہیں۔زیر بحث کتاب میں اس تذکرے کا ذکر کر کے مرتبین نے یہ لکھا ہے کہ: ''اس کے علاوہ انہوں نے اور تین تذکرے لکھے، یہ

سب چھپ چکے ہیں۔'' ۱۸۸

مذکورہ اقتباس کے حساب سے مصحفی نے گویا چار تذکرے لکھے ہیں۔ حالاں کہ واقعتاً تین ہی لکھے ہیں۔ ۱۷۹۴ء میں اردو کا پہلا تذکرہ 'تذکرۂ ہندی' مکمل کیا جس میں ۳۵۰ نہیں گیان چند جین کے مطابق ۱۹۳ شاعروں کا ذکر ہے۔ دوسرے تذکرے 'ریاض الفصحا' میں ۳۲۲ شاعر ہیں۔ ان سب سے پہلے 'عقد ثریا' مختصر تذکرہ ہے۔'' ۱۸۹

''اردو نثر کی ترقی'' کے ضمن میں فورٹ ولیم کالج اور اس سے منسلک اہل قلم کا مختصراً ذکر ہے۔ اس میں مرزا علی لطف کے 'گلشن ہند' کے لیے لکھا گیا ہے کہ ''اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ طبع ہو گیا ہے۔ دوسرا حصہ جس میں تمام شاعروں کا ذکر تھا مفقود ہے۔'' (ص:۹۳) بقول گیان چند جین اس سے ایسا لگتا ہے کہ لطف نے دوسرا حصہ لکھا، لیکن اب ناپید ہو گیا ہے۔ حالاں کہ لطف نے اپنے دیباچے میں یہ لکھا ہے:

''جلد دوم میں مذکور کیے گئے ہیں شعرائے گمنام وغیرہ۔'' ۱۹۰

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ: ''اس دوسری جلد کے متعلق ہمیں اطلاع نہیں کہ لکھی گئی تھی یا نہیں۔'' ۱۹۱ گیان چند جین کا کہنا ہے کہ ''یہ مان لینے میں کوئی حرج نہیں کہ دوسری جلد نہیں لکھی گئی۔'' ۱۹۲ حیدر بخش حیدری کی ایک تالیف کا نام ''تاریخ قادر'' لکھا ہے۔ (ص:۹۴) یہ سہو کتابت ہے۔ صحیح نام تاریخ نادری ہے۔

اس حصے میں دو اور ضمنی عنوان قائم کیے گئے ہیں جو بیلی کی تاریخ میں نہیں، یہ ادارہ ادبیات کے اضافہ کردہ ہیں۔ پہلا ''دکن میں اردو کا احیا'' ہے۔ اس میں شمالی ہند سے دکن جانے والے کچھ ادیبوں کے نام دیئے ہیں۔ مثلاً غلام علی آزاد، عبدالقادر ساقی، قمرالدین منت، خواجہ احسن اللہ بیان، مرزا علی لطف وغیرہ اور چند دکنی شعرا کا سرسری تعارف پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا عنوان ''جدید علوم وفنون'' ہے، اس میں صرف نواب شمس لامرا کی علمی کوششوں کا ذکر ہے۔

تیسرا حصہ ''دبستان لکھنؤ اور دہلی'' سے متعلق ہے۔ اس میں پہلے دبستان لکھنؤ کا ذکر ہے۔ اس حصے میں اکثر غلطیاں وہی ہیں جو ڈاکٹر بیلی نے اپنی تاریخ میں کی ہے۔ مثلاً دیاشنکر نسیم کے لیے یہ لکھا ہے کہ ''نسیم نے الف لیلہ کے قصے کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ (ص:۱۰۷) مولوی عبدالحق نے بیلی کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'صریحاً غلط ہے۔ اس غلطی کا ارتکاب گارساں دتاسی نے کیا ہے اور اس کی

نقل بیلی نے کی ہے۔۱۹۳؎ اور بیلی کی تاریخ سے ادادرہ ادبیات کے مرتبین نے ۔آتش کے لیے لکھا ہے ’’پہلا دیوان ان کی زندگی میں مرتب ہوا کوئی تیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔دوسرا دیوان ان کی وفات کے بعد مرتب ہوا۔(ص:۱۰۸)ڈاکٹر شاہ عبدالسلام کے مطابق دونوں دیوان میں تقریباً ساڑھے آٹھ ہزار اشعار ہیں۔۱۹۴؎ ناسخ کے اشعار کی تعداد ادارہ ادبیات کے مرتبین کے مطابق پہلے دیوان میں اٹھارہ ہزار اور دوسرے دیوان میں کوئی تیس ہزار اشعار ہیں۔(۱۰۸)اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی عبدالودود ناسخ اور آتش کے اشعار کی تعداد کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ’’(بقول مصنفین)ناسخ کے پہلے دیواں میں ۱۸ہزار کے قریب اور دوسرے میں تیس ہزار کے قریب شعر ہوں گے۔دیوان ناسخ کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخہ جو ہماری نظر سے گذرے ہیں،ان میں پہلے اور دوسرے دیوان کے اشعار کی مجموعی تعداد بھی اٹھارہ ہزار نہ ہوگی۔کیا مصنفین یہ بتا سکتے ہیں کہ دیوان اوّل و دوم کے کون سے نسخے انہوں نے دیکھے ہیں جن میں ۴۸ ہزار کے قریب اشعار ہیں۔اسی طرح آتش کے دیوان اوّل کے متعلق یہ اطلاع ہے کہ اس میں تیس ہزار اشعار ہیں۔بالکل بے بنیاد ہے۔‘‘۱۹۵؎

اسماعیل حسین منیر(منیر شکوہ آبادی)کے ذکر میں ان کی تین کتابوں کے نام یہ لکھے ہیں۔

’معارج المضامین‘،’منتخبات عالم‘،’تنویر الاشیا‘(ص:۱۱۲)

پہلے دو نام بیلی کی تاریخ سے نقل ہیں۔تیسرے میں سہو کتابت ہے۔گیان چند جین کے مطابق صحیح نام مثنوی’معراج المضامین،منتخب العالم،تنویر الاشعار ہیں‘۱۹۶؎

کتاب کا چوتھا حصہ’’اردو ادب کا دور جدید‘‘ہے۔جس میں سرسید اور ان کے رفقا کا ذکر ہے۔ مولوی ذکاء اللہ کے احوال میں یہ لکھا ہے کہ:

> ’’دہلی کے رہنے والے تھے اور انگریزی سے ترجمہ کرنے کا خاص ملکہ رکھتے تھے،چنانچہ مختلف تاریخی کتابوں مثلاً تاریخ ہند،آئینۂ قیصری،

اور حیات لارڈ کرزن وغیرہ کو اردو میں منتقل کیا۔''[۱۹۷]

در اصل تینوں کتابیں مولوی ذکاء اللہ کی اپنی تالیفات ہیں، کسی انگریزی کتاب کے ترجمے نہیں ہیں، دوسری اور تیسری کتاب کا صحیح نام ''آئین قیصری'' اور ''کرزن نامہ'' ہے۔ یہ دونوں کتابیں ریختہ پر موجود ہیں۔ کتاب کا آخری جز ''اردو صحافت'' کے عنوان سے ہے جس میں چند اخباروں اور رسالوں کے نام درج کیے گئے ہیں۔ مثلاً جام الاخبار، اعظم الاخبار، اخبار الحقائق، رسالہ دلگداز، رسالہ اتحاد وغیرہ۔

اس مختصر کتاب میں اس سے زیادہ کی توقع بھی نہیں کر سکتے۔ کتاب میں بہت سے بیانات غیر واضح اور نامکمل ہیں، اور اکثر رائیں مرتبین نے ناکافی شہادتوں پر قائم کی ہیں۔ گیان چند جین اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس تاریخ میں تحقیق اور احتیاط سے ذرا بھی کام نہیں لیا گیا۔ تن آسانی کی خاطر محض بیلی کی تاریخ پر تکیہ کیا گیا جو اس وقت کی بہترین تاریخ نہ تھی۔''[۱۹۸]

کتاب میں بعض مشہور شاعروں کا ذکر نہیں ہے، اور بعض اصناف ادب خصوصاً تمثیل کی نشو ونما کے متعلق بھی بہت کم مواد ملتا ہے، کتاب کا سب سے بہتر حصہ وہ ہے جو قدیم شعرائے دکن سے متعلق ہے۔ بعض صریح اغلاط اور بعض اہم فروگذاشتوں کے باوجود بقول قاضی عبدالودود یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قدیم دکنی شاعروں سے متعلق اس ضخامت کی کسی اور کتاب میں اتنا مواد نہیں مل سکتا۔

○

حواشی:

(۱) تاریخ ادب کی تدوین، علی جواد زیدی، نصرت پبلشرز، امین آباد (لکھنؤ) ۱۹۸۳ء ص:۲۲

(۲) تذکرہ نگاری اور محمد حسین آزاد کی کتاب 'آب حیات' ڈاکٹر احسن فاروقی، مشمولہ: 'آب حیات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ' اعجاز پبلشنگ ہاؤس (دہلی) ۱۹۸۱ء ص:۵۶

(۳) تاریخ ادب اردو کی تدوین، علی جواد زیدی، ص:۳۸

(۴) شعر الہند (حصہ اوّل) عبدالسلام ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی (اعظم گڑھ) ۲۰۰۹ء ص:۲

(۵) سیر المصنفین (جلد اوّل) مولوی یحیٰ تنہا، طبع دوم، شیخ مبارک علی اینڈ سنز (لاہور) ۱۹۴۸ء ص:۱

(۶) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، انجمن اردو (پاکستان) ۲۰۰۰ء ص:۱۶۴

(۷) ایضاً۔ ص:۱۸۵

(۸) تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، مترجم: مرزا محمد عسکری، مرتب: ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی) پیش لفظ مرتب، ۲۰۱۷ء ص:ظ

(۹) ایضاً، تمہید مصنف، ص:ق

(۱۰) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص ۱۸۷

(۱۱) تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، التماس مترجم، ص:ل

(۱۲) تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر مرزا سلیم بیگ (مضمون) رسالہ 'تحقیق' شعبۂ اردو، سندھ یونیورسٹی، ۱۹۸۸ء ص:۲۵۱

(۱۳) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:۱۹۰

(۱۴) اردو ادب کی تاریخ، رام بابو سکسینہ، ص:۲۷

(۱۵) اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر افشاں زوار، پنجاب یونیورسٹی (لاہور) ۲۰۰۸ء ص:۷۰

(۱۶) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:۱۹۱

(۱۷) تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ص:۶۶

(۱۸) تاریخ ادب اردو، جلد دوم (حصہ اوّل) ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی) ۱۹۱۸۴ء ص:۶۶-۳۶۲

(۱۹) تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ص:۱۲۶

(۲۰) ایضاً، ص:۱۲۷

(۲۱) ایضاً، ص:۱۶۲

(۲۲) ایضاً، ص:۲۰۵

(۲۳) ایضاً، ص:۲۱۹

(۲۴) اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر افشاں زوار، پنجاب یونیورسٹی (لاہور) ۲۰۰۸ء ص:۷۲

(۲۵) تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ص:۲۶۳

(۲۶) تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (جلد دوم) ڈاکٹر گیان چند جین۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (دہلی) ۱۹۹۸ء ص:۲۹۱

(۲۷) اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر افشاں زوار، پنجاب یونیورسٹی (لاہور) ۲۰۰۸ء ص:۷۴

(۲۸) تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، التماس مترجم، ص:م

(۲۹) سکسینہ کی تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر مرزا سلیم بیگ (مضمون) ص:۲۵۴
(۳۰) تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر مختار الدین آرزو (مضمون) مشمولہ: 'ادبی دنیا' (لاہور) دسمبر ۱۹۴۰ء ص:۱۵-۱۴
(۳۱) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:۲۲۳
(۳۲) اردو ادب کی تاریخ، ٹی. گراہم بیلی، مترجم و مرتب: سید محمد عصیم، ترقی اردو بیورو (نئی دہلی) ۱۹۹۳ء ص:۱۲
(۳۳) ایضاً، ص:۷
(۳۴) ایضاً، ص:۱۸-۱۷
(۳۵) ایضاً، ص: ۲۲
(۳۶) ایضاً، ص: ۱۵
(۳۷) تنقیدات عبدالحق، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۳ء ص:۵۹
(۳۸) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:۲۲۵
(۳۹) تنقیدات عبدالحق، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ص:۶۳
(۴۰) اردو ادب کی تاریخ، ٹی. گراہم بیلی، ص:۹۰-۸۸
(۴۱) تنقیدات عبدالحق، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ص:۶۴
(۴۲) اردو ادب کی تاریخ، ٹی. گراہم بیلی، ص:۱۲
(۴۳) تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ص:۱۶۳
(۴۴) شعرالہند (حصہ اوّل) عبدالسلام ندوی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی (اعظم گڑھ) ۱۹۴۹ء ص:۲۰۹
(۴۵) اردو ادب کی تاریخ، ٹی. گراہم بیلی، ص:۱۳۹
(۴۶) تنقیدات عبدالحق، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ص:۶۵
(۴۷) اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر افشاں زوار، پنجاب یونیورسٹی (لاہور) ۲۰۰۸ء ص:۸۶
(۴۸) اردو ادب کی تاریخ، ٹی. گراہم بیلی، ص:۱۶۷
(۴۹) ایضاً، ص:۱۷۹
(۵۰) ایضاً، ص:۱۸۱
(۵۱) تنقیدات عبدالحق، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، ص:۵۸
(۵۲) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:۲۴۴
(۵۳) مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، ترمیم و اضافہ: ڈاکٹر سید محمد عقیل۔ جاوید پبلشرز نشیمن الہ آباد، ۱۹۸۴ء (راداد مصنف) ص:۹
(۵۴) سید اعجاز حسین: حیات اور کارنامے، ڈاکٹر سید حیدر علی، تاج آفسیٹ پریس، الہ آباد، ۱۹۸۳ء ص:۷۷-۱۷۶
(۵۵) مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر سید اعجاز حسین (عرض حال) ص:ح
(۵۶) اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر افشاں زوار، پنجاب یونیورسٹی (لاہور) ۲۰۰۸ء ص:۹۱
(۵۷) تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (جلد دوم) ڈاکٹر گیان چند جین۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (دہلی) ۱۹۹۸ء ص:۳۲۱
(۵۸) مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، ص:۲۵
(۵۹) ایضاً، ص:۵۲

(۶۰) تاریخ ادب اردو، جلد دوم (حصہ اوّل) ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی) ۱۹۱۸۴ء ص: ۲۵۸
(۶۱) مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، ص: ۴۵
(۶۲) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۶۶۷
(۶۳) ایضاً ص: ۶۶۷
(۶۴) مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، ص: ۶۰ ے
(۶۵) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۶۶۸
(۶۶) اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر افشاں زوار، پنجاب یونیورسٹی (لاہور) ۲۰۰۸ء ص: ۹۲
(۶۷) مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، ص: ۹۲
(۶۸) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۶۶۸
(۶۹) مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، ص: ۱۰۹
(۷۰) لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، سلسلۂ مطبوعات، مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) ۱۹۴۴ء ص: ۲۸۱
(۷۱) مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، ص: ۲۷۵
(۷۲) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۶۶۳
(۷۳) ایضاً ص: ۶۶۷
(۷۴) اردو نثر کا آغاز وارتقا، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، مجلس تحقیقات اردو (حیدرآباد) سن ندارد، ص: ۱۱۵
(۷۵) تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ڈاکٹر جمیل جالبی، مجلس ترقی ادب (لاہور) ۲۰۰۸ء ص: ۴۱۴
(۷۶) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۶۷۴
(۷۷) تاریخ ادب اردو، جلد سوم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ص: ۲۲۴
(۷۸) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۶۷۵
(۷۹) مختصر تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر سید اعجاز حسین، ص: ۵۴۸
(۸۰) اردو ادب کی تاریخ، ڈاکٹر نسیم قریشی، فرینڈ بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ (علی گڑھ) ۱۹۸۷ء ص: ۳
(۸۱) ایضاً ص: ۲۸
(۸۲) اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر افشاں زوار، پنجاب یونیورسٹی (لاہور) ۲۰۰۸ء ص: ۲۸۱
(۸۳) اردو ادب کی تاریخ، ڈاکٹر نسیم قریشی، ص: ۳۲
(۸۴) تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (جلد دوم) ڈاکٹر گیان چند جین۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (دہلی) ۱۹۹۸ء ص: ۲۴۲
(۸۵) ایضاً ص: ۳۵۰
(۸۶) اردو ادب کی تاریخ، ڈاکٹر نسیم قریشی، ص: ۵۰
(۸۷) ایضاً ص: ۵۵
(۸۸) تاریخ ادب اردو (جلد دوم، حصہ اوّل) ڈاکٹر جمیل جالبی، مجلس ترقی ادب (لاہور) ۲۰۰۸ء ص: ۲۰۷
(۸۹) ایضاً ص: ۲۱۲/ ۴۲۶/ ۲۵۸
(۹۰) اردو ادب کی تاریخ، ڈاکٹر نسیم قریشی، ص: ۱۴۶
(۹۱) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۵۴۴

(۹۲) اردوادب کی مختصر ترین تاریخ،ڈاکٹرسلیم اختر،کتابی دنیا(دہلی)۲۰۰۵ءص:۱۰

(۹۳) ایضاً ص:۱۵

(۹۴) اردوکی ادبی تاریخیں،ڈاکٹر گیان چندجین،ص:۸۹۳

(۹۵) اردوادب کی مختصر ترین تاریخ،ڈاکٹرسلیم اختر،کتابی دنیا(دہلی)۲۰۰۵ءص:۳۱

(۹۶) ایضاً ص:۶۱

(۹۷) اردوادب کی تاریخوں کاتحقیقی وتنقیدی جائزہ،ڈاکٹرافشاں زوار،پنجاب یونیورسٹی(لاہور)۲۰۰۸ءص:۱۵۳

(۹۸) اردوکی ادبی تاریخیں،ڈاکٹر گیان چندجین،ص:۸۹۲

(۹۹) اردوادب کی مختصر ترین تاریخ،ڈاکٹرسلیم اختر،کتابی دنیا(دہلی)۲۰۰۵ءص:۴۲-۱۴۱

(۱۰۰) ایضاً ص:۸۱-۱۸۱

(۱۰۱) اردوادب کی تاریخوں کاتحقیقی وتنقیدی جائزہ،ڈاکٹرافشاں زوار،پنجاب یونیورسٹی(لاہور)۲۰۰۸ءص:۱۵۵

(۱۰۲) اردوادب کی مختصر ترین تاریخ،ڈاکٹرسلیم اختر،کتابی دنیا(دہلی)۲۰۰۵ءص:۳۰۱

(۱۰۳) ایضاً ص:۳۲۹

(۱۰۴) اردوادب کی تاریخوں کاتحقیقی وتنقیدی جائزہ،ڈاکٹرافشاں زوار،پنجاب یونیورسٹی(لاہور)۲۰۰۸ءص:۱۵۶

(۱۰۵) اردوادب کی مختصر ترین تاریخ،ڈاکٹرسلیم اختر،کتابی دنیا(دہلی)۲۰۰۵ءص:۴۱۱

(۱۰۶) ایضاً ص:۴۶۳

(۱۰۷) ایضاً ص:۴۸۵

(۱۰۸) اردوادب کی تاریخوں کاتحقیقی وتنقیدی جائزہ،ڈاکٹرافشاں زوار،پنجاب یونیورسٹی(لاہور)۲۰۰۸ءص:۱۵۷

(۱۰۹) اردوادب کی مختصر ترین تاریخ،ڈاکٹرسلیم اختر،کتابی دنیا(دہلی)۲۰۰۵ءص:۵۴۳

(۱۱۰) اردوادب کی تاریخوں کاتحقیقی وتنقیدی جائزہ،ڈاکٹرافشاں زوار،پنجاب یونیورسٹی(لاہور)۲۰۰۸ءص:۱۵۸

(۱۱۱) اردوادب کی مختصر ترین تاریخ،ڈاکٹرسلیم اختر،کتابی دنیا(دہلی)۲۰۰۵ءص:۶۶۳

(۱۱۲) اردوادب کی تاریخوں کاتحقیقی وتنقیدی جائزہ،ڈاکٹرافشاں زوار،پنجاب یونیورسٹی(لاہور)۲۰۰۸ءص:۱۶۰

(۱۱۳) اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ،ڈاکٹر انور سدید(مضمون)مشمولہ:'کڑوے کسیلے مضامین'مغربی پاکستان،اردو اکیڈمی (لاہور)۲۰۰۳ءص:۵۳-۲۳۷

(۱۱۴) اردوکی ادبی تاریخیں،ڈاکٹر گیان چندجین،ص:۴۵۴

(۱۱۵) اردوادب کی تنقیدی تاریخ،ڈاکٹرسیداحتشام حسین،قومی کونسل برائے فروغ زبان(نئی دہلی)۲۰۱۱ءص:۸

(۱۱۶) ایضاً ص:۱۷

(۱۱۷) ایضاً ص:۲۰

(۱۱۸) ایضاً ص:۲۰

(۱۱۹) تاریخ ادب اردو۱۷۰۰ءتک(جلددوم)ڈاکٹر گیان چندجین۔ڈاکٹرسیدہ جعفر،قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان(دہلی)۱۹۹۸ء ص:۹۸-۳۹۵

(۱۲۰) اردوادب کی تنقیدی تاریخ،ڈاکٹرسیداحتشام حسین،ص:۲۷

(۱۲۱) اردوکی ادبی تاریخیں،ڈاکٹر گیان چندجین،ص:۴۵۷

(۱۲۲) تاریخ ادب اردو(جلداوّل)ڈاکٹرجمیل جالبی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس(دہلی)۱۹۸۹ءص:۲۳۶

(۱۲۳) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۴۵۷

(۱۲۴) تاریخ ادب اردو (جلد اوّل) ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی) ۱۹۸۹ء ص: ۲۶۵

(۱۲۵) ایضاً ص: ۵۳۹

(۱۲۶) تاریخ ادب اردو (جلد دوم) ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (دہلی) ۱۹۸۹ء ص: ۲۱۲/ ۲۴۵/ ۴۲۱

(۱۲۷) تاریخ ادب اردو (جلد دوم) ڈاکٹر جمیل جالبی، مجلس ترقی ادب (لاہور) ۱۹۹۴ء ص: ۳۵۹

(۱۲۸) اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ڈاکٹر سید احتشام حسین، ص: ۷۲

(۱۲۹) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۴۵۸

(۱۳۰) ایضاً ص: ۴۵۸

(۱۳۱) ایضاً ص: ۴۵۹

(۱۳۲) اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ڈاکٹر سید احتشام حسین، ص: ۱۲۱

(۱۳۳) ایضاً ص: ۱۳۷

(۱۳۴) باغ و بہار (میر امن) مرتبہ: رشید حسن خاں، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، مقدمہ مرتب، ۱۹۹۲ء ص: ۲۸

(۱۳۵) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۴۶۰

(۱۳۶) اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ڈاکٹر سید احتشام حسین، ص: ۱۶۰

(۱۳۷) مطالعۂ داغ، ڈاکٹر سید محمد علی زیدی، نظامی پریس، وکٹوریہ اسٹریٹ (لکھنؤ) ۱۹۷۴ء ص: ۹۹

(۱۳۸) اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر افشاں زوار، پنجاب یونیورسٹی (لاہور) ۲۰۰۸ء ص: ۳۰۶

(۱۳۹) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۴۶۳

(۱۴۰) اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، ڈاکٹر سید احتشام حسین، ص: ۳۱۸

(۱۴۱) ایضاً ص: ۳۵۰

(۱۴۲) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۴۷۱

(۱۴۳) اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ڈاکٹر انور سدید، مقتدرہ قومی زبان (اسلام آباد) ۱۹۹۱ء ص: ۲۷

(۱۴۴) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۵۹۵

(۱۴۵) اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ڈاکٹر انور سدید، ص: ۳۵

(۱۴۶) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۷۹۷

(۱۴۷) ایضاً ص: ۷۹۸

(۱۴۸) اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ڈاکٹر انور سدید، ص: ۸۵

(۱۴۹) اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر افشاں زوار، پنجاب یونیورسٹی (لاہور) ۲۰۰۸ء ص: ۲۰۲

(۱۵۰) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۷۹۹

(۱۵۱) ایضاً ص: ۸۰۱

(۱۵۲) تاریخ ادب اردو (جلد سوم) ڈاکٹر جمیل جالبی، مجلس ترقی ادب (لاہور) ۲۰۰۸ء ص: ۶۵

(۱۵۳) اردو ادب کی مختصر تاریخ، ڈاکٹر انور سدید، ص: ۲۲۲

(۱۵۴) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۸۰۱

(۱۵۵) ایضاً ص: ۸۰۱

(۱۵۶) اردو ادب کی مختصر تاریخ، ڈاکٹر انور سدید، ص:۲۵۲

(۱۵۷) ایضاً ص:۳۳۸

(۱۵۸) ایضاً ص:۳۷۳

(۱۵۹) اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر افشاں زوار، پنجاب یونیورسٹی (لاہور) ۲۰۰۸ء ص:۲۰۶

(۱۶۰) اردو ادب کی مختصر تاریخ، ڈاکٹر انور سدید، ص:۵۱۳

(۱۶۱) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:۸۰۵

(۱۶۲) اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر افشاں زوار، پنجاب یونیورسٹی (لاہور) ۲۰۰۸ء ص:۲۰۸

(۱۶۳) اردو ادب کی مختصر تاریخ، یوسف حسن (تبصرہ) مشمولہ: کڑوے کسیلے مضامین، مرتبہ: اورنگ زیب نیازی، مغربی پاکستان، اردو اکیڈمی (لاہور) ۲۰۰۳ء ص:۳۰۱

(۱۶۴) ایضاً ص:۱۵-۳۱۲

(۱۶۵) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:۲۴۴

(۱۶۶) تاریخ ادب اردو، مرتبہ: دارۂ ادبیات اردو (حیدر آباد) ۱۹۱۷۲ء ص:۷

(۱۶۷) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:۲۴۵

(۱۶۸) تاریخ ادب اردو، مرتبہ: دارۂ ادبیات اردو (حیدر آباد) ۱۹۱۷۲ء ص:۱۵

(۱۶۹) تاریخ ادب اردو (جلد سوم) ڈاکٹر جمیل جالبی، مجلس ترقی ادب (لاہور) ۱۹۹۵ء ص:۱۵۹

(۱۷۰) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:۲۴۷

(۱۷۱) تاریخ ادب اردو، مرتبہ: دارۂ ادبیات اردو (حیدر آباد) ۱۹۱۷۲ء ص:۲۸

(۱۷۲) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:۲۴۸

(۱۷۳) تاریخ ادب اردو (جلد سوم) ڈاکٹر جمیل جالبی، مجلس ترقی ادب (لاہور) ۱۹۹۵ء ص:۴۱۱

(۱۷۴) ایضاً ص:۴۸۶

(۱۷۵) تنقیدات عبدالحق، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) ۱۹۳۹ء ص:۵۹

(۱۷۶) اردو ادب کی تاریخ، ٹی. گراہم بیلی، مترجم و مرتب: سید محمد عصیم، ترقی اردو بیورو (نئی دہلی) ۱۹۹۳ء ص:۵۷

(۱۷۷) تنقیدات عبدالحق، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) ۱۹۳۹ء ص:۶۰

(۱۷۸) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:۲۰۵

(۱۷۹) اردو ادب میں مہدویوں کا حصہ، سید نصرت مہدی یداللہ، اسٹوڈینٹس بک ہاؤس، چار مینار (حیدر آباد) ۱۹۸۵ء ص:۸۱

(۱۸۰) تنقیدات عبدالحق، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) ۱۹۳۹ء ص:۶۰

(۱۸۱) قدیم اردو، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو (پاکستان) ۱۹۶۱ء ص:۲۵۱

(۱۸۲) تنقیدات عبدالحق، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) ۱۹۳۹ء ص:۶۱

(۱۸۳) اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۳۱ء، فروری ۱۹۳۲ء بحوالہ: اردو کی ادبی تاریخیں، گیان چند جین، ص:۲۵۲

(۱۸۴) تاریخ ادب اردو، مرتبہ: دارۂ ادبیات اردو (حیدر آباد) ۱۹۱۷۲ء ص:۶۸

(۱۸۵) قاضی عبد الودو (تبصرہ) 'تاریخ ادب اردو' مشمولہ: کڑوے کسیلے مضامین، مرتبہ: اورنگ زیب نیازی، مغربی پاکستان، اردو اکیڈمی (لاہور) ۲۰۰۳ء ص:۱۸۲

(۱۸۶) تاریخ ادب اردو (جلد دوم) ڈاکٹر جمیل جالبی، مجلس ترقی ادب (لاہور) ۱۹۹۴ء ص:۶۴۹

(۱۸۷) تنقیدات عبدالحق، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) ۱۹۳۹ء ص:۶۴

(۱۸۸) تاریخ ادب اردو، مرتبہ: ادارۂ ادبیات اردو (حیدر آباد) ۱۹۷۲ء ص:۸۳

(۱۸۹) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:۲۵۵

(۱۹۰) تذکرہ گلشن ہند (مرزا علی لطف) مرتبہ: عطا کاکوی، دی آرٹ پریس، سلطان گنج (پٹنہ) ۱۹۷۲ء ص:۱۰

(۱۹۱) تذکرہ گلزار ابراہیم، مع تذکرہ گلشن ہند، ۱۹۳۴ء ص:۲۹ بحوالہ: اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:۲۵۶

(۱۹۲) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:۲۵۶

(۱۹۳) تنقیدات عبدالحق، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند (دہلی) ۱۹۳۹ء ص:۶۴

(۱۹۴) دیوان آتش، شاہ عبدالسلام، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ (دہلی) ۱۹۷۷ء ص:۵۲

(۱۹۵) تاریخ ادب اردو، قاضی عبدالودود (تبصرہ) ص: ۱۸۴

(۱۹۶) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:۲۵۷

(۱۹۷) تاریخ ادب اردو، مرتبہ: ادارۂ ادبیات اردو (حیدر آباد) ۱۹۷۲ء ص:۱۳۰

(۱۹۸) اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:۲۶۸

باب پنجم

اردو ادب کی طویل تاریخوں سے متعلق تنقید کا محاسبہ

اردو میں زبان وداب کی تاریخ کی ایک درجن سے زائد کتابیں لکھی گئی ہیں۔رام بابو سکسینہ سے لے کر ڈاکٹر تبسم کاشمیری تک جو تاریخیں لکھی گئی ہیں وہ زبان وادب کی تاریخ کو سمجھنے میں بڑی معاون ہیں۔بعض مورخین نے طلبا کے معیار ومزاج کے مطابق مختصر ادوار کی تاریخیں لکھی ہیں تو بعض مورخین نے مفصل۔پچھلے باب میں اردو ادب کی مختصر تاریخوں سے متعلق تنقید کا محاکمہ کیا گیا تھا۔اس باب میں اردو ادب کی طویل تاریخی کتابوں کا محاسبہ بہ اعتبار سنین پیش کیا گیا ہے۔یوں تو اردو ادب کی طویل تاریخوں کی بھی ایک طویل فہرست ہے،مگر اس باب میں ان سب کا احاطہ ممکن نہیں،ان میں سے چند اہم ادبی تاریخیں مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو''ڈاکٹر جمیل جالبی کی کتاب''تاریخ ادب اردو''(مکمل جلدیں) پروفیسر سیدہ جعفر و پروفیسر گیان چند جین کی کتاب''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک''(مکمل جلدیں)اورڈاکٹر تبسم کاشمیری کی کتاب''اردو ادب کی تاریخ:ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک''اس باب میں شامل ہیں،جن کا مفصل جائزہ ذیل میں پیش کیا گیا ہے۔

علی گڑھ تاریخِ ادبِ اردو (پہلی جلد) (۱۲۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک)

'علی گڑھ تاریخ ادب اردو' کی پہلی جلد ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔اس تاریخ میں کل سات باب ہیں،جن میں ۱۲۰۰ء سے لے کر ۱۷۰۰ء تک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔کتاب کے آغاز میں پروفیسر آل احمد سرور کی تحریر کردہ تمہید ہے،جس میں وہ تاریخ ادب کے مکمل منصوبے کی تفصیلات بیان کرتے ہیں۔اس تمہید کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۹۵۵ء میں شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کو ''تاریخ ادب اردو'' کا ایک منصوبہ بھیجا جو ۱۹۵۶ء میں منظور ہوگیا اور اس کے لیے معقول رقم عطا کی گئی۔مارچ ۱۹۵۷ء میں ایک کمیٹی بلا کر پانچ جلدوں کی اسکیم بنائی گئی اور اس کے مختلف ابواب،مختلف مشاہیر

ادب کے سپرد کیے گئے۔اس وقت صدر شعبہ رشید احمد صدیقی ڈائرکٹر اور نذیر احمد اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔یکم مئی ۱۹۵۸ءکو رشید احمد صدیقی کی سبک دوشی کے بعد آل احمد سرور صدر شعبہ اور اسکیم کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔اگست ۱۹۵۸ء میں نذیر احمد اپنا کام انجام دے کر اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدے سے الگ ہو گئے۔نومبر ۱۹۵۸ء میں مجنوں گورکھ پوری اس اسکیم کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔پانچ جلدوں کی جو اسکیم بنائی گئی اور اس کے لیے جو وقت مقرر کیا گیا اس حوالے آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''پہلی جلد کا پہلا مضمون جو تاریخی و تمدنی جائزے پر مشتمل تھا وقت نہ ملا اور مضمون نگار نے خاصی مدت گزر جانے کے بعد لکھنے سے معذوری ظاہر کی۔یہی وجہ ہے کہ چار سال کی مدت جو اسکیم کو پورا کرنے کے لیے رکھی گئی تھی نا کافی ثابت ہوئی۔پہلی جلد سال بھر پہلے مکمل ہو گئی تھی لیکن اس کی طباعت کی رفتار باوجود تقاضوں کے خاصی سست رہی۔اور ۱۹۶۲ء میں صرف پہلی جلد شائع ہو سکی۔اب یہ انتظام کیا گیا ہے کہ ۱۹۶۳ء میں تین جلدیں اور ۱۹۶۴ء کے شروع میں آخری جلد ضرور شائع ہو جائے۔......جس کی ترتیب اس طور پر رکھی گئی ہے۔

پہلی جلد	۱۲۰۰ء سے ۱۷۰۰ء تک
دوسری جلد	۱۷۰۰ء سے ۱۸۰۰ء تک
تیسری جلد	۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک
چوتھی جلد	۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک
پانچویں جلد	۱۹۱۴ء سے حال تک''[۱]

مذکورہ اقتباس میں دو باتیں قابل غور ہیں۔پہلی یہ کہ وہ کون صاحب تھے جو خاصی مدت گزر جانے کے بعد تاریخی و تمدنی جائزے پر مبنی مضمون لکھنے سے معذوری ظاہر کی،جس کی وجہ سے پہلی جلد کی اشاعت میں تاخیر ہوئی۔دوسرے یہ کہ بقیہ جلدیں کیوں اشاعت پذیر نہیں ہوئیں۔ان دونوں باتوں کی صراحت آل احمد سرور نے اپنی خودنوشت ''خواب باقی ہیں'' میں کی ہے۔اس بابت وہ لکھتے ہیں:

''علی گڑھ تاریخ ادب اردو کی پہلی جلد کا سارا مواد ڈاکٹر نذیر احمد نے تیار کر ہی دیا تھا صرف شروع کا سماجی پس منظر کا باب خلیق احمد نظامی کے ذمے تھا، باقی تھا۔ نظامی صاحب نے اس باب کے لکھنے سے انکار کر دیا تو میں نے پروفیسر حبیب سے درخواست کی اور انہوں نے انگریزی میں یہ باب لکھا جس کا مجنوں صاحب نے ترجمہ کرایا۔ پہلی جلد کی طباعت کا سارا کام ٹائپ میں ہوا تھا اس کے پروف توجہ سے نہ پڑھے گئے، چنانچہ طباعت کی بہت سی غلطیاں رہ گئیں۔ اشاریہ بھی بہت ناقص تھا۔ جب ۱۹۶۲ء میں یہ کتاب شائع ہوئی تو طباعت کی اغلاط اور اشاریے کی خامیوں پر رشید حسن خاں نے 'تحریک' میں ایک مضمون لکھا......ان اعتراضات سے جو بڑی حد تک طباعت کے اغلاط اور اشاریہ کی خامی اور ترجمے میں بعض اصطلاحوں سے متعلق تھے میں بڑا دل برداشتہ ہوا اور میں نے کتاب کی فروخت روک دی۔ دوسری جلد کے لیے بھی خاصے مضامین فراہم ہو گئے تھے اور تیسری جلد کے لیے بھی کچھ مضامین آ گئے تھے، مگر پھر یہ کام آگے نہ بڑھ سکا......میں نے کچھ نئے لکھنے والوں سے جن میں حنیف نقوی بھی شامل تھے مواد کی فراہمی میں مدد لی تھی، مگر شعبے کی صدارت، انجمن ترقیِ اردو کے کاموں، آرٹ فیکلٹی کی ڈین شپ کی وجہ سے مجھے تاریخ ادب اردو کے تمام کاموں پر پوری توجہ دینے کا موقع نہ ملا۔ بہر حال میں اس سلسلے میں اپنی کوتاہیوں کو تسلیم کرتا ہوں۔ مگر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تخریبی تنقید اچھے کاموں کو پھلنے پھولنے نہیں دیتی۔''[۲]

آل احمد سرور کی یہ بات بڑی حد تک سچ ہے کہ تخریبی تنقید اچھے کاموں کو پھلنے پھولنے نہیں دیتی۔ بقول گیان چند جین ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو' میں باوجود تمام تسامحات کے معلومات کا جو خزانہ ہے رشید

حسن خاں نے اس کی قدر شناسی بھی کی ہوتی تو بات متوازن ہوتی۔'' ۳ گیان چند جین نے اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں علی گڑھ تاریخ ادب اردو کا جائزہ لیتے ہوئے رشید حسن خاں کے بعض اعتراضات کی توضیح پیش کی ہے۔ جس کا ذکر متن کے جائزے کے درمیان کیا جائے گا۔

تمہیدی تحریر کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا پچاس صفحات پر مشتمل ''لسانی مقدمہ'' ہے جس میں انہوں نے بڑے جامع انداز میں زبان، اس کی بنیادی خصوصیات اور اردو زبان کے آغاز و ارتقا کا جائزہ لیا ہے۔ یہ باب خاصہ معلوماتی ہے اور اپنے دور تک کی معلومات کے حساب سے بہت مفید ہے۔ ''زبان دہلوی کا ارتقا'' کے ضمنی عنوان کے تحت مسعود حسین خاں امیر خسرو کی ہندی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خسرو کی ہندی شاعری کا پہلا مستند ماخذ وجہی کی سب رس ہے جس میں ان کا حسب ذیل دوہا نقل ہے۔
>
> پنکھا ہو کر میں ڈلی ساقی تیرا چاؤ
>
> مجھ جلتے جنم گیا تیرے لیکھن باؤ ۴

گیان چند جین کے مطابق قاضی عبدالودود نے توجہ دلائی تھی کہ وجہی خسرو سے تین سو سال بعد کا مصنف ہے۔ رشید حسن خاں نے بھی اسی لیے اس دوہے کو قبول نہیں کیا۔ انہوں نے اپنی کتاب ''ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ'' میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے ان بیانات کی تردید کی ہے۔ مسعود حسین خاں نے ''خیر المجالس'' کو حضرت روشن چراغ دہلوی کی تصنیف قرار دیا ہے۔ (ص:۱۷) رشید حسن خاں تصحیح کرتے ہیں کہ یہ روشن چراغ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے مولانا حمید قلندر نے ترتیب دیا تھا۔ ۵ اسی طرح مسعوحسین خاں ''معراج العاشقین'' کو خواجہ بندہ نواز کی سب سے مستند نقش قرار دیتے ہیں۔ (ص:۳۲) بقول گیان چند جین اس کے لیے وہ معذور ہیں کیوں کہ اس وقت تک حسینی شاہد اور حفیظ قتیل کی تحقیق سامنے نہیں آئی تھی۔ ۶

زیر بحث مقالے کا جائزہ لیتے ہوئے رشید حسن خاں اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ:

> ''خان آرزو کے ایک لغت کا نام ''نوادرالالفاظ'' بھی لکھا گیا ہے۔ (ص:۱۸) تصحیح غرائب اللغات ہندی بھی (ص: ۲۵) اسی غرائب

اللغات ہندی کو دوسری جگہ ''غرائب اللغات عبد الواسع ہانسوی''
لکھا گیا ہے۔(ص:۴۲)ے

گیان چند جین اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ میں نے ''غرائب اللغات'' نہیں دیکھی اس لیے اس کے صحیح نام کے بارے میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا، لیکن ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اپنی مرتبہ ''نوادر الالفاظ'' کے مقدمے سے یہ اقتباس دیا ہے:

'''یکے از فضلائے کامگار و علمائے نامدار ہندوستان جنت نشاں کتاب
درفن لغت تالیف نمودہ مسمیٰ بہ غرائب اللغات و لغات ہندی۔''
(ڈاکٹر عبد اللہ ''اردو'' جنوری ۱۹۵۱ء ص:۱۳)

گویا ''غرائب اللغات'' کے علاوہ اس کا دوسرا نام ''لغات ہندی'' تھا۔کوئی تعجب نہیں کہ دونوں کو ملا کر ''غرائب اللغات ہندی'' بھی کہہ دیا ہو۔بہر حال مسعود حسین خاں کے لکھے تین ناموں میں سے پہلے نام ''نوادر الالفاظ'' اور تیسرے نام ''غرائب اللغات عبد الواسع ہانسوی'' پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا ہے۔ جہاں تک دوسرے نام کا تعلق ہے واضح ہو کہ نوادر کے کئی نسخوں میں اس کا نام یوں دیا ہے۔''نوادر الالفاظ، تصحیح غرائب اللغات'' ظاہر ہے کہ تصحیح غرائب اللغات اس کا دوسرا نام نہیں بلکہ اس کے موضوع کی صراحت ہے۔۸ے

لسانی مقدمہ کے بعد پہلا باب ''سیاسی و تمدنی پس منظر'' کے عنوان سے پروفیسر محمد حبیب کا تحریر کردہ ہے۔اس میں بڑی تفصیل سے مسلمانوں کی آمد سے لے کر مغل حکومت کے زوال تک کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔مگر یہ باب صرف سیاسی حالات پر مبنی ہے۔ان حالات کا اثر زبان و ادب پر کیا پڑا اس حوالے سے کوئی تفصیل نہیں ملتی۔یہی وجہ ہے کہ رشید حسن خاں اپنے تبصرے میں اس باب کے نظریاتی پہلو سے بہت خفا نظر آتے ہیں، اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''مجموعی طور پر کتاب سے اس کا کم سے کم تعلق ہے۔ یہ بیشتر غیر متعلق
باتوں پر مشتمل ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا باب پڑھنے کے بعد بھی
یہی نہیں معلوم ہوتا کہ زبان کے آغاز وارتقا پر کیا اثر پڑا۔''۹ے

دوسرے باب کا عنوان ہے ''گجرات میں اردو عہد ولی سے پہلے'' اسے پروفیسر نجیب اشرف

ندوی نے لکھا ہے۔اس باب کے ابتدا میں تاریخی و سیاسی پس منظر بیان کیا گیا ہے،اس کے بعد ''لسانی اہمیت'' کے ضمنی عنوان کے تحت گجرات کی لسانی اہمیت کو ظاہر کرتے ہوئے پروفیسر نجیب اشرف بتاتے ہیں کہ گجراتی شاعر عبدالولی عزلت نے سب سے پہلے اردو نثر میں اپنے دیوان کا دیباچہ تحریر کیا تھا۔علاوہ ازیں اس باب میں گجرات کے چند اہم شعرا مثلاً شیخ بہاء الدین باجن ،شاہ علی جیو گام دھنی ،قاضی محمود دریائی ،خوب محمد چشتی وغیرہ کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ہی ان کے کلام کا نمونہ بھی پیش کیا گیا ہے۔اس باب کے حوالے سے گیان چند جین اپنے تجزیے میں لکھتے ہیں:

> ''گجرات کے اردو زبان و ادب کے قدیم ترین نمونے ،صوفیہ کے ملفوظات اور بعض سلاطین کے منھ سے نکلے ہوئے متفرق فقرے یا جملے یا کہاوتیں ہیں ،جنہیں ندوی نے کافی تلاش کے بعد جمع کیا ہے اب گجرات کے ملفوظات ان سے کافی زیادہ ملتے ہیں۔علی گڑھ تاریخ کی تالیف تک جو کچھ مل گیا وہ ایک شاندار ابتدا کے طور پر غنیمت ہے۔''۱۰

تیسرے باب کا عنوان ''اردو ادب بہمنی دور میں'' کے نام سے قائم کیا گیا ہے جسے عبدالقادر سروری نے لکھا ہے۔اس باب کے ابتدا میں سروری صاحب نے دکن کا تاریخی پس منظر بیان کیا ہے، ساتھ ہی اس زمانے میں زبان کی جو کیفیات تھیں ان کا بھی ذکر کیا ہے۔اس باب میں بطور خاص دکن کے کئی اہم صوفیا کے نام اوران کی تصانیف کا ذکر ملتا ہے۔سروری صاحب نے یوسف حسینی المعروف شاہ راجو قتال سے اردو زبان کی دو تصانیف منسوب کی ہیں۔ایک منظوم رسالہ ''سہاگن نامہ'' اور دوسری تصنیف ''رسالہ شاہ راجو''۔(ص:۱۴۵،۱۴۶) ڈاکٹر گیان چند جین ان کا تجزیہ کرتے ہوئے دیگر محققین کے حوالے سے واضح کرتے ہیں کہ ''سہاگن نامہ'' کی صاف زبان کو دیکھتے ہوئے یقین ہے کہ یہ شاہ راجو اول کی تصنیف نہیں ، بلکہ نصیر الدین ہاشمی اور سیدہ جعفر کا خیال ہے کہ یہ سید راجو ثانی مرشد ابوالحسن تانا شاہ کی تصنیف ہے۔اسی طرح گیان چند جین اردو رسالہ شاہ راجو کے بارے میں ڈاکٹر حسینی شاہد کے حوالے سے سید شاہ محمد قادری نوردریا (م:۱۰۸۵ھ) کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔۱۱ اس باب میں خواجہ بندہ نواز کا احوال بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اوران سے گیارہ رسالے منسوب کیے گئے ہیں۔اس ضمن میں

ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں کہ بنگلور کے ڈاکٹر محمد نورالدین سعید نے اپنے غیر مطبوعہ تحقیقی مقالے ''خواجہ بندہ نواز سے منسوب دکنی رسائل''، نومبر ۱۹۸۲ء میں ایک ایک رسالے سے بحث کر کے اسے رد کیا ہے۔ اسی طرح ''معراج العاشقین'' کے بارے میں حسینی شاہد اور حفیظ قتیل ثابت کر چکے ہیں کہ یہ خواجہ بندہ نواز سے بہت بعد کی تصنیف ہے۔ اس باب کے حوالے سے گیان چند جین لکھتے ہیں کہ بعد کی تحقیق نے سروری صاحب کے فرمودات کے بیشتر حصوں کو غلط محض قرار دے دیا ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ تحقیقی اعتبار سے علی گڑھ تاریخ میں یہ باب سب سے زیادہ غیر معتبر اور غیر مفید ہے۔[۱۲]

چوتھے باب کا عنوان ''اردو ادب عادل شاہی دور میں'' ہے۔ اسے حصہ 'الف' اور 'ب' میں تقسیم کیا گیا ہے۔ حصّہ 'الف' ڈاکٹر نذیر احمد نے لکھا ہے اور حصّہ 'ب' نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے۔ گیان چند جین کے مطابق ۱۰۳۷ھ تک کے ادیبوں کا جائزہ نذیر احمد نے لیا ہے اور ۹۷-۱۰۳۷ھ تک کا جائزہ نصیر الدین ہاشمی نے لیا ہے۔ حصّہ 'الف' کے ابتدا میں سیاسی پس منظر اور اس دور کی لسانی صورت حال کو کافی وضاحت کے ساتھ نذیر احمد نے بیان کیا ہے۔ اس حصّے میں جن مشاہیر ادب کا انہوں نے تذکرہ کیا ہے ان میں بیشتر درویش ہیں جن کی زندگی اور نگارشات کا معاملہ بہت الجھا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے اس حصّے میں کچھ غلطیاں بھی در آئی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر نذیر احمد نے اشرف بیابانی کی نظم ''نوسر ہار'' کا سنہ تصنیف ۹۰۹ھ/۱۵۲۴ء لکھا ہے، جب کہ ڈاکٹر گیان چند جین اپنی تاریخ ادب میں ''نوسر ہار'' کا سنہ تصنیف ۹۰۹ھ مطابق ۱۵۰۳ء درج کیا ہے۔ اسی طرح میراں جی شمس العشاق سے منسوب اردو تصانیف سے متعلق ڈاکٹر گیان چند جین سمیت سبھی معروف محققین کا فیصلہ ہے کہ یہ انتساب درست نہیں، یہ اردو رسائل (یعنی گل باس، جل ترنگ، شرح مرغوب) میراں جی شمس العشاق کے تحریر کردہ نہیں ہیں۔ ڈاکٹر محمد ہاشم لکھتے ہیں:

> ''میراں جی شمس العشاق سے منسوب جتنے بھی نثری رسالے ہیں ان میں سے ایک بھی رسالہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکے کہ یہ میراں جی شمس العشاق کی ہی تصنیف ہے۔''[۱۳]

متذکرہ باب کا حصّہ 'ب' نصیر الدین ہاشمی نے لکھا نے ہے اس میں انہوں نے اس عہد کے چند اہم اور غیر معروف شعرا کا تذکرہ اور ان کی تصانیف کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں مرثیہ نگاری اور

نثر کا مختصر جائزہ بھی لیا ہے اور باب کے آخر میں پورے دور کے مجموعی شعر و ادب پر روشنی ڈالی ہے۔ موصوف نے مرزا مقیم اور مقیمی مصنف ''چندر بدن و مہیار'' کو ایک ہی شخص ظاہر کیا ہے جو کہ جمیل جالبی کے مطابق درست نہیں ہے۔ جمیل جالبی اپنی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' جلد اوّل میں ایک طویل بحث کے بعد یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

> ''مرزا مقیم اور مقیمی دو الگ الگ شخص ہیں۔ اوّلذکر بیجاپور میں سلطان محمد عادل شاہ کے دربار سے وابستہ اور فارسی کا خوش گو شاعر تھا جس نے قلعہ ابکہری کی فتح کے موقع پر ''فتح نامہ بکہیری'' مرتب کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا، اور مقیمی ''چندر بدن اور مہیار'' کا مصنف ہے جس نے کم از کم ایک فارسی مثنوی لکھی اور دونوں مثنویوں میں اپنا تخلص مقیمی ہی استعمال کیا ہے۔ مقیمی کسی بادشاہ کا متوسل نہیں تھا، ''چندر بدن مہیار'' میں کسی بادشاہ کی مدح میں کوئی شعر نہیں ملتا۔''[۱۴]

اس باب کا جائزہ لیتے ہوئے گیان چند جین نے اس میں در آئی خامیوں کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ہی اس کی تصحیح بھی کی ہے، باوجود اس کے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ یہ باب تفصیلات اور معلومات کے اعتبار سے خاصہ سود مند ہے۔ اس باب کی سب سے بڑی خوبی نمونوں کی فراوانی ہے، دونوں مصنفین بالخصوص نصیر الدین ہاشمی نے مختلف شاعروں کے کلام کے نمونے دیئے ہیں جن سے ان شعرا کے رنگ سخن کا اندازہ ہوتا ہے۔

''اردو ادب قطب شاہی دور میں'' یہ پانچویں باب کا عنوان ہے جسے ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے لکھا ہے۔ اس باب کے ابتدا میں قطب شاہی خاندان کی تاریخ بیان کی گئی ہے، اس کے بعد قطب شاہی دور کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ابتدائی دور میں ملا خیالی، محمود اور فیروز کا ذکر ہے اور یہی اس دور کے قابل ذکر شعرا بھی ہیں۔ لیکن گیان چند جین کا یہ اعتراض بجا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور نے ملا خیالی کا ذکر محض اس کی مسجد تک محدود رکھا اس کی شاعری کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔ یہی رویہ محمود کے ذکر میں بھی اپنایا ہے اور اس کا بھی کوئی شعر انہوں نے پیش نہیں کیا۔ اسی طرح اس باب میں قلی قطب

شاہ کا ذکر خاصا تفصیلی ہے، لیکن ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ ''پھول بن'' کے تنقیدی جائزے کے ساتھ ساتھ اس دور کی لسانی خصوصیات کو ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ضرور پیش کیا ہے۔ جس سے اس دور کی شاعری اور نثر نگاری کے حوالے سے بہت سی باتیں صاف اور واضح ہو جاتی ہیں۔

قلی قطب شاہ کے بعد وجہی، غواصی، ابن نشاطی، عبداللہ قطب شاہ، ابوالحسن تانا شاہ اور دیگر غیر معروف شعرا کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں مرثیے کی صنف کا بیان اور گولکنڈہ کی تباہی و بربادی اور ادبی بساط کے لپیٹنے کا تذکرہ ہے۔ اس باب میں سنین کی غلطیاں اکثر مقامات پر پائی جاتی ہیں، مگر یہ غلطیاں مصنف کی نہیں بلکہ کتابت کی معلوم ہوتی ہیں۔ رشید حسن خاں اور گیان چند جین نے اپنے تجزیے میں اغلاط کی نشان دہی کرتے ہوئے ان کی تصحیح کی ہے۔

چھٹا باب ''ولی اور اس کا عہد'' کے عنوان سے ہے۔ یہ باب ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی اور سخاوت مرزا نے مل کر لکھا ہے۔ مگر اس میں یہ وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ مذکورہ اصحاب میں سے کس نے کون سا اور کتنا حصہ لکھا ہے۔ گیان چند جین کے مطابق ولی کا تذکرہ ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کی تحریر ہے اور بقیہ تمام سخاوت مرزا کی تحریر ہے۔ اس باب میں ولؔی کی شخصیت اور کلام کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ولی کی زبان کے حوالے سے اس عہد کی لسانی خصوصیات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ولی کے معاصرین اشرف گجراتی، سراج اورنگ آبادی، ہاشمی بیجاپوری، امین گجراتی، بحری، عبدالولی عزلت وغیرہ کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس میں ولی کا سنہ وفات ۱۱۱۹ھ/ ۱۷۰۷ء درج ہے، جب کہ جمیل جالبی اس حوالے سے تفصیلی بحث کرتے ہوئے ولی کا سنہ وفات ۱۱۳۳ھ/ ۱۷۲۰ء کے بعد اور ۱۱۳۸ھ/ ۱۷۵۲ء سے پہلے متعین کرتے ہیں۔

ساتواں اور آخری باب ''شمالی ہند میں اردو ادب کے نمونے ۱۷۰۰ء تک'' کے عنوان سے مختص ہے۔ یہ باب ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے لکھا ہے۔ باب کے آغاز میں شمالی ہند کا مختصر سیاسی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ بعد ازاں صوفیا کے احوال تذکرہ ہے اور پھر ۱۷۰۰ء تک متعدد شعرا کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ امیر خسرو کے ذکر میں نور الحسن ہاشمی ایک جگہ یہ لکھتے ہیں کہ خسرو نے موسیقی میں ہندی اور ایرانی سروں کے میل سے طرح طرح کے راگ ایجاد کیے۔ (ص:۴۷۱) نور الحسن ہاشمی کے اس بیان کی تردید

کرتے ہوئے رشید حسن خاں لکھتے ہیں کہ:

''مقالہ نگار نے ماخذ کا حوالہ دیا نہیں۔اس صورت میں ان کی بات کو
کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ یہ عرض کر دیا جائے کہ یہ قول بجائے خود محض
روایت پر ایمان لے آنے کا مظہر ہے اور تحقیق کو اس طرح کی وہم
پرستی سے کچھ علاقہ نہیں ہوسکتا۔موسیقی میں خسرو کی ''ایجادات'' ہنوز
بحث طلب ہیں اور محتاج ثبوت۔'' ۱۵

خسرو کے انتقال کی تاریخ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ۱۰ نومبر ۱۳۲۴ء بتاتے ہیں۔گیان چند جین کے مطابق ظ۔انصاری اور ابوالفیض سحر نے ''خسرو شناسی'' صفحہ ۱۳۱ پر اور مالک رام نے تذکرے میں ۱۸ /شوال ۷۲۵ھ دی ہے۔ یہ برابر ہے ۲۷ ستمبر ۱۳۲۵ء کے۔ ۱۶ خود علی گڑھ تاریخ میں مسعود حسین خاں نے خسرو کے انتقال کا سنہ ۱۳۲۵ء درج کیا ہے۔(ص:۱۶) اسی طرح ''بکٹ کہانی'' کے شاعر کا نام مولانا محمد افضل لکھا ہے، جب کہ ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب ''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک'' کی جلد پنجم میں افضل کی ''بکٹ کہانی'' اور اس کی شخصیت پر تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ''بکٹ کہانی'' کا مصنف مولانا نہیں بلکہ ایک ہندو ہے جس کا اصل نام گوپال اور تخلص افضل ہے۔ ۱۷
اس باب میں پیش کردہ معلومات اور سنین اپنے دور تک یقیناً درست سمجھے جاتے ہوں گے، مگر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ نئی معلومات کے اضافے کی وجہ سے آج یہ معلومات درست نہیں رہیں۔اس جلد کی تدوین میں نو مشاہیر ادب نے حصہ نے لیا اور سبھی ادبا نے اپنے اپنے ذرائع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔مگر ان میں آپس میں ربط نہ ہونے کی وجہ سے کتاب میں کچھ خامیاں راہ پا گئی ہیں۔اس تاریخ کا رشید حسن خاں نے اپنی کتاب ''ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ'' میں اور گیان چند جین نے ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں خاصا تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے۔رشید حسن خاں نے سخت، طنزیہ اور جارحانہ انداز میں کتاب کی غلطیوں کو تو ظاہر کیا لیکن اس کی خوبیوں کو نظر انداز کر دیا۔دوسری طرف گیان چند جین نے بھی اس ادبی تاریخ کا جائزہ لیا ہے لیکن ان کا انداز رشید حسن خاں کے مقابلے میں متوازن ہے۔انہوں نے انصاف کے ساتھ اغلاط کی نشان دہی بھی کی ہے اور ساتھ ہی اس کے اچھے پہلوؤں کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

زیر بحث کتاب ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' تقریباً ۴۰ سال قبل شائع ہوئی تھی۔ لہٰذا اس میں اپنے دور تک کی ہی معلومات شامل ہوں گی جو یقیناً اب اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد نئ معلومات کی روشنی میں اپنی حیثیت و اہمیت کھو بیٹھی ہیں۔ اس لیے اسے آج سے تقریباً سال پرانے معیار کی روشنی میں ہی پرکھنا چاہیے اور اس میں در آئی تسامحات کی سخت گرفت نہیں کرنی چاہیے۔ کتاب میں جو غلطیاں طباعت کی تھیں وہ بھی ان محققین کے سر پھوڑنے میں رشید حسن خاں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ڈاکٹر افشاں زوار نے بھی اس تاریخ کا مختصر مگر جامع تجزیہ پیش کیا ہے۔ آخر میں وہ طباعت کی غلطیوں کے بارے میں کو لکھتی ہیں وہ کسی حد تک درست اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

''ایک تاریخ ادب کا اچھا یا برا تاثر قائم کرنے میں اس کی طباعت کا بہت ہاتھ ہوتا ہے۔ گندی یا خراب طباعت کے باعث الفاظ یا سنین میں غلطیاں در آئیں تو انہیں بھی مصنف کی غلطی سمجھا جاتا ہے، اس لیے چھپائی کے مرحلے کی خاص طور پر نگرانی کرنی چاہیے تا کہ مصنف کی محنت ضائع نہ ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ اس تاریخ میں پروف پڑھنے کی طرف صحیح توجہ نہیں دی گئی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ طباعت کی غلطیاں بھی مصنفین کے کھاتے میں پڑ گئیں۔ سنین میں بالخصوص ایسی غلطیاں سامنے آئی ہیں، کیوں کہ اردو میں ہندسے لکھتے، پڑھتے ہوئے عموماً اشتباہ ہو جاتا ہے، مثلاً ۲ اور ۳ یا ۵ اور صفر وغیرہ اکثر بے دھیانی میں الٹے سیدھے ہو جاتے ہیں اس لیے پروف ریڈنگ کرتے ہوئے ہندسوں پر بالخصوص دھیان دینا چاہیے۔ طباعت کی اسی خامی کی وجہ سے یہ کتاب معیار سے گر گئی۔''[۱۸]

تاریخ ادب اردو-جمیل جالبی

ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اردو'' چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ذیل میں ان چاروں جلدوں کا باری باری جائزہ پیش کیا جائے گا۔اس تاریخ کی پہلی جلد جو آغاز سے لے کر ۱۷۵۰ء تک کے قدیم ادب کے جائزے پر مبنی ہے ، پہلی مرتبہ ۱۹۷۵ء میں مجلس ترقی ادب ،لاہور سے شائع ہوئی ،اور یہی جلد ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے پہلی مرتبہ ۱۹۷۷ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔اس جلد کا چوتھا اڈیشن مجلس ترقی ادب لاہور سے ۱۹۹۵ء میں شائع ہوااور جائزے کے لیے یہی ایڈیشن میرے پیش نظر ہے۔

زیرنظر اڈیشن کے آغاز مین پیش ہے،جس میں ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب لکھنے کا مقصد،اہمیت اوراس کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس جلد کے خاکے کی وضاحت اس انداز میں کرتے ہیں:

> ''اس جلد کا خاکہ اس طرح بنایا گیا ہے کہ ساری تصنیف کو ترتیب زمانی سے چھ فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر فصل کے تحت مختلف ابواب آتے ہیں۔ ہر فصل کا پہلا باب پورے دور کی تمہید کی حیثیت رکھتا ہے جس میں اس دور کی تہذیبی ،معاشرتی اور ادبی ولسانی خصوصیات کو اجاگر کیا گیا ہے تا کہ پڑھنے والے کے سامنے اس دور کی واضح تصویر آجائے۔''[۱۹]

ان جلدوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کے علم وفضل ،دیدہ ریزی اور انتھک لگن کا جو احساس ہوتا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔جو کام بڑے بڑے ادارے ،انجمن اور بورڈ نہیں کر پاتے ،جمیل جالبی نے وہ کام تن تنہا سرانجام دیا ہے۔اس کام کے لیے انہیں کن دشوار مراحل سے گزرنا پڑا اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''تاریخ ادب ادارے لکھتے ہیں جن کے پاس سرمایہ ہوتا ہے۔جنہیں ہر قسم کی سہولت میسر ہوتی ہے۔......مددگار کی ایک جماعت ہوتی ہے ......اور کہیں برسوں میں جا کر یہ منصوبہ پورا ہوتا ہے،لیکن مجھے اس قسم کی کوئی سہولت میسر نہ تھی۔ دن بھر گردش روزگار اور پیٹ کا دوزخ بھرنے

کے لیے مشقت کی چکی، نہ کوئی مددگار، نہ کوئی ساتھی۔ ایک ایک کتاب
کے لیے مختلف کتب خانوں کے چکر کاٹنے پڑے۔ آتشی شیشے کی مدد سے
مخطوطات پڑھ پڑھ کر آنکھوں پر موٹا چشمہ چڑھ گیا۔ بہر حال یہ کام جیسا
کچھ ہے ایک فرد کا کام ہے جسے اس نے اپنی اپچ سے کیا ہے۔ اس میں
کسی کی فرمائش، مدد یا سرپرستی شامل نہیں ہے۔''[۲۰]

پیش لفظ کے بعد ۷ اصفحات پر مشتمل تمہید ہے جس میں اردو زبان اور اس کے پھلنے پھولنے کے اسباب کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کے بعد زمانی ترتیب کے اعتبار سے کتاب کو چھ حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فصل اوّل شمالی ہند سے متعلق ہے جو تین باب مشتمل ہے۔ پہلا باب '' مسعود سعد سلمان سے گرونا نک تک (۱۰۵۰-۱۵۲۵ء)'' ہے۔ اس میں مصنف نے زبان کی سیال حالت کی مثالیں دے کر اس کی شکل وصورت کو واضح کیا ہے۔ دوسرا باب ''بابر سے شاہجہاں تک (۱۵۲۵-۱۶۵۷ء)'' ہے۔ جس میں شمالی ہند کی طویل مثنوی '' بکٹ کہانی'' کا لسانی جائزہ لیتے ہوئے اس کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرا باب '' دور اورنگ زیب (۱۶۵۷ء-۱۷۰۷ء)'' سے متعلق ہے۔ اس باب میں سیاسی پس منظر کی جھلکیاں خوب صورت پیرائے میں بیان کی ہیں۔ یہاں ان کا انداز تحریر جداگانہ حیثیت کا حامل نظر آتا ہے۔ اس فصل میں ۱۰۵۰ء سے ۱۷۰۷ء تک کے شمالی ہند کے زبان وادب کا جائزہ لیا گیا ہے، ساتھ ہی سیاسی وادبی صورت حال کو بھی بڑے اچھے انداز میں واضح کیا گیا ہے۔

فصل دوم '' گجراتی ادب اور اس کی روایت (۱۰۵۰ء-۱۷۰۷ء)'' کے عنوان سے ہے۔ اس فصل میں چار باب ہیں۔ پہلے باب میں پانچویں صدی ہجری سے آٹھویں صدی ہجری تک (۱۰۵۰ء-۱۴۰۰ء) کی لسانی اور ادبی تاریخ کی روایت بیان کی گئی ہے۔ اس باب کا دوسرا باب نویں اور دسویں صدی ہجری کے ملفوظات، لغات، کتبے، (۱۴۰۰ء-۱۶۰۰ء) کے جائزے پر مشتمل ہے۔ جس میں جالبی مختلف بزرگوں کا ذکر کرتے ہیں اور ان کے ملفوظات کو پیش کر کے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

''نویں اور دسویں صدی ہجری کے...... مطالعے سے کئی باتیں سامنے
آتی ہیں، ایک تو یہ کہ زبان ابھی سیال حالت میں ہے اور اس میں

> علاقائی اثرات تیزی سے جذب ہوکر اظہار کی قوت کوسہارا دے رہے ہیں ۔دوسرے یہ کہ ان ملفوظات میں بیک وقت مختلف رنگ ،مختلف اثرات اور مختلف لہجے ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ ......تیسرے یہ کہ ان ملفوظات کی زبان پر پنجابی، سرائیکی، گجراتی، برج بھاشا اور کھڑی بولی کے اثرات بھی واضح ہیں،اور ان سب کو ملا جلا کر ایک کرنے کے عمل سے ایک ایسا رنگ ابھر رہا ہے جو بادشاہوں سے لے کر فقیروں تک ،صوفیا سے لے کر عوام تک مقبول ہے۔......'' ۲۱

تیسرا باب ''نویں اور دسویں صدی ہجری کی ادبی روایت (۱۴۰۰ء-۱۶۰۰ء)'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ اردو شاعری پر پہلا اور گہرا اثر ہندی روایت اور اسطور کا پڑتا ہے۔اور جب اس رایت کو برتتے کئی صدیاں گزر گئیں تو تخلیقی پیاس بجھانے کے لیے فارسی زبان وادب کی طرف توجہ کی گئی۔ یہاں یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ کس طرح گجرات کے صوفیا نے ہندی یا اردو کو اظہار خیال کی زبان بنایا۔ساتھ ہی اس دور میں سیاسی حالات کا اثر زبان وادب پر کس انداز سے مرتب ہوا اس کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔اور ایک ادبی مورخ کا یہی فریضہ ہوتا ہے کہ وہ عہد گزشتہ کے فن پاروں کی اہمیت اور قدر و قیمت کو عہد جدید کے لوگوں پر واضح کرے۔ڈاکٹر جمیل جالبی اس فریضے کو بڑی حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔

''دسویں، گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری کے اوائل میں گجری اردو روایت (۱۶۰۰ء-۱۷۰۷ء)'' یہ فصل دوم کے چوتھے باب کا عنوان ہے۔ایک طرح سے یہ باب تیسرے باب کا ہی حصّہ معلوم ہوتا ہے، جس میں دسویں، گیارہویں اور بارہویں صدی میں موجود شعرا کا تعارف اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔امین گجراتی کی مثنوی ''تولد نامہ'' کا ذکر کرتے ہوئے جالبی لکھتے ہیں کہ ''تولد نامہ'' تقریباً ڈھائی ہزار اشعار پر مشتمل ہے،جس کے تین حصّے ہیں۔ایک تولد نامہ، دوسرا معراج نامہ اور تیسرا وفات نامہ۔۲۲ ڈاکٹر گیان چند جین اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں اس بابت لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی نے تینوں مثنویوں کی آخری شعر بھی دیئے ہیں اور ابیات کی تعداد بھی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں مثنویاں ایک بحر میں،ایک سلسلے میں یکے بعد دیگرے لکھی گئیں جیسے سہ غزلے کی کیفیت ہو۔۲۳ گیان

چندجین ان مثنویوں کے سلسلے میں یہ خیال بھی ظاہر کرتے ہیں کہ گریز کے شعر کی بنا پر انہیں جداگانہ مثنویاں ماننا زیادہ صحیح ہے۔

فصل سوم کا عنوان ہے ''اردو بہمنی دور میں (۱۳۵۰ء-۱۵۲۵ء)'' یہ فصل صرف دو باب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ''پس منظر، ماخذ اور ادبی ولسانی خصوصیات'' سے متعلق ہے جس میں سیاسی وتہذیبی حالات کا ذکر کرتے ہوئے مصنف ادب پر ان کے اثرات کو واضح کرتے ہیں۔ اس حصّے میں خواجہ بندنواز گیسو دراز کے والد سید یوسف شاہ راجو قتال کا سنہ وفات ۷۰۹ھ/۱۳۰۹ء لکھا ہے۔ (ص:۱۵۱) ڈاکٹر گیان چندجین اسے درست نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے کی ڈاکٹر ثمینہ شوکت اپنے مرتبہ ''شکارنامہ'' کے مقدمے میں یہ لکھتی ہیں کہ مولانا محمد علی سامانی نے ''سیر محمدی'' میں اور غلام علی آزاد بلگرامی نے ''روضۃ الاولیا'' میں ان کا انتقال ۷۳۱ھ درج کیا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس سنہ کو درست نہ مانا جائے۔[۲۴] دوسرا باب ''ادب کی روایت نویں اور دسویں صدی ہجری کے اوائل میں (۱۴۳۰ء-۱۵۲۵ء)'' کے نام سے ہے۔ اس باب میں مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے مصنف نظامی سے لے کر ''نوسر ہار'' کے مصنف اشرف بیابانی کے دور تک کے ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اشرف بیابانی کے کا تذکرہ کرتے ہوئے جمیل جالبی ''واحد باری'' کو اشرف بیابانی سے منسوب کرتے ہیں۔ جب کہ گیان چندجین اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''واحد باری کا ایک نسخہ ادارہ ادبیات اردو میں ہے۔ محض تخلص کو دیکھ کر ڈاکٹر زور التباس کا شکار ہو گئے، اور انہیں کی تقلید میں جالبی صاحب نے بھی 'واحد باری' کو اشرف بیابانی سے منسوب کر دیا لیکن نصیر الدین ہاشمی نے سالار جنگ کے مخطوطات کی فہرست میں صحیح صورت حال واضح کی ہے کہ اس کا مصنف آصفی دور کا شاعر ہے جو سکندر جاہ کے عہد میں بریلی یوپی سے یہاں آیا۔''[۲۵]

فصل چہارم ''عادل شاہی دور (۱۴۹۰ء-۱۶۸۵ء)'' سے متعلق ہے۔ یہ فصل آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ''پس منظر، روایت اور ادبی ولسانی خصوصیات'' کے حوالے سے ہے۔ اس حصّے میں لسانی خصوصیات کے جائزے کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی تعمیر وتشکیل پر بھی ڈالی گئی ہے۔ دوسرا باب

’’گجری روایت کی توسیع، ہندی روایت کا عروج (۱۵۲۵ء-۱۶۲۷ء)‘‘ کے ذکر پر مبنی ہے، اس باب میں سو سال کی مدت میں جو تین رجحانات ابھرتے ہیں ان کا مختصر تذکرہ کیا گیا ہے۔ جالبی کے مطابق اس دور میں تین رجحانات قابل ذکر ہیں۔ ایک تو ہندی روایت جس کے نمائندے جانم اور جگت گرو ہیں۔ دوسرے رجحان کے نمائندے عبدل اور شہباز حسینی قادری ہیں جن کی تحریروں میں بنیادی روایت تو ہندی ہے، لیکن ساتھ ساتھ فارسی اثرات بھی دبتے ابھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تیسرا رجحان خالص فارسی اثرات کا ہے جو غزل کی شکل میں ابھر رہا ہے اور جس کی نمائندگی خواجہ دبدار فانی کر رہے ہیں۔ برہان الدین جانم کا ذکر کرتے ہوئے جمیل جالبی ان کا سنہ وفات ۹۹۰ھ یا اس کے کچھ عرصہ بعد کا بتاتے ہیں۔ ۲۶ ڈاکٹر حسینی شاہد کی تحقیق کے مطابق صحیح سنہ ۱۰۰۷ھ ہے۔ ۲۷

تیسرا باب ’’ہندی اور فارسی روایت کی کشمکش (۱۶۲۷ء-۱۶۴۰ء)‘‘ ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق اس دور کا بنیادی رجحان فارسی کا ہے جو اوزان، بحور، رمزیات و اسالیب کی صورت میں بڑھتا نظر آتا ہے۔ اس میں جہاں جمیل جالبی اس عہد کی اہم نگارشات کا تعارف کراتے ہیں وہی ان کی اسلوبیاتی خصوصیات اور تہذیبی اثرات وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے لسانی سطح پر اثرات کا جائزہ لے ان کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ چوتھا باب ’’فارسی روایت کا رواج (۱۶۴۰ء-۱۶۵۷ء)‘‘ کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں اس دور کی اہم تصانیف مثلاً ملک خوشنود کی مثنوی ’’جنت سنگار‘‘ امین کی مثنوی ’’خاور نامہ‘‘ اور صنعتی کی نظم ’’قصّہ بے نظیر‘‘ کا تجزیاتی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جمیل جالبی مثنوی ’’خاور نامہ‘‘ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ اردو زبان کی طویل ترین مثنوی ہے۔ (ص: ۱۶۷) ڈاکٹر گیان چند جین کے مطابق ’’خاور نامہ‘‘ اردو کی تیسری طویل مثنوی ہے جو ۲۲ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ پہلی نول کشور پریس کی ’’الف لیلہ نو منظوم‘‘ ہے، جس میں تقریباً چون ہزار شعر ہیں۔ دوسری واجد علی شاہ کی مثنوی ’’ثبات القلوب‘‘ ہے جس میں تقریباً چوالیس ہزار اشعار ہیں۔ ۲۸ جمیل جالبی ’’قصّہ بے نظیر‘‘ کے مصنف صنعتی کے نام کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ یہ ابراہیم خاں صبعی ہوگا جس کا ذکر ’’محمد نامہ‘‘ میں ظہور الدین ظہور نے کیا ہے۔ جیسا کہ اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ صبعی کاتب کی غلطی سے بگڑ کر صنعتی ہو گیا ہے۔ پھر جمیل جالبی اس بیان کی تائید میں ڈاکٹر زور، عبدالقادر سروری اور نصیر الدین ہاشمی کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ ۲۹ لیکن اس ضمن گیان چند

جین کا خیال یہ ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہونی چاہیے۔ صنعتی بگڑ کر صبعی ہو گیا۔ مثنوی میں صنعتی کا تخلص موجود ہے جو وزن کے اعتبار سے صحیح ہے، وہاں صبعی نہیں آ سکتا۔۳۰

''غزل کی راویت کا سراغ: حسن شوقی (م:۱۶۳۳ء؟)'' یہ پانچویں باب کا عنوان ہے جس میں حسن شوقی سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ نظام شاہی سلطنت کے خاتمے کے بعد حسن شوقی نے عادل شاہی سلطنت میں پناہ لی تھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کی نظم ''فتح نامہ نظام شاہ'' کے طویل تجزیئے میں اس عہد کی سیاسی و تہذیبی حالات کا ذکر کیا ہے اور اس نظم کی لسانی خصوصیات بیان کی ہے۔ ساتھ ہی حسن شوقی کی غزلوں کا فکری وفنی جائزہ لیتے ہوئے اس اہمیت وافادیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق:

> ''حسن شوقی کی غزلیں اسی روایت کا حصّہ ہیں جس کی فراز پر ولّی دکنی کی غزل کھڑی ہے۔ یہ غزلیں اپنے مزاج کے اعتبار سے جدید غزل کی ابتدائی روایت اور رنگ وروپ کا حصّہ ہیں......''۳۱

چھٹا باب'' مذہبی تصانیف پر فارسی اثرات (۱۶۴۰ء-۱۶۷۵ء)'' کے حوالے سے ہے۔ اس باب میں برہان الدین جانم، ان کے بیٹے شاہ امین الدین علی اعلیٰ اور جانم کے دو مرید شیخ داول اور شیخ محمود کی تصانیف نظم ونثر کا فنی جائزہ لیا گیا ہے، اور ادب کی راویت میں ان کے مقام ومرتبہ کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق مذہبی رسالے، ملفوظات واقوال وغیرہ ادبی تصانیف کے باقاعدہ آغاز کے بعد ان کی اہمیت کم ہو کر صرف تاریخی رہ گئی۔ البتہ صرف ایسی مذہبی تصانیف اہمیت کی حامل رہیں جن میں ادبی شان نمایاں تھیں۔

ساتواں باب'' دکنی ادب کا عروج: نصرتی (۱۶۵۷ء-۱۶۷۵ء)'' سے متعلق ہے۔ اس باب میں علی عادل شاہ ثانی اور نصرتی کی شاعری کا فنی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق نصرتی کی زبان معیاری دکنی تھی جس کے اظہار وبیان کا ایک نیا معیار خود نصرتی نے قائم کیا تھا۔ اس حوالے سے جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''اگر دکن کی یہ سلطنتیں باقی رہتیں اور دکنی اردو کا یہ روپ قائم رہتا تو آج بھی نصرتی قدیم دور کا سب سے بڑا شاعر قرار پاتا۔ لیکن ہوا یہ کہ مغلوں کی فتح کے بعد شمالی ہند کی زبان دکنی ادب کی راویت پر غالب

آ گئی۔...... یہ تہذیبی ولسانی تبدیلیوں کی ستم ظریفی ہے جو تاریخ کے
موڑ پر اکثر اس طرح آتی ہیں کہ بڑے درخت گر جاتے ہیں اور پھر یہ
ہوتا ہے کہ چھوٹے درخت بڑے نظر آنے لگتے ہیں۔اسی ستم ظریفی نے
نصرتی کو چھوٹا اور ولی کو بڑا بنا دیا۔''۳۲

آٹھویں باب کا عنوان ''نیا عبوری دور (۱۶۵۷ء- ۱۶۸۵ء)'' ہے۔یہ باب ساتویں باب کا حصّہ معلوم ہوتا ہے۔دکن پر شمالی ہند کے سیاسی ،تہذیبی ولسانی اثرات کو واضح کرتے ہوئے ہاشمی ،ایاغی اور مرزا بیجا پوری کے کلام کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے کلام کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔اس فصل کے آخر میں دو صفحے کا ''خاتمہ'' ہے جس میں عادل شاہی دور کے خاتمے اور بیجا پور کے ادب پر مغلوں کی زبان وادب کے اثر کا ذکر ہے۔

فصل پنجم ''قطب شاہی دور (۱۵۱۸ء-۱۶۸۶ء)'' سے متعلق ہے۔یہ فصل سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ''پس منظر،روایت اور ادبی ولسانی خصوصیات'' پر مبنی ہے۔یہ باب تنقیدی قدر بندی کا بہترین نمونہ ہے۔اس میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے گولکنڈہ اور بیجا پور کی اسالیب کا فرق واضح کیا ہے اور مثالوں سے یہ تنقیدی انکشاف کیا ہے کہ گولکنڈہ میں فارسی کے اثرات اور بیجا پور میں ہندی کے اثرات زیادہ پائے جاتے ہیں۔دوسرا باب ''فارسی روایت کا آغاز (۱۵۱۸ء-۱۵۸۰ء) کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔اس باب میں صاحب کتاب محمود، فیروز اور خیالی کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ان کے کلام کی خوبیوں کو واضح کرتے ہیں۔تیسرے باب کا عنوان ''فارسی رایت کا عروج: محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء-۱۶۱۰ء)'' ہے۔جس میں قلی قطب شاہ کے کلام کا فنی جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اس دور کی نمائندہ نظم شیخ احمد کی مثنوی ''یوسف زلیخا'' اور ''لیلیٰ مجنوں'' کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھے باب کا عنوان ''فارسی روایت کا عروج ،نظم ونثر میں: ملا وجہی (۱۵۸۰ء-۱۶۴۰ء) کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔اس باب میں ملا وجہی کی تصانیف کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔اس جائزے میں دیوان وجیہ (فارسی) مثنوی ''قطب مشتری''اور نثری داستان ''سب رس'' وغیرہ شامل ہیں۔اسی باب میں جمیل جالبی وجہی سے منسوب ایک اور تصنیف ''تاج الحقائق'' کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے خیال میں وجہی کی تصنیف نہیں

بلکہ اس کے مصنف کا نام وہ وجیہ الدین محمد بتاتے ہیں۔(۴۳۵) جب کہ ڈاکٹر گیان چند جین اسے وجہی کی ہی تصنیف مانتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر جمیل جالبی کی نظر سے ڈاکٹر نور السعید اختر کی مرتبہ 'تاج الحقائق'' نہں گزری۔اس کے دلائل پڑھ کر جالبی صاحب بھی قائل ہو جاتے۔ 'تاج الحقائق' اور 'سب رس' کے اسلوب اور فقروں میں اس قدر مماثلت ہے کہ کوئی شبہہ نہیں رہتا کہ 'سب رس' کا مصنف ہی 'تاج الحقائق' کا نقاش ہے۔وجہی کے دوسرے اہم محقق ڈاکٹر شیو پرشاد جاوید وشسٹ بھی اسے وجہی کی تصنیف مانتے ہیں۔'' ۳۳

اسی طرح وجہی کی مثنوی ''قطب مشتری'' کے بارے میں جمیل جالبی کا خیال ہے کہ یہ قلی قطب شاہ اور مشتری کی داستان عشق ہے اور مثنوی کا نام اسی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔(ص:۴۳۵) جب کہ ڈاکٹر سیدہ جعفر ''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک'' کے جلد سوم میں اس حوالے سے تفصیلی بحث کرتی ہیں اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ بھاگ متی ایک افسانوی پیکر ہے اور محمد قلی قطب شاہ کی زندگی سے مثنوی ''قطب مشتری'' کے واقعات کا کوئی تعلق نہیں۔۳۴ چھٹا باب ''فارسی روایت کی تکرار (۱۶۷۲ء-۱۶۸۶ء)'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں جیسا کہ عنوان سے واضح ہے کہ فارسی روایت کی تکرار کا جائزہ لیا گیا ہے۔جمیل جالبی کے مطابق اس دور میں کوئی وجہی یا غواصی جیسا شاعر نظر نہیں آتا اور نہ ہی کوئی قابل ذکر تصنیف ملتی ہے۔اس حصّے میں تانا شاہ، طبعی، مختار، خواص اور ضعیفی کا ذکر ملتا ہے۔ڈاکٹر گیان چند جین اس باب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس روایت کے سلسلے میں جمیل جالبی نے دکنی نثر کے دو اہم نمونوں کی طرف توجہ دلائی۔ایک فائز کی دکنی مثنوی ''رضوان شاہ روح افزا'' میں فصلوں کے عنوانات اردو نثر میں نقل کیا ہے۔دوسرا اہم نمونہ باقر آگاہ کی مثنوی ''گلزار عشق'' کا نثری دیباچہ ہے جس میں دکن اور شمالی ریختے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ان دونوں مثنویوں کا ذکر اس سے قبل کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔۳۵

''دکنی روایت کا خاتمہ'' یہ اس فصل کا آخری باب ہے۔اس باب میں سیاسی وتہذیبی طور پر قطب شاہی حکومت کے خاتمے کا ذکر ہے۔اس کے علاوہ اس حصّے میں ان شعرا کا بھی ذکر ہے جن کا مصنف کے

مطابق دکنی ادب کی روایت میں کوئی اہم کردار نہیں ہے۔ان شعرا میں حسن ذوقی ،قاضی محمود بحری اور باقر آ گاہ وغیرہ شامل ہیں۔

فصل ششم ''فارسی روایت کا نیا عروج: ریختہ (۱۶۸۵ء-۱۷۵۰ء)'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔اس فصل میں دو باب ہیں۔ پہلا باب ولؔی دکنی سے متعلق ہے جس میں ولؔی کے نام ،وطن اور سنہ وفات کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔جمیل جالبی ولؔی کا نام ''ولی محمد'' طے کرتے ہیں،لیکن گیان چندجین اس سے اتفاق نہیں کرتے ۔وہ لکھتے ہیں کہ محمد اکرام چغتائی نے اپنے ایک مضمون میں متعدد نسخوں، تذکروں اور دوسری کتابوں سے نام نقل کر کے کہ یہ فیصلہ کیا کہ ولی کا نام ''محمد ولی اللہ'' تھا۔۳۶ ڈاکٹر افشاں زوار اپنے جائزے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کے طے کردہ نام ''ولی محمد'' کو درست قرار دیتی ہیں۔تاہم وہ اس بابت لکھتی ہیں:

> ''ڈاکٹر محمد صادق 'تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند' جلد نمبر ایک میں گیارہویں باب کے صفحہ نمبر ۵۲۹ پر لکھتے ہیں کہ انڈیا آفس کتب خانے میں 'دیوان ولی' کا ایک نسخہ موجود ہے جو ولی کے دوست ابولمعالی کے فرزند نے ۱۷۳۳ء میں نقل کیا تھا۔اس پر یہ تحریر درج ہے 'تصنیف مغفرت پناہ میاں ولی متوطن دکن'۔اس بیان کی تائید ڈاکٹر گیان چندجین وسیدہ جعفر کی مشترکہ تالیف 'تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک' کی جلد چہارم کے نویں باب سے ہوتی ہے جس میں سیدہ جعفر اسی 'دیوان ولی' کے نسخے کی تحریر کو ولی کے نام کے سلسلے میں پیش کرتی ہیں۔ان دو شواہد کی روشنی میں جمیل جالبی کا طے کردہ نام 'ولی محمد' ہی درست قرار پاتا ہے۔''۳۷

اسی طرح ولؔی کا سنہ وفات جو جالبی مختلف حوالوں اور دلائل کی روشنی میں ۱۱۳۳ھ اور ۱۱۳۸ھ کے بیچ طے کرتے ہیں درست اور قابل اعتبار معلوم ہوتا ہے۔دوسرا باب ''معاصرین ولی اور بعد کی نسل'' سے متعلق ہے،اس باب میں سید محمد فراقی ،فقیر اللہ آزاد، داؤد اورنگ آبادی، سراج اورنگ آبادی اور شاہ قاسم

علی قاسم کا تذکرہ ہے، جس میں سراج اورنگ آبادی کا تذکرہ اور کلام کا نمونہ نسبتاً دوسروں سے زیادہ ہے۔اس بعد ''اختتامیہ'' ہے، جس میں آغاز سے ۱۷۵۰ء تک کے دور کی زبان اس کے اثرات اور ادبی روایت کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔سب سے آخر میں ''پاکستان میں اردو'' عنوان کے پانچ ضمیمے شامل ہیں جن میں پاکستان کے چار صوبوں میں اردو کے گہرے تعلق اور قدیم روایت کے سراغ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔''پنجاب اور اردو'' میں جمیل جالبی نے حافظ محمود شیرانی کے نظریئے کی تائید کی ہے کہ اردو کا اصل مولد پنجاب ہے۔''سندھ میں اردو'' عنوان کے تحت اہل سندھ کے کام کا جائزہ لیا گیا ہے۔''لسانی اشتراک'' میں اردو، پنجابی، سرائیکی اور سندھی گرامر کا جائزہ لے کر یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ سب ایک دوسرے سے کس قدر متاثر ہیں۔''سرحد میں اردو'' میں چند ادیبوں کے فن کا جائزہ لے کر یہ باور کرایا گیا ہے کہ ان ابتدائی شعرا کے یہاں اردو زبان کی موجودگی کس قدر ہے۔پانچواں اور آخری عنوان ''بلوچستان کی اردو روایت'' ہے۔اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ براہوی و بلوچی زبان کے بہت سے الفاظ اردو میں شامل ہیں۔بلوچستان میں اردو کی باقاعدہ روایت مصنف کی مطابق اٹھارہویں صدی سے شروع ہو جاتی ہے۔کئی زبانوں کا علاقہ ہونے کی وجہ سے سارے بلوچستان کے عام بول چال کی زبان بھی اردو ہے۔گیان چند جین اپنے جائزے میں اس آخری عنوان ''پاکستان میں اردو'' عنوان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''چار علاقوں کے ادب کا ضمیمے میں بیان کرنا خاکہ نگاری کا بہترین طریقہ نہیں۔اوّل تو ضمیمے کا مجموعی عنوان ''پاکستان میں اردو'' ہی قابل اعتراض ہے۔پاکستان اگست ۱۹۴۷ء میں وجود میں آیا۔اس سے پہلے کے ادب کو کس طرح پاکستان کا ادب کہہ سکتے ہیں۔'' ۳۸

گیان چند جین کا مندرجہ بالا اعتراض درست معلوم ہوتا ہے۔رشید حسن خاں نے بھی اپنے تبصرے میں ان ضمیموں کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے:

> ''ان ضمیموں نے تاریخی ربط اور تسلسل کو صحیح معنیٰ میں نقصان پہنچایا ہے۔مولف نے شروع میں اس کتاب کو ٹکڑوں میں تقسیم ہونے سے

بچایا تھا، مگر آخر میں اس تسلسل کو انتشار کے حوالے کر دیا۔''۳۹؎

ضمیموں کے بعد ۴۷ صفحوں کا طویل اشاریہ مختلف عنوانات کے تحت دیا گیا ہے، جس کی وجہ سے کسی علاقے، نام یا کتاب وغیرہ کو تلاش کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ گیان چند جین کے بقول جمیل جالبی نے اس کتاب کی پہلی جلد کے تحقیقی و تنقیدی جائزے میں جس عارفانہ نظر کا ثبوت دیا ہے اور جس طرح متعدد نئی معلومات بہم پہنچائی ہیں اور پہلے کی غلط معلومات کی تصحیح کی ہے وہ دادِ تحسین سے بالاتر ہے۔

جلد دوم

''تاریخ ادب اردو'' (جلد دوم) اٹھارہویں صدی کے جائزے پر مبنی ہے۔ یہ جلد دو حصّوں میں مجلس ترقی ادب لاہور سے ۱۹۸۲ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ ۱۹۹۴ء میں اس کا تیسرا اڈیشن اسی ادارے سے شائع ہوا۔ تاہم جائزے کے لیے میرے پیش نظر یہی تیسرا اڈیشن ہے۔ اس اڈیشن میں پہلے اور دوسرے حصّے کو ملا کر ایک کتاب کی صورت دے دی گئی ہے اور مزید کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ پیش لفظ پر ۱۲/ جون ۱۹۸۲ء ہی درج ہے۔ اس پیش لفظ میں کئی اہم باتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً جمیل جالبی تاریخ نگاری کے معیار و اصول کے بارے میں یہ لکھتے ہیں:

> ''اگر ادب زندگی کا آئینہ ہے تو ادب کی تاریخ کو بھی ایسا آئینہ ہونا چاہیے جس میں ساری زندگی کی روح کا عکس نظر آئے۔......تاریخ کا کام صرف یہ نہیں کہ وہ واقعات وحقائق کا محض اندراج کر دے بلکہ ضروری ہے کہ مختلف سروں کو باہمی ربط دے کر ایک ایسی تنظیم میں لے آئے کہ یہ تصویر پڑھنے والے کے ذہن پر نقش ہو جائے اور ادب کا حقیقی، تاریخی ارتقا بھی نظروں کے سامنے آ جائے......ادبی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آنی چاہیے کہ حال کا ماضی سے کیا رشتہ ہے اور یہ بات بھی کہ حال ماضی کو کیسے بدلتا رہتا ہے۔''۴۰؎

اسی پیش لفظ میں جمیل جالبی مورخ کے فریضے اور تاریخ نگاری سے اس کی دلچسپی اور وسیع مطالعے

اوراستخراج نتائج کی صلاحیت نیز اپنی زبان کے ادب کی تاریخ کے ساتھ دوسری زبان کے ادب کی تاریخ کا گہرا مطالعہ ضروری قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ادب کے مورخ کے لیے ضروری ہے کہ اس میں بیک وقت تاریخی شعور بھی ہو اور قوت تجزیہ بھی۔ نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت بھی ہو اور گہری تنقیدی نظر بھی۔ تحقیقی مزاج اور تربیت بھی ہو اور گہرا لسانی شعور بھی۔ اس نے نہ صرف اپنے ادب کا مربوط مطالعہ کیا ہو بلکہ قدیم وجدید بلکہ جدید تر ادب پر بھی گہری نظر رکھتا ہو۔ اس میں واقعات کو منطقی ترتیب سے بیان کرنے کی ایسی صلاحیت ہو کہ روایت کی تشکیل ،تعمیر اور پھر مختلف عوامل کے زیر اثر پیدا ہونے والی تبدیلی کے تدریجی سفر کو بھی تاریخ ادب میں واضح طور پر دکھا سکے۔''[۱۴]

بلاشبہہ جمیل جالبی کی یہ تاریخ ان کے بنائے گئے اصولوں پر پوری کھری اترتی ہے۔ اس مختصر ،مگر جامع پیش لفظ کے بعد ''تمہید'' ہے جس کے دو باب ہیں۔ پہلا باب ''اٹھارہویں صدی: سیاسی منظر ،طرز فکر ،تہذیبی ومعاشرتی رویئے'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں ۱۷۰۰ء سے لے کر ۱۷۹۹ء تک کے سیاسی حالات کا جائزہ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اس صدی کا مزاج ،اس کی اخلاقیات اور کردار کا مکمل خاکہ سامنے آجاتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ سیاسی زوال کس طرح کسی تہذیب ومعاشرت کو کھوکھلا اور کمزور کر دیتا ہے۔ دوسرے باب کا عنوان ہے ''اردو شاعری: رواج ،کشمکش ،اثرات ،محرکات ومیلانات''۔ جمیل جالبی اس باب میں سیاسی زوال اور دور انتشار میں پروان چڑھنے والی اردو زبان اور اس کی ادبی روایت کا ذکر کرتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ باب پوری جلد کا خلاصہ معلوم ہوتا ہے ،جس کی روشنی میں اٹھارہویں صدی کی لسانی وادبی کارناموں کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

جلد اوّل کی طرح جلد دوم میں بھی چھ فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں تین باب ہیں۔ فصل اوّل کا عنوان ''شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدائی روایت'' ہے۔ اس فصل کا پہلا باب تین حصّوں پر مشتمل ہے۔ (الف) مذہبی شاعری۔ روشن علی روشن :عاشور نامہ۔ (ب) لسانی خصوصیات ،شمال و دکن کی

زبانوں کا فرق۔(ج) مرثیے کی روایت مذہبی شاعری جس میں جنگ نامے، ملادنامے، معراج نامے، پند نامے، شہادت نامے اور وفات نامے وغیرہ شامل ہیں، یہ دکنی روایت کے زیر اثر شمال میں شروع ہوئے۔ جمیل جالبی کے نزدیک ان کی کوئی خاص ادبی حیثیت نہیں۔ البتہ لسانی اعتبار سے سترہویں صدی اور اٹھارہویں صدی کی زبان اور شمال وجنوب کی زبان کے فرق کو سمجھنے کے لیے ان کو اہم سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں جمیل جالبی نے روشن علی روشن کی نظم ''عاشور نامہ'' کا طویل تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ اس فصل کا دوسرا باب ''رزم نامے'' سے متعلق ہے۔ ابتدا میں اس صنف کی وضاحت کی گئی ہے۔ چنانچہ جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''رزنامے کے بارے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ رزمیہ نظموں (ایپک) سے مختلف نظم ہے۔ ''رزم نامہ'' اس طویل بیانیہ نظم کو کہتے ہیں جس میں شاعر نے کسی ایک جنگ کا حال بیان کیا ہو جس کا وہ خود عینی شاہد تھا یا اس نے یہ حالات کسی معتبر راوی سے سنے تھے۔ رزم نامہ مثنوی کی ہیئت میں یا تو خود فاتح کی فرمائش پر لکھا جاتا تھا یا شاعر فاتح سے انعام واکرام پانے کی امید میں خود لکھ کر پیش کرتا تھا یا پھر اس جنگ کے حالات و واقعات سے متاثر ہو کر سب کے فائدے کے لیے انہیں از خود موضوعِ سخن بناتا تھا۔'' [۴۲]

اس باب میں صرف دو رزم ناموں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ایک دکنی اردو میں لکھی ہوئی مثنوی ''جنگ نامہ عالم علی خاں'' جو ایک مجہول الاحوال شاعر غضنفر حسین کی تصنیف ہے۔ دوسرا رزم نامہ بھی ایک غیر معروف شاعر سید زاہد ثنا کا تحریر کردہ ''وقائع ثنا'' ہے۔ اس رزم نامے کی اہمیت یہ ہے کہ یہ اسی سال لکھی گئی جس سال پانی پت کی جنگ لڑی گئی اور اس میں وہ واقعات بیان کیے گئے ہیں جو مصنف نے خود دیکھے اور سنے تھے۔

فصل اوّل کا تیسرا باب ''طنز و ہجو کی روایت: جعفر زٹلی'' کے لیے مختص ہے۔ اس باب میں جعفر زٹلی کے کلام کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ غالباً جمیل جالبی کی یہ پہلی تاریخ ہے جس میں جعفر زٹلی سے متعلق اس قدر وضاحت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس تفصیل سے جعفر کی اصل قدر و قیمت کا بھی بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے۔

فصل دوم میں دو باب ہیں ۔ پہلا باب ''فارسی کے ریختہ گو: میرزا معزالدین محمد موسوی فطرت، خواجہ عبدالاحد، میرزا عبدالقادر بیدل، سعداللہ گلشن، نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام وغیرہ۔ کے ذکر پر مشتمل ہے۔ دوسرا باب'' فارسی کے ریختہ گو: سراج الدین علی خاں آرزو، انند رام مخلص، لالہ ٹیک چند بہار دہلوی، میر غلام علی آزاد بلگرامی وغیرہ''۔ کے احوال و آثار سے متعلق ہے۔ یہ دونوں ابواب اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔ گیان چند جین ان دونوں ابواب کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''میر نے 'نکات الشعرا' میں مرزا بیدل کی ایک اردو غزل کا مطلع و مقطع درج کیا تھا۔ انتساب پر شک ہوتا تھا حسن اتفاق سے ڈاکٹر جالبی کو کسی مولانا غلام کبریا خان افغانی کے بیاض میں پانچ اشعار پر مشتمل پوری غزل مل گئی۔ زبان بیدل کے دور سے قدر صاف ہے، ہوسکتا ہے کہ اصلاً بعض لفظوں کا املا و تلفظ فرسودہ تر رہا ہو۔ ''جلوۂ خضر'' میں بیدل کے نام سے ایک اور اردو شعر دیا ہے لیکن جالبی نے پتہ چلا لیا کہ یہ میر درد کا ہے...... میرے لیے یہ بھی نئی خبر ہے کہ شاہ گلشن نے تبرک اور نمونے کے طور پر ولی کو ایک غزل دے دی تھی جس کے مقطعے میں ولی نے اپنا تخلص ڈال کر اپنا لیا۔ بعد میں دیکھا تو ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے بھی کلیات ولی میں یہ بات لکھی ہے۔''[۴۳]

جمیل جالبی نے دوسرے باب میں خاص طور پر خان آرزو کا بھرپور اور مفصل تذکرہ کیا ہے۔ خان آرزو کی اولیات کے سلسلے میں جمیل جالبی نے یہ انکشاف کیا ہے کہ زبان کے معنیٰ میں لفظ ''اردو'' سب سے پہلے خان آرزو نے ''نوادر الالفاظ'' میں کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ مثلاً الگ الگ (الف) ''و در اردوئے معلیٰ می باشیم شنیدہ ایم۔'' (ب) لیکن لفظ مذکور و متعارف اردوئے بادشاہی و زبان اکبرآباد و شاہجہاں آباد نیست۔'' (ج) لیکن نکھتوڑا درعرف اردو وغیرہ بہ معنیٰ حرف ناز و غرور است۔'' (د) لیکن ہڑپھنا زبان اردو و اہل شہر بانیست۔'' (ص:۱۵۴)

فصل سوم کا پہلا باب ''ولی دکنی کے اثرات، تخلیقی رویئے، شاعری کی تحریک: ایہام گوئی'' کے

عنوان سے ہے۔اس باب میں ڈاکٹر جمیل جالبی صنعت ایہام کی وضاحت کرتے ہوئے اس دور کی تہذیبی اور شاعرانہ رویوں کا ذکر کرتے ہیں۔آخر میں شمالی ہند کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے جمیل جالبی یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

> ''آبؔرو کا دیوان اوّل ۱۱۳۹ھ یا اس سے پہلے مرتب ہو چکا تھا۔ فائزؔ کا دیوان اردو ۱۱۴۳ھ میں مرتب ہوا، اور شاہ حاتمؔ کا دیوان قدیم ۱۱۴۴ھ میں مرتب ہوا۔ابھی تک چوں کہ ناجیؔ، یک رنگؔ اور مضمونؔ وغیرہ کی شاعری کے آغاز کے سنین کا پتا نہیں ہے۔اس لیے شمالی ہند کے ریختہ گو شعرا میں آبؔرو پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں جنھوں نے ولیؔ کے انداز پر اپنا دیوان ریختہ مرتب کیا۔''۴۴؎

اس فصل کا دوسرا باب ''ایہام گو شعرا: شاہ مبارک آبرو'' سے متعلق ہے۔اس باب میں آبؔرو کی شاعری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔جمیل جالبی آبؔرو کو اپنے دور کا نمائندہ شاعر قرار دیتے ہیں اور نمائندہ شاعر ہونے کے لیے کن خصوصیات کا ہونا ضروری ہے اس کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔تیسرا باب ''دوسرے ایہام گو شعرا......'' کے حوالے سے ہے، جن میں محمد شاکر ناجیؔ، شرف الدین مضمون، مصطفیٰ خاں یک رنگ، احسن اللہ احسن، شاہ ولی اللہ اشتیاق وغیرہ شامل ہیں۔ان شعرا سے متعلق جمیل جالبی کا خیال ہے کہ آبرو کو چھوڑ کر یہ سب درجے کے شعرا ہیں۔اس فصل کے چوتھے اور آخری باب کے لیے ''غیر ایہام گو شعرا'' کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔اس باب میں اشرف گجراتی، محمد رضی رضی، ثناء اللہ ثنا، نواب صدرالدین محمد خاں فائز، شاہ تراب علی تراب، سید عبدالولی عزلت وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔یہ وہ شعرا ہیں جو ایہام گوئی کے دور میں ہوتے ہوئے بھی اس سے الگ تھلگ تھے اور ولیؔ سے متاثر تھے۔یہ سب دوسرے درجے کے شعرا تھے۔باوجود اس کے جمیل جالبی نے ان سب کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔جب کہ دیگر تاریخوں میں ان شعرا کا ذکر اس طرح نہیں ملتا۔البتہ بعض تذکروں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔یہ جمیل جالبی کا کمال ہے کہ انہوں نے ان شعرا کے احوال اور کلام تلاش و جستجو کے بعد جمع کر کے اسے ہمیشہ کے لیے اپنی تاریخ میں محفوظ کر دیا۔

فصل چہارم ''ردعمل کی تحریک'' کے عنوان سے ہے۔یہ فصل تین باب پر مشتمل ہے۔پہلا باب

''اسباب۔خصوصیت اور معیار سخن'' کے عنوان سے ہے جس میں ان شعرا کا تذکرہ ہے جنہوں ایہام کے خلاف ایک نیا اسلوب اور نیا راستہ اختیار کیا۔جمیل جالبی کے مطابق ''ردعمل کی تحریک'' کے نقاش اوّل مرزا مظہر جان جاناں تھے۔دوسرا باب ''ردعمل کے شعرا'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں مرزا مظہر جان جاناں، انعام اللہ یقین، میر عبدالحی تاباں، میر محمد باقر حزیں، اشرف علی خاں فغاں وغیرہ کی انفرادی خصوصیت اور ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اس باب میں جمیل جالبی نے مرزا مظہر جان جاناں کے قتل کا جو واقعہ بیان کیا ہے اس ضمن میں گیان چند جین لکھتے ہیں:

> ''جالبی کی یہ تاویل کہ 'مرزا کی شہادت کا واقعہ دراصل سیاسی نوعیت کا تھا' جی کو لگتی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ مظہر نواب مجدالدولہ عبدالاحد خاں کے حامی تھے۔آخر الذکر کے حریف نجف خاں وزیر نے مظہر کے خلاف یہ افواہ پھیلائی کہ انہوں نے محرم کے جلوس پر لعن طعن کی ہے، اور پھر ایک ایرانی سے انہیں قتل کرا دیا۔جالبی کی یہ دریافت اس دور کی ادبی تاریخ کی اہم معلومات ہے۔''[۴۵]

تیسرا باب ''ردعمل کے شعرا: شاہ حاتم'' سے متعلق ہے۔اس میں صرف شاہ حاتم کے کلام کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس جائزے میں جمیل جالبی نے دیوان قدیم اور دیوان زادہ کے مرتب کیے جانے والے زمانے کا تعین کیا ہے اور دونوں دیوان کا لسانی جائزہ لیتے ہوئے ان میں موجود فرق کو واضح کیا ہے۔جمیل جالبی کے مطابق دیوان قدیم میں ہندی الفاظ زیادہ ہیں جب کہ دیوان زادہ میں ان ہندی الفاظ کو فارسی الفاظ میں تبدیل کر دیا گیا۔

فصل پنجم کا عنوان ہے ''ردعمل کی تحریک کی توسیع''۔اس فصل میں ۹ باب ہیں۔پہلا باب ''میر و سودا کا دور: ادبی و لسانی خصوصیات'' پر مبنی ہے۔اس میں میر و سودا کے دور کی لسانی خصوصیات کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اس دور کے معاشرتی و تہذیبی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے یہ واضح کیا گیا ہے کہ ادب پر ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ساتھ ہی مختلف اصناف مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی، شہر آشوب وغیرہ کا تعارف اور ان کی خصوصیات بیان کی گئی ہے۔اس فصل کا دوسرا باب ''محمد تقی میر'' سے متعلق

ہے۔اس باب میں میؔر کے حالات زندگی، سیرت وشخصیت اور تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔تیسرا باب ’’میر کی شاعری‘‘ کے حوالے سے ہے۔۳۷ صفحوں پر پھیلے اس طویل مضمون میں جمیل جالبی نے بڑی عرق ریزی سے کام لے کر میؔر کا فنی تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اور ایک ایک رنگ کا بیان نہایت تفصیل سے کیا ہے۔میؔر کے فنی تجزیے میں جمیل جالبی میؔر کا مقابلہ فارسی شعرا کے علاوہ مغربی شعرا سے بھی کرتے ہیں۔ان کے مطابق میؔر کے کلام کی پختگی، زور اور فن ان شعرا سے کسی طرح کم نہیں ہے۔تاہم جدید شاعری کا جو عالمی رنگ ہے اس میں بھی میؔر عالمی شاعروں کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔اس باب میں میؔر کی مثنویوں اور مرثیوں کا بھی تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھا باب ’’مرزا محمد رفیع سوؔدا‘‘ سے متعلق ہے۔اس میں سوؔدا کی شخصیت اور کلام کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔سوؔدا اور میؔر دونوں ایک ہی دور کے نمائندے ہیں۔مگر جمیل جالبی نے سوؔدا کو میر کے مقابلے میں کافی کم صفحات دیئے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ سوؔدا کی غزل میں کوئی خاص انفرادی رنگ نہیں ہے بلکہ ان کی غزل فارسی غزل کا اردو روپ ہے۔دوسرے یہ کہ ان کی غزل کے مزاج پر قصیدے کا رنگ غالب ہے۔مگر جہاں تک سوؔدا کے قصیدے کی بات اس ضمن میں جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ’’قصیدہ سوؔدا کا وہ فن ہے جس میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔مصحفؔی نے سوؔدا کو قصیدہ گوئی میں ’نقاش اوّل‘ کہا ہے۔اور اس میں شک نہیں کہ ان سے پہلے شمالی ہند کے ادب میں قصیدے کی کوئی قابل ذکر روایت نہیں تھی۔......‘‘[۴۶]

پانچواں باب ’’خواجہ میر درؔد‘‘ سے متعلق ہے، جس میں درؔد کی شخصیت اور شاعری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اس میں یہ بھی وضاحت کی گئی ہے کہ اٹھارہویں صدی کی شعری روایت کو آگے بڑھانے میں خواجہ میر دردؔ کا اتنا ہی اہم رول ہے جتنا کہ میؔر وسوؔدا کا۔چھٹا باب ’’قائم چاندپوری، محمد میر سوز، خواجہ میر اثر‘‘ کے ذکر پر مبنی ہے۔سب سے پہلے قائم چاندپورہ کا تذکرہ ہے جس میں ان کی شخصیت اور فن کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں میؔر وسودا کے دور کے دوسرے درجے کا اہم شاعر بتایا گیا ہے۔البتہ جمیل جالبی نے تذکرہ نگاری کے ضمن میں ان کی اہمیت وافادیت کو واضح کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ قائم نے میر کی طرح اپنے گروہ کے شعرا کی

نہ بیجا طرف داری کی ہے اور نہ مخالفین کی پگڑی اچھالی بلکہ سب کے بارے میں متوازن رائے دی ہے۔قائم کے بعد سوز اور میر اثر کا تذکرہ ہے ان دونوں شعرا کی شخصیت اور فن کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ بالخصوص میر اثر کی مثنوی کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے مرثیے کے فن کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔مثنوی ''خواب وخیال'' کے تجزیئے میں جمیل جالبی یہ انکشاف کرتے ہیں کہ یہ مثنوی دو دفعہ میں لکھی گئی ہے۔(ص:۸۰۳) یعنی ''بہار عشق'' کے رنگ کے اشعار ایک بار کہے گئے ''توبہ واستغفار'' کے اشعار اس کے بعد کہے گئے۔

ساتواں باب ''میر حسن'' سے متعلق ہے۔فٹ نوٹ میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ''سحر البیان'' اور شاگرد سوداؔ، میر محمد حسن نیز خواجہ حسن حسن تینوں علیٰحدہ علیٰحدہ ہیں۔میر حسنؔ کا سنہ ولادت جمیل جالبی ۱۱۶۸ء مطابق ۳۷-۱۷۳۶ء متعین کرتے ہیں۔(ص:۸۲۲) جب کہ ان کے سنہ وفات کے متعلق صحیح یوم مقرر نہیں کرتے۔بلکہ یہ لکھتے ہیں کہ بقول شیر علی افسوس ۵/محرّم اور بقول مصحفیؔ عشرہ ماہ محرّم ۱۲۰۱ھ /۱۷۸۶ء ہے۔(ص:۸۲۴) سنہ ولادت ووفات کے مباحث کے بعد اس باب میں مثنوی ''سحر البیان'' کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے، ساتھ ہی مثنوی ''سحر البیان'' کا تخلیقاتی اثر دیگر لوگوں کی تخلیقات پر کیا پڑا اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

آٹھواں باب ''دوسرے شعرا'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں جعفر علی حسرت، میر محمد بیدار، قدرت اللہ قدرت، ہدایت، ہدایت اللہ ہدایت، ہیبت قلی خاں حسرت کا ذکر ہے۔یہ اگرچہ سب دوسرے درجے کے شاعر ہیں اور جمیل جالبی اس حقیقت کی وضاحت اپنی مورخانہ بصیرت کی مدد سے کرتے ہیں کہ انہیں دوسرے درجے کے شاعروں کی بدولت کسی دوسرے دور کے بڑے اور نمائندہ شاعروں کو امتیاز کرنا اور پہچاننا آسان ہو جاتا ہے۔اس کے علاوہ جمیل جالبی اپنی ناقدانہ صلاحیتوں کی بنا پر عام روایتی شاعری کے رنگ سے ان شعرا کا طرز انداز اور رنگ شاعری کو واضح کر کے ان کی اہمیت کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔اس فصل کا نواں اور آخری باب ''چند اور شعرا'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں شیخ رکن الدین عشق، مرزا محمد علی فدوی، شیخ غلام علی راسخ، محمد روشن جوشش، محمد عابد دل، شیر محمد خاں ایمان کا تذکرہ شامل ہے۔یہ وہ شعرا ہیں جن کا ذکر عموماً دوسری تاریخوں میں نہیں ملتا، جمیل جالبی نے ان کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ان کا تعارف پیش کیا ہے۔راسخ عظیم آبادی کی غزلوں کے بارے میں جمیل جالبی کی رائے یہ ہے:

> ''راسخ کی غزل میں ابتذال نہیں ہے۔ان کی شاعری ان باطنی تجربات کا اظہار ہے جن سے انسان کے فکرونظر کی قلب ماہیئت ہوتی ہے۔ان کی غزل میں حسن وعشق کے وہ پہلو جو چھیڑ چھاڑ، شوخی، معاملہ بندی، جنسیت وتماش بینی سے تعلق رکھتے ہیں ،کم وبیش نہیں ہیں ۔ان کی شاعری لکھنؤ کی شاعری سے مختلف قسم کی شاعری ہے اور اس شاعری پر لکھنوی تہذیب کا اثر اتنا بھی نہیں ہے جتنا ہمیں حسرت عظیم آبادی کی شاعری میں ملتا ہے۔''۴۷

فصل ششم ''اٹھارہویں صدی میں اردو نثر'' کے عنوان سے ہے۔اس فصل میں اردو نثر کو موضوعات کے اعتبار سے چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔تنقیدی، مذہبی، تاریخی اور افسانوی۔ پہلا باب ''اردو نثر کے رجحانات، اسالیب و ادبی خصوصیات'' کے حوالے سے ہے۔اس باب میں اٹھارہویں صدی کی نثری تخلیقات، رجحانات، اسالیب و ادبی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے مصنف یہ واضح کرتے ہیں کہ اس دور میں عوام کی اہمیت بڑھنے کی وجہ سے اردو جو عوام کی زبان تھی اس میں لکھنے کا رجحان بڑھنے لگا، اور زیادہ تر تصنیفات عام عوام کو آسان زبان میں سمجھانے کے لیے اردو زبان میں لکھی گئیں۔اس ضمن میں جمیل جالبی نے بڑی پتے کی بات کہی ہے اور وہ یہ کہ:

> ''اب تک یہ کہا جاتا رہا ہے کہ اردو نثر کا ارتقا فورٹ ولیم کالج کے مرہون منت ہے۔لیکن اس دور کی نثری تصانیف کو دیکھ کر...... یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اردو نثر فورٹ ولیم کالج سے بہت پہلے اپنا راستہ تلاش کر چکی تھی اور اس میں اتنی تصانیف وجود میں آچکی تھیں کہ ان کو نظر انداز کر کے اردو نثر کا پہلا مرکز فورٹ ولیم کالج کو کہنا کسی طرح درست نہیں۔''۴۸

دوسرا باب ''تنقیدی نثر اور اسالیب'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں سید برکت اللہ عشقی، مرزا جاں طپش دہلوی، سید عبدالولی عزلت ، مرزا علی نقی انصاف حیدرآبادی ،محمد باقر آگاہ ایلوری کی نثری

تصانیف کا جائزہ لے کر اردو نثر کی روایت میں ان کی قدر و قیمت متعین کی گئی ہے۔ سید برکت اللہ عشقی نے متعدد فارسی تصنیفات تخلیق کی ہیں، مگر ان کی نثری تصنیف ''عوارف ہندی'' جس میں متعدد اردو امثال اور کہاوتوں کی تشریح صوفیانہ انداز میں کی ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق عشقی کے یہاں استعمال ہونے والی ان کہاوتوں سے اس دور کی زبان کے مزاج اور مختلف زبانوں کے اثرات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مرزا جاں طپش دہلوی کی کتاب ''شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان'' جس میں ۲۹۰ اردو اصطلاحات و محاورات کی تشریح مستند شعرا کے کلام کے حوالوں سے ملتی ہے۔ طپش کا مقصد یہ تھا کہ دلّی سے دور رہنے والوں کے لیے ایک ایسی اردو فرہنگ تیار کی جائے جس سے سند لی جا سکے۔ اس کے علاوہ مثنوی ''بہار دانش'' اور کلیات طپش بیاض طپش کا ذکر بھی اس باب میں شامل ہے۔ مصنف کے مطابق یہ تصانیف مرزا جاں طپش اور اس دور کے حالات کے سلسلے میں ایک قابل ذکر ماخذ ہیں۔ عبدالولی عزلت کی اردو نثر کی اہمیت واضح کرتے ہوئے موصوف یہ بتاتے ہیں کہ عزلت پہلے شاعر جنہوں نے اپنے اردو دیوان کا دیباچہ اردو نثر میں لکھا جو اردو نثر کی تنقیدی اسلوب کا اوّلین نقش ہے۔ اسی طرح مرزا محمد رفیع سوداؔ کی مثنوی ''سبیل ہدایت'' کا بھی اس باب میں ذکر ملتا ہے جس کے دیباچہ میں اردو نثر میں مرثیہ اور شاعری سے متعلق خیالات ظاہر کیے گئے ہیں اس کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ سب سے آخر میں آگاہ ویلوری کے اردو دیباچوں کا تنقیدی تجزیہ پیش کر کے اردو نثر کی روایت میں اس کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

''مذہبی تصانیف اور اسالیب'' یہ تیسرے باب کا عنوان ہے۔ اس باب میں فضل علی فضلی (کربل کتھا) شاہ معین الدین حسین علی (فتوح المعین) شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی (تفسیر مرادیہ) شاہ محمد رفیع الدین (اردو ترجمہ قرآن) شاہ عبدالقادر (ترجمہ و موضح قرآن) حکیم محمد شریف خاں (ترجمہ و تفسیر قرآن) بنجمن شلزے (تراجم بائبل) وغیرہ کی تصانیف پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس باب کے ابتدا میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس دور میں اردو نثر میں ایسی تصانیف سامنے آئیں جن میں علم دین کو عوام تک پہنچا کر ان میں اصلاح اور زندگی کا نیا حوصلہ پیدا کرنے کی کوششوں کا شعور ملتا ہے۔ اس حصّے میں فضل علی فضلی اور ان کی کربل کتھا (دہ مجلس) کا خاصہ تفصیلی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ جمیل جالبی شاہ رفیع الدین کے ذکر میں یہ اطلاع دیتے ہیں کہ قرآن کے ترجمے کے علاوہ انہوں نے ایک ''تفسیر رفیعی'' بھی لکھی تھی جسے ان کے ایک شاگرد نے

درس کے طور پر جمع کیا تھا۔اس تفسیر کے سلسلے میں موصوف کا یہ خیال ہے کہ شاہ رفیع الدین کی اس تفسیر کا تذکرہ بہت کم کیا گیا ہے۔(ص:۱۰۵۰) جب کہ ڈاکٹر گیان چند جین اس بابت لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر سید حمید شطاری کا پی ایچ.ڈی کا مقالہ ''قرآن مجید کے اردو تراجم وتفسیر'' ۱۹۸۲ء میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔اس میں اس تفسیر کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔اسی طرح جمیل جالبی حکیم محمد شریف خاں کے ذکر میں ان کا سنہ وفات ۱۲۱۶ھ/۲-۱۸۰۱ء مولوی عبدالحق کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔اس بارے میں گیان چند جین اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں وضاحت کرتے ہیں کہ ڈاکٹر شطاری نے اپنے مقالے میں حکیم محمد شریف خاں کا سنہ وفات ان کے کتبہ مزار کے حوالے سے ۱۲۱۲ھ تحریر کیا ہے۔۴۹؎ آخر میں جمیل جالبی مول رام کا ترجمہ ''بھگوت گیتا'' ۱۷۸۱ء کا ذکر کرتے ہیں جس کی نثر میں ہندی اور ہندو اثرات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

چوتھا باب ''تاریخی نثر اور اس کا اسلوب'' کے عنوان سے ہے۔اس باب کی ابتدا میں جمیل جالبی یہ لکھتے ہیں کہ اس صدی میں بہت سی تاریخی کتابیں ترجمہ وتالیف ہوئیں مگر اکثر کتابوں کے سنہ تصنیف کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔موصوف کے مطابق اس دور میں ایک تاریخی تصنیف ''قصّہ و احوال روہیلہ'' یقیناً ایسی ہے جو اسی صدی کی تصنیف ہے اور یہ اس اعتبار سے اردو میں پہلی تاریخ کی کتاب ہے جس میں معاصر واقعات کو اردو نثر میں لکھا گیا ہے۔(ص:۱۰۷۴) یہی وجہ ہے کہ جمیل جالبی نے اس کتاب کا خاصہ تفصیلی جائزہ پیش کر کے اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔اس جلد کا پانچواں اور آخری باب ''افسانوی تصانیف اور اسالیب'' سے متعلق ہے۔اس باب میں عیسوی خاں کا ''قصّہ مہر افروز دلبر'' محمد حسین خاں عطا تحسین کی ''نو طرز مرصع''، منشی مہر چند کھتری لاہوری کی ''نو آئین ہندی'' شاہ عالم ثانی آفتاب کی ''عجائب القصص'' اور سید شاہ حسین حقیقت کی ''جذب عشق'' کا تنقیدی ولسانی جائزہ لیا گیا ہے۔
قصہ مہر افروز دلبر کے مصنف عیسوی خاں کے بارے میں ڈاکٹر مونس پرکاش کے حوالے سے جالبی یہ لکھتے ہیں:

> ''جیسے قصہ مہر افروز دلبر کو دریافت کرنے کا سہرا مسعود حسین خاں کے سر ہے اسی طرح عیسویں خاں کو دریافت کرنے کا سہرا ڈاکٹر پرکاش مونس کے سر ہے۔عیسوی خاں کی شخصیت اور زمانے کے تعین کے

> بعد (قصہ مہر افروز دلبر) اردو زبان کی قدیم ترین داستان قرار پاتی ہے، اور یہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلے حصے میں داستان ہے جو کل کتاب کے دو تہائی صفحات پر مشتمل ہے، اور ایک تہائی حصہ نصیحت نامے پر مشتمل ہے۔''۵۰

''نوطرز مرصع'' کے ضمن میں جمیل جالبی اس کے مختلف نسخوں پر بحث کرتے ہیں اور یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا تحسین نے نوطرز مرصع کے چاروں قصوں کو ۱۷۷۴ء میں ہی مکمل کر دیا تھے یا باقی حصے تحسین نے خود یا کسی اور نے مکمل کیا؟ (ص: ۱۰۹۴) اس حوالے سے بحث کرتے ہوئے وہ کئی ایسے نسخوں کی نشان دہی کرتے ہیں جن میں صرف ایک قصہ ملتا ہے۔ مگر اس بحث کو وہ کسی منطقی انجام تک پہنچانے سے قاصر رہتے ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں یہ تو لکھتے ہیں کہ نوطرز مرصع میں چار نہیں پانچ قصے ہیں اور سب کا اسلوب تحریر یکساں ہے، یعنی ایک ہی مصنف کے قلم سے نکلے ہیں۔۵۱ مگر انھوں نے بھی اپنے اس بیان کا مکمل حوالہ نہیں دیا جس سے بات ادھوری ہی محسوس ہوتی ہے۔ نوطرز مرصع کے بعد جمیل جالبی مہر چند کھتری کی ''نو آئین ہندی'' شاہ عالم ثانی کی ''عجائب القصص'' اور شاہ حقیقت کی ''جذب عشق'' کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس دور کی زبان کی شکل وصورت واضح کرتے ہیں۔

باب کے آخر میں مجموعی جائزہ پیش کیا گیا ہے جس سے اس دور کی پوری نثر کا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔ بقول گیان چند جین جالبی کا یہ کارنامہ خراج احترام کا طالب ہے۔ اس تاریخ میں معلومات کے انبار لگے ہیں۔ کوئی محقق ایسا نہ ہوگا جسے اس کے مطالعے سے متعدد نئی معلومات نہ ملیں۔ کوئی نقاد ایسا نہ ہوگا جسے اس کے تنقیدی بیانات سے رہبری و روشنی نہ ملے۔

جلد سوم: ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اردو'' کی تیسری جلد پہلی بار مجلس ترقی ادب، لاہور سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی۔ میرے پیش نظر اس جلد کا دوسرا اڈیشن ہے جس پر سنہ اشاعت ۲۰۰۸ء درج ہے۔ یہ جلد پچھلی دو جلدوں کا حصہ بھی ہے اور انفرادی حیثیت میں مکمل بھی ہے، اور اس کا طریق کار بھی پچھلی جلدوں کی طرح ہے۔ یعنی پانچ فصلوں پر یہ جلد مشتمل ہے۔ ابتدا میں پیش لفظ ہے جس میں یہ وضاحت ملتی ہے:

''وہ شعرا اور نثر نگار جس کا مطالعہ اس جلد میں کیا گیا ہے ان میں سے اکثر کے حالات اور ولادت و وفات کے سنین پوری طرح نہیں ملتے۔ ان سب کو ذرہ ذرہ جمع کر کے تاریخ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے تا کہ پڑھنے والا اس شاعر و ادیب سے اچھی طرح متعارف ہو جائے، ساتھ ہی ان مباحث اور معرکوں کو بھی شامل کیا گیا ہے جو شاعروں اور مصنفوں کو درمیان ہوئے اور آج اردو ادب کی تاریخ کا حصہ ہیں۔''۵۲؎

اسی پیش لفظ میں جمیل جالبی یہ بھی واضح کرتے ہیں:

''میں نے اس جلد میں دہلوی و لکھنوی دبستان کو الگ نہیں کیا ہے۔ یہ بات شعر الہند سے شروع ہوئی تھی اور پھر ایسی چلی گویا تہذیبی و تخلیقی سطح پر یہ دو الگ الگ دبستان ہیں۔ یاد رہے کہ دونوں کا طرز احساس ایک ہے، دونوں کی اقدار و تہذیب ایک ہیں۔ انیسویں صدی میں انہیں الگ الگ کرنے کی کوئی منطقی وجہ نہیں ہے۔''۵۳؎

پیش لفظ کے بعد ''انیسویں صدی: صورت حال، سیاسی منظر، تہذیبی و معاشرتی رویئے، تبدیلی کا عمل'' کے عنوان سے تمہید ہے، جس میں انیسویں صدی کی صورت حال کو واضح کیا گیا ہے۔ اس دور کا سیاسی منظر کیا تھا؟ تہذیبی و معاشرتی رویئے کیسے تھے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کا اظہار تمہید میں کیا گیا ہے۔

فصل اوّل کا پہلا باب ''اردو شاعری......محرکات و رجحانات، روایت کا سفر، کشمکش، تبدیلی، درمیانی کڑیاں، معیار سخن، اسباب اور خصوصیات'' کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اس باب میں جمیل جالبی انیسویں صدی کے نصف اوّل کے ہندوستان کی تہذیبی، لسانی و ادبی روایات کا جائزہ لیتے ہیں اور زبان و ادب کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تہذیبی رنگ و مزاج کو بھی واضح کرتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''میرؔ کے آخری زمانے کے لکھنؤ کے مذاق شاعری میں اتنی تبدیلی آ چکی تھی کہ خود میرؔ کے لیے اجنبی و ناقابل برداشت تھی۔ سوزؔ اور جرأت کے رنگ شاعری اس دور کے مقبول رنگ تھے۔ میرؔ نے سوز

سے کہا ''موقع محل تمہاری شعرخوانی وہ ہے جہاں لڑکیاں جمع ہوں اور ہنڈ کلیا پکتی ہو۔''......اس دور کے لکھنؤ کی تہذیب کا یہی مزاج تھا......اور اس کا اظہار اس دور کی شاعری میں ہوتا تھا۔''۵۴؎

دوسرا باب ''قلندر بخش جرأت'' سے متعلق ہے۔اس باب میں جرأت کی سیرت وشخصیت،معرکہ مصحفیؔ و جرأت کا بیان ہے۔ساتھ ہی ان کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ اور ان کی تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔شاعری کے تجزیاتی مطالعہ میں جرأت کے یہاں جو معاملہ بندی کے اشعار ملتے ہیں اس ضمن میں جمیل جالبی یہ وضاحت کرتے ہیں کہ معاملہ بندی کی شاعری سے جرأت کا تعلق گہرا اور واضح ہے،مگر فرق یہ ہے کہ وہ جو معاملے سامنے لاتے ہیں وہ معاملے سے زیادہ ذاتی جذباتی واقعات ہیں اور ان میں وہ واقعیت اور تسلسل ہے جو دوسرے معاملہ بندوں کے یہاں عام طور پر نہیں ملتا۔

تیسرا باب ''انشاءاللہ خاں انشا'' سے متعلق ہے۔اس باب میں انشاؔ کی سیرت وشخصیت،ادبی معرکے، تصانیف،شعری خصوصیات وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔چوتھا باب ''مصحفیؔ'' کی سیرت وشخصیت پر مبنی ہے۔اور پانچواں باب ''مصحفیؔ'' کے فن اور تخلیقات وغیرہ کے ذکر پر مشتمل ہے۔اس باب میں مصحفیؔ کی اکثر تصانیف کا جائزہ لیتے ہوئے جمیل جالبی اس کی خوبیوں کو واضح کرتے ہیں۔مصحفیؔ کے تذکرے ''عقد ثریا'' کی خصوصیات بتاتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں کہ اس تذکرے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مصحفیؔ اکثر مقامات پر سنین ولادت ووفات وغیرہ بھی درج کرتے جاتے ہیں،اور بعض ایسی معلومات بھی دیتے ہیں جو صرف اسی تذکرے میں ملتی ہیں۔(ص:۱۹۹)اسی طرح انہوں نے مصحفیؔ کے آٹھوں دیوان کا الگ الگ جائزہ لیا ہے اور اس دور کی زبان کا مفصل حال بیان کیا ہے۔

چھٹا باب ''سعادت یار خاں رنگینؔ'' سے متعلق ہے۔اس باب میں رنگینؔ کے حالات،سیرت و شخصیت،تصانیف،نظم ونثر کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔رنگین ریختی کی صنف کی وجہ سے مشہور ہوئے اور ان کی اصل شخصیت اور دیگر کارنامے پس منظر میں چلے گئے۔بقول افشاں زوار جمیل جالبی کی اس تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ادب کی دنیا میں ریختی کے لیے بدنام شاعر کا اپنا بلند ادبی مقام بھی ہے۔نیز یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک مورخ کس طرح غلط باتوں کی گرد ہٹا کر کسی شاعر یا ادیب کی اصل شخصیت وحیثیت کو ظاہر کرسکتا

ہے۔۵۵؎ جمیل جالبی رنگینؔ کی شاعری اور قادرالکلامی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''رنگینؔ قادرالکلام اور پرگو شاعر تھا۔انہیں فن شعر پر پورا عبور حاصل اور اپنی مشاقی پر بڑا ناز تھا۔''امتحان رنگینؔ'' میں لکھا ہے کہ اصناف سخن کی تعداد (۲۷) ہے اور سب کے طرز بھی جدا جدا ہیں۔کوئی شاعر ایسا نہیں جس نے ستائیس کی ستائیس اصناف کو مختلف طرزوں کے ساتھ استعمال کیا ہو۔رنگین نے بتایا ہے کہ انہوں نے کسی مثنوی میں اہل شیرازی کے طرز میں تجنیس قافیہ کا اہتمام کیا ہے۔کسی مثنوی میں میر حسن کی طرز میں 'سحرالبیان' کا جواب لکھا ہے۔کسی مثنوی می مولانا روم کے انداز میں حکایات کے ذریعے روح تصوف کو اجاگر کیا ہے۔کہیں عشق کو موضوع بنا کر عشقیہ مثنوی کا انداز اختیار کیا ہے۔کہیں مولانا جامی کے طرز کو اپنایا ہے اور کامیابی سے نبھایا ہے۔''۵۶؎

فصل اوّل کا دوسرا حصّہ ''چند دوسرے شعرا: روایت کی تکرار'' کے عنوان سے ہے، اور اس حصّے کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ان ابواب کے تحت جن شعرا کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایسے شعرا ہیں جن کا ذکر بالعموم کسی تاریخ ادب میں نہیں ملتا۔تذکروں میں البتہ ان کا مختصر ذکر مل جاتا ہے، مگر کسی ادبی مورخ نے ان کو اس طرح مقام وحیثیت عطا نہیں کیا جس طرح جمیل جالبی نے کیا ہے۔اس حصّے کا پہلا باب ''ثنا اللہ فراق'' کے تذکرے پر مبنی ہے۔جمیل جالبی ان کی ادبی قدر و قیمت کو بیان کر کے یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایک درجہ دوم کا شاعر بھی روایت میں اپنا مقام و مرتبہ رکھتا ہے اور ایسے شعرا کے ذکر کے بغیر ایک خاص دور کا اصل رنگ نمایاں نہیں ہوتا۔اس حصّے کا دوسرا باب ''ولی اللہ محبؔ'' کے حالات و شاعری کے جائزے پر مبنی ہے۔تیسرا باب ''شہزادہ سلیمان شکوہ'' سے متعلق ہے۔جمیل جالبی کے مطابق اس کی شاعری میں کوئی انفرادی خصوصیت نہیں۔البتہ وہ قابل ذکر اس لیے ہیں کہ انہوں نے دہلی سے لکھنؤ آ کر شعرا کی اس انداز مین سرپرستی کی کہ دوسرے سلاطین اودھ نہ کر سکے۔اس حصّے کا چوتھا اور آخری باب ''مرزا محمد تقی خاں ہوس'' سے، متعلق ہے۔ہوسؔ مصحفیؔ کے ممتاز شاگرد تھے اور جمیل جالبی کے مطابق اپنے

دور کے قادرالکلام، مشاق، پرگو اور مقبول شاعر تھے۔انہوں نے ضخیم ''دیوان اردو'' کے علاوہ دو مثنویاں ''لیلیٰ مجنوں'' اور ''گل صنوبر'' تصنیف کی ہیں۔

فصل اوّل کا تیسرا حصّہ ''چند اور شعرا: روایت کی تبدیلی کا عمل و آغاز'' کے عنوان سے ہے۔یہ حصّہ بھی چار ابواب پر مشتمل ہے جو طالب علی خاں عیشی، جسونت سنگھ پروانہ، قاضی محمد صادق اختر، مہدی علی خاں زکی مرادآبادی کی سیرت و شخصیت، تصانیف اور شاعری کے تنقیدی جائزے پر مبنی ہے۔

فصل دوم: ''اردو نثر: فورٹ ولیم کالج'' سے متعلق ہے۔یہ فصل پندرہ ابواب پر مشتمل ہے۔اس میں فورٹ ولیم کالج، اس کی ادبی خدمات اور اس سے منسلک اہل قلم حضرات کی ادبی کاوشوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔''فورٹ ولیم کالج: مقاصد و تعارف'' یہ پہلے باب کا عنوان ہے، جس میں فورٹ ولیم کالج کے آغاز اور مقاصد پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔باقی تیرہ ابواب میں تیرہ نامور اصحاب کے حالات و فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ان میں گلکرسٹ، میر امن دہلوی، شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، نہال چند لاہوری، میر بہادر علی حسینی، مظہر علی خاں ولا، کاظم علی جواں، حفیظ الدین احمد، خلیل علی خاں اشک، مولوی اکرام، بینی نرائن جہاں اور مرزا علی لطف شامل ہیں۔پندرہواں اور آخری باب ''فورٹ ولیم کالج کی چند غیر مطبوعہ تالیفات و تراجم'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں میر امن کی ''باغ و بہار'' کے بارے میں جمیل جالبی یہ معلومات مہیا کراتے ہیں:

> ''میر امن کی اس تصنیف کا پہلا نام 'چہار درویش' تھا جس کا سال تکمیل ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۱ء ہے۔۱۸۰۳ء میں جب ''ہندوستانی پریس'' سے یہ دوبارہ چھپنی شروع ہوئی اور ۱۸۰۴ء میں مکمل ہوئی تو میر امن نے طباعت سے پہلے مسودہ پر نظر ثانی کی۔شیر علی افسوس نے بھی جہاں اس کے جملے بے ربط تھے انہیں مربوط کیا۔نظر ثانی کیا ہوا یہی مسوہ پہلی بار ۱۸۰۴ء میں ''باغ و بہار'' کے نام سے ہندوستانی پریس کلکتہ سے شائع ہوا۔'' ۵۷

شیر علی افسوس کے ضمن میں جمیل جالبی فورٹ ولیم کالج میں ان کی تقرری کی درست تاریخ

۱۵/ اکتوبر ۱۸۰۰ء بتاتے ہیں۔ (ص:۴۵۴) نیز جمیل جالبی کے مطابق شیر علی افسوس کی کتاب ''باغ اردو'' فورٹ ولیم کالج کی پہلی مطبوعہ کتاب ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس پوری فصل میں جمیل جالبی مورخ سے زیادہ نقاد نظر آتے ہیں۔ وہ جگہ جگہ اپنی ناقدانہ بصیرت سے کام لے کر فن پارے کی قدر و قیمت واضح کرتے ہیں اور اپنی رائے دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔

فصل سوم: ''نوطرز مرصع اور فسانۂ عجائب کی درمیانی کڑیاں'' کے عنوان سے ہے۔ اس فصل کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں تین باب ہیں۔ پہلے باب میں محمد بخش مہجور کی سیرت و شخصیت اور ان کی تصانیف کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ''عظمت اللہ نیاز'' اور تیسرے باب میں ''غلام علی عشرت'' کے حالات اور تصانیف سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ اس فصل کا دوسرا حصہ ''نثر رنگین کا نقطۂ عروج'' کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ اس حصے میں بھی تین باب ہیں۔ پہلا باب ''مرزا رجب علی بیگ سرور'' سے متعلق ہے۔ اس باب میں سرور کی شخصیت اور تصانیف کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ''فسانۂ عجائب'' کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے اس دور کے معاشرے کا نفسیاتی تجزیہ بھی جمیل جالبی پیش کرتے ہیں۔ اس حصے کا دوسرا باب ''فخر الدین حسین سخن دہلوی: سروش سخن'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں فخر الدین حسین کی حالات زندگی بیان کی گئی ہے اور سروش سخن پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں سخن دہلوی کی کی تاریخ پیدائش (۱۲۵۳ء؟) پر سوالیہ نشان لگا ہوا ہے۔ اس ضمن میں افشاں زوار لکھتی ہیں کہ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سنہ مشکوک ہے۔ جمیل جالبی نے درمیان میں ایک واقعہ کی مدد سے سنہ ولادت ۱۲۴۶ھ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر افشاں زوار کا یہ اعتراض بالکل بجا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ ادب کے ایک اصول کے ٹھوس شواہد کے بغیر قیاس آرائی کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس لیے اس سنہ کو درست نہیں مانا جا سکتا۔[۵۸] اس حصے کا تیسرا باب ''جعفر علی شیون: حالات و مطالعۂ طلسم حیرت'' سے متعلق ہے۔ اس میں جعفر علی شیون کی سیرت و شخصیت اور ان کے فن پارے کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق جعفر کی ''طلسم حیرت''، ضلع جگت کی آخری تصنیف ہے اور اس میں لکھنوی تہذیب کی ساری خصوصیات موجود ہیں، مگر اس کو پڑھنا ایک کڑا امتحان ہے اور اس داستان کی اہمیت اب صرف تاریخی رہ گئی ہے۔

فصل چہارم: ''ناسخ و آتش'' کے دور سے متعلق ہے۔ اس فصل کے بھی تین حصے ہیں۔ پہلے حصے

میں تین باب ہیں۔ان تینوں ابواب میں سادہ گوئی کے خلاف ردعمل اورطرز جدیدوتازہ گوئی کے رواج پر بحث کی گئی ہے۔ پہلا باب ''ناسخ وآتش کا دور: پس منظراور رجحانات'' کے عنوان سے ہے۔اس میں جمیل جالبی نے بڑی تفصیل سے لکھنؤ کی ادبی وتہذیبی روایات کا جائزہ لیا ہےاوراس دور کے بعض اہم رجحانات واصناف کا تذکرہ بھی کیا ہے۔مثلاً اصلاح زبان کی تحریک،لغت نویسی کا رجحان، واسوخت اور ریختی کی اصناف کی مقبولیت وغیرہ وغیرہ۔اس حصے کا دوسراباب ''شیخ امام بخش ناسخ'' کی حیات وخدمات پرمبنی ہے۔اور تیسراباب ''خواجہ حیدرعلی آتش'' کی حیات وخدمات پر۔دونوں کی شاعرانہ خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئےجمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''ناسخ وآتش کےکلیات کا مطالعہ کیا جائے تو دوسو کےقریب غزلیں ایک ہی زمین میں ملیں گی۔اس شاعری پرلکھنؤ کی تہذیبی فضا کا اثر ہےلیکن ساتھ ہی آتش کے اپنے مزاج کا ہلکا سا اثر بھی رنگ گھولتا ہے۔ناسخ کے ہاں 'حسن' کا بیان ہے۔عشق ان کی شاعری کا نہ حصہ ہےاور نہ مزاج۔ناسخ کے نزدیک یہ سادہ گویوں کا کام تھا جس پر انہوں نے خط تنسیخ پھیردیا تھا۔آتش کے ہاں بیان حسن کے ساتھ عشق کا اثر بھی ساتھ چلتا ہے۔مضمون آفرینی اور تلاش معنی دونوں کے ہاں موجود ہےلیکن ناسخ کی غزل میں جذبہ واحساس بالکل نہیں ہے۔جب کہ آتش کے ہاں دبادبا سا جذبہ رنگ گھول رہاہے۔ناسخ اورآتش دونوں کے ہاں خارجیت ہےلیکن آتش کی خارجیت میں ذرا سی داخلیت ملی ہوئی ہے اوراسی لیے ذراسی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ناسخ کے ہاں لفظوں کی بندش اور جماؤ کے باوجود چستی نہیں ہے۔ان کے ہاں اکثر آورد کا احساس ہوتا ہےلیکن زبان کے زیادہ بےساختہ و برجستہ استعمال کی وجہ سے آتش کے شعر میں لطف بیان پیدا ہوجاتا ہے۔''[۵۹]

اس فصل کا دوسرا حصہ ''چند دوسرے شعرا: طرز جدید کی تکرار و توسیع'' کے عنوان سے ہے۔ یہ حصہ دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں پہلا باب ''علی اوسط رشکؔ'' سے متعلق ہے، جس میں رشکؔ کے حالات اور کلام و فن پر گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرا باب ''فتح الدولہ مرزا محمد رضا برقؔ'' کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اس میں برق کے سوانحی حالات اور ان کے فکر و فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرا باب ''امداعلی بحرؔ'' کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں بحر کا سنہ وفات ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء کا ذکر ہے سنہ ولادت کا نہیں۔ جمیل جالبی کے مطابق امداد علی بحر کا دیوان ۱۲۸۵ھ میں پہلی بار مطبع مصطفائی لکھنؤ سے مرتب ہونے کے ۳۳ سال بعد شائع ہوا۔ اسی طرح بحر کی ایک مختصر تصنیف کا ذکر کرتے ہوئے جمیل جالبی یہ بتاتے ہیں کہ اس کا واحد مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے جسے رشید حسن خاں نے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ اس رسالے میں ''قوانین ہندی یعنی اردوئے لکھنؤ بطریق صرف و نحو'' بیان کیے گئے ہیں۔ (ص:۷۷۴)

دوسرے حصے کا چوتھا باب ''خواجہ محمد وزیر لکھنوی'' کے حالات و مطالعۂ شاعری پر مبنی ہے۔ پانچواں باب ''فقیر محمد گویا'' سے متعلق ہے جس میں گویا کے حالات کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں ان کی مشہور و معروف تصنیف ''بستان حکمت'' کا تعارف کرایا گیا ہے۔ چھٹا باب ''کلب حسین خاں نادرؔ'' کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اس باب میں نادرؔ کا سنہ وفات نہیں دیا گیا ہے۔ حالات زندگی کا مختصر بیان ہے اور ان کی ۱۳ تصانیف کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق نادرؔ کی اہم تصنیف ''تلخیص معلیٰ'' ہے جس میں قواعد اردو مرتب کیے گئے ہیں۔ ساتواں باب ''مرزا حاتم علی مہرؔ'' کے حالات، تصانیف اور ان کی شاعری کے جائزے پر مبنی ہے۔ مرزا حاتم ولی مہر کو عام طور پر غالبؔ کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ اس تجزیئے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ آٹھویں باب میں ''میر کلّو عرشؔ'' کا تذکرہ ہے۔ اس میں میر تقی میرؔ کے بیٹے اور اپنے وقت کے استاد سخن میر کلّو عرش کی سیرت و شخصیت، تصانیف اور ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ نواں باب ''عبدالغفور نساخؔ'' سے متعلق ہے۔ عبدالغفور نساخ شاگردان ناسخ میں سے تھے۔ جمیل جالبی نے ان کے حالات اور کلام و فن پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور ان کی سوانح عمری ''سوانح عمری نساخ'' کو انیسویں صدی کی پہلی قابل ذکر

سوانح عمری قرار دیا ہے۔(ص: ۸۳۲)اس حصے کا دسواں اور آخری باب ''اندرسبھا اور واسوخت کی مقبولیت......'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں جمیل جالبی آغا حسن امانت لکھنوی کی اندرسبھا کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے اسے ڈرامہ کی روایت میں اوّلیت کا درجہ دیتے ہیں۔ساتھ ہی امانتؔ کے لکھے ہوئے تین واسوخت کا ذکر بھی کرتے ہیں۔جمیل جالبی کے مطابق ''اندرسبھا'' سے پہلے امانتؔ اپنے واسوخت کی وجہ سے ہی مشہور تھے۔جمیل جالبی واسوخت کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

''واسوخت ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں شاعر اپنے ہرجائی و بے وفا معشوق سے طعن و تشنیع کے انداز میں شکوہ شکایت کرتا ہے اور کسی دوسرے خیالی معشوق سے تعلق پیدا کرنے کا اس طور پر ذکر کرتا ہے کہ ہرجائی معشوق میں جذبۂ رفاقت بیدار ہوجائے اور دوبارہ اپنے عاشق سے اظہار محبت کرے پھر سے اس کا ہوجائے۔''[۶۰]

اس فصل کا تیسرا حصہ ''روایت آتش کی توسیع:تکرار اور امتزاج'' کے عنوان سے ہے۔اس میں تین باب ہیں اور تینوں آتش کے شاگردوں کی خصوصیات شاعری کے جائزے پر مبنی ہیں۔پہلا باب ''سید محمد خاں رندؔ'' کے حالات اور ان کی شاعری کے حوالے سے ہے۔رندؔ کا سنہ ولادت جمیل جالبی ان کے دیوان ثانی کے دو اشعار کی مدد سے ۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء متعین کرتے ہیں۔سنہ وفات کے بارے میں جمیل جالبی کا یہ کہنا ہے کہ رندؔ کی تاریخ وفات کسی تذکرے یا کتب تواریخ میں نہیں ملتی۔البتہ مختلف شواہد کی روشنی میں وہ رندؔ کا سنہ وفات ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء طے کرتے ہیں۔اس حصے کا دوسرا باب ''میر وزیر علی صباؔ'' سے متعلق ہے۔جس میں صباؔ لکھنوی کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور ان کی شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔تیسرا باب ''آغا حجو شرف'' کے حالات زندگی اور شاعری کے جائزے پر مبنی ہے۔آغا حجوؔ کی ایک مثنوی ''افسانہ لکھنؤ'' کے بارے میں جالبی یہ لکھتے ہیں کہ اس میں متعدد ایسے امرا،شہزادگان،شہزادیوں،عمائدین، وزرا،اطبا،شعرا،علما وغیرہ کا ذکر ملتا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے اس دور میں اہمیت کے حامل تھے۔ساتھ ہی ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں لکھنؤ اور اودھ، بہادر شاہ ظفر اور دہلی پر کیا گزری اس کی داستان بھی اس مثنوی میں رقم کی گئی ہے۔مصنف کے نزدیک یہ مثنوی اس دور کی اہم تصنیف ہے۔

اس فصل کے چوتھے اور آخری حصے کا عنوان ’’شاگردانِ آتش میں مثنوی کی منفرد روایت‘‘ ہے۔اس حصے میں دو باب ہیں۔ پہلا باب دیاشنکر نسیم سے متعلق ہے جس میں نسیم کے حالات اور مثنوی ’’گلزارِ نسیم‘‘ کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔دیاشنکر نسیم کا دورِ حیات (۱۸۱۱ء-۱۸۴۵ء) متعین کرتے ہوئے جمیل جالبی یہ لکھتے ہیں:

’’سالِ ولادت پہلی بار چکبست نے دیباچہ ’گلزارِ نسیم‘ میں دیا ہے اور بقول رشید حسن خاں اس سلسلے میں کوئی اور قول نہیں ملتا۔علی اوسط رشک کے قطعۂ تاریخ کے مطابق نسیم کا سالِ وفات ۱۲۶۱ھ/ ۱۸۴۵ء ہے۔‘‘۶۱

گلزارِ نسیم کے تنقیدی جائزے میں جمیل جالبی مثنوی اور اس کے ماخذ کے حوالے سے پر مغز بحث کرتے ہیں۔اس ضمن میں افشاں زورا لکھتی ہیں:

’’گلزارِ نسیم کا تنقیدی جائزہ جالبی کو ایک ظرف نگاہ نقاد کی صورت میں پیش کرتا ہے جسے اپنے موضوع پر بہت مہارت حاصل ہے۔جالبی نے اس مثنوی کے بہت سے اجزا اور صنائع لفظی و معنوی کو اس طرح واضح کیا ہے کہ قاری کے لیے اب یہ مثنوی ایک نئے فن کی صورت میں سامنے آتی ہے اور لطف اندوزی کے نئے در وا ہوتے ہیں۔‘‘۶۲

اس باب کے آخر میں ’گلزارِ نسیم‘ کے حوالے سے معرکۂ چکبست و شرر کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔یہ معرکہ دیاشنکر نسیم کی وفات کے ساٹھ سال بعد پیش آیا اور تاریخِ ادب کا حصہ بن گیا۔اس معرکہ میں گلزارِ نسیم کے کئی گم شدہ پہلو نکل کر سامنے آئے جس کی وجہ سے مثنوی کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔اس حصے کا دوسرا باب ’’نواب مرزا شوق‘‘ سے متعلق ہے۔اس میں مرزا شوق کے مختصر حالات بیان کرنے کے بعد ان کی مثنویوں (فریبِ عشق، بہارِ عشق، زہرِ عشق) کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔نیز مثنویوں کے ماخذ کے حوالے سے بھی بحث کی گئی ہے۔

اس جلد کی آخری فصل: فصل پنجم ہے۔یہ دو ابواب پر مشتمل ہے۔پہلا باب ’’واجد علی شاہ‘‘ کے حالات و تصانیف کے جائزے پر مبنی ہے۔ابتدا میں مختصر سیاسی و تہذیبی پس منظر بیان کیا گیا ہے اس کے

بعد واجد علی شاہ کے فنی کمالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔اس جلد کا دوسرا اور آخری باب ''نظیر اکبر آبادی'' سے متعلق ہے، جس میں نظیر کی شاعرانہ شخصیت کو موضوع بحث بنا کر ان کی شاعرانہ اہمیت وحیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔جمیل جالبی نظیر کے مختلف مرتبین کے حوالے سے نظیر کی نثری تصانیف کا ذکر کرتے ہیں مگر ان تصانیف کا مختصر سا تعارف یا اقتباس نقل نہیں کرتے۔ بقول افشاں زوار اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جمیل جالبی کو یہ تصانیف میسر نہ آسکیں۔باجود اس کے نظیر کے حوالے سے یہ باب معلومات کا خزانہ معلوم ہوتا ہے۔نظیر کی شاعری میں کثرت الفاظ کا ذکر کرتے ہوئے جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''نظیر نے جتنے الفاظ استعمال کیے ہیں اتنے الفاظ کسی اردو شاعر حتیٰ کہ میر انیس نے بھی استعمال نہیں کیے۔انہوں نے سینکڑوں الفاظ اپنے گرد و پیش کی زبانوں سے لے کر اردو زبان میں ایسے ٹانک دیئے ہیں کہ وہ آج اس زبان کا حصہ بن گئے ہیں۔لفظوں کی سطح پر یہ کام بہت کم شاعروں نے کیا ہے۔'' ۶۳

باب کے آخر میں اس جلد کا اشاریہ دیا گیا ہے۔علاوہ ازیں آخر میں تین صفحے کا ''صحت نامہ'' بھی دیا گیا ہے جس میں مختلف اغلاط اوران کی درستگی دی گئی۔ یہ جلد بھی ماقبل کی دونوں کی جلدوں کی طرح اپنی جگہ مکمل اور جامع ہے اور دونوں جلدوں سے مربوط ہے۔

جلد چہارم: ''تاریخ ادب اردو' جلد چہارم انیسویں صدی کے نصف آخر کے جائزے پر مبنی ہے۔ یہ جلد دو حصوں میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤ، دہلی سے ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئی۔اسی ادارے سے ۲۰۱۵ء میں اس کا دوسرا اڈیشن طبع ہوا۔جائزے کے لیے آخرالذکر اڈیشن ہی میرے پیش نظر ہے۔یوں تو جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اردو'' کو میں نے دوسری تاریخی کتابوں کا جائزہ لیتے وقت حوالے کے طور پر استعمال کیا ہے۔جمیل جالبی کے بیان اور دوسرے مورخین کے بیانوں بالخصوص سنین میں کہیں اختلاف ہوتا ہے تو میں جالبی کو ترجیح دیتا ہوں، کیوں کہ یہ تاریخ ہر لحاظ سے وقیع اور جامع ہے۔اس لیے اس جلد کا تفصیلی جائزہ نہ پیش کر کر کے محض اجمالی جائزے پر اکتفا کیا گیا ہے۔

چوتھی جلد دو حصوں میں منقسم ہے اور یہ محض ضخامت کی بنا پر کی گئی ہے۔کسی دور یا روایات کی وجہ

سے نہیں۔مثلاً حصہ اوّل کے آخر میں اکبرالہ آبادی کا ذکر ہے،اور حصہ دوم کے شروع میں سیر سید احمد خاں کا۔اور یہ دونوں ایک دور کے عمائد ہیں۔دونوں حصوں کی وحدت کو برقرار رکھنے کے لیے اشاریہ صرف دوسرے حصّے کے آخر میں دیا گیا ہے۔ذیل میں دونوں حصوں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

پہلے حصّے میں تین فصل ہے اور ہر فصل کئی کئی ابواب پر مشتمل ہے۔ابتدا میں ۹ صفحات پر مشتمل تمہید ہے جس میں انیسویں صدی کے نصف صدی کی صورت حال، رجحانات، آزادی کی کوشش اور ۱۸۵۷ء کے بغاوت کا ذکر ہے۔خصوصاً انیسویں صدی کے نصف آخر میں برطانیہ کے شاعروں، ڈرامہ نگاروں، ناول نگاروں اور صحافیوں نے کس طرح ''سانحۂ کان پور'' اور ''محاصرۂ لکھنؤ'' کو اپنے فکشن کا موضوع بنا کر ہندوستانی باشندوں کا ظلم دکھانے کی کوشش کی جارہی تھی، اور دوسری طرف انگریز عیسائی سپاہیوں کی رحم دلی، فراخ دلی اور غیر معمولی جذبۂ ایثار کو اجاگر کر کے دور وکٹوریہ کے مردانہ پن کو ابھارنے کی کوشش کر رہے تھے۔اس کی پوری تفصیل جمیل جالبی نے پیش کی ہے۔اس ضمن میں وہ سرسید احمد خاں کی حکمت عملی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جسے انگریزوں نے ''بغاوت'' کا نہیں بلکہ ''غدر'' کا نام دیا تو سرسید نے نہایت دیانت داری کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ اس وقت انگریزوں کے خلاف تصادم کا راستہ اختیار کرنا لاحاصل ہے۔اس لیے انہیں ساتھ لے کر آگے قدم بڑھانا مفید اور مناسب ہوگا۔اس تعلق سے انہوں نے سوچا کہ مسلمانوں کو قدیم دور سے نکال کر جدید دور میں داخل کرنے کے لیے جدید تعلیم دی جائے تاکہ وہ بدلے ہوئے سیاسی منظر میں اپنی معاشی، سماجی اور سیاسی صورت حال کو بہتر بنا سکیں اور اس دلدل سے نکل سکیں جس میں وہ بری طرح دھنسے ہوئے تھے۔''[۶۴]

تمہید کے بعد فصل اوّل سے کتاب کی ابتدا ہوتی ہے۔اس فصل کے پہلے حصّے میں سات باب ہیں اور سبھی کے سبھی باب غالبؔ کے حوالے سے ہیں۔پہلا باب ''غالبؔ اور ان کا دور'' کے عنوان سے ہے

جس میں انیسویں صدی کے نصف آخر کے سیاسی حالات اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر ہے۔جمیل جالبی کے مطابق اس دور میں اردو زبان قلعۂ معلیٰ کی زبان بن کرامیر سے فقیر تک سب کی زبان بن گئی تھی،اور بادشاہ و طبقۂ خواص کی آواز اردو زبان کے باعث اب براہ راست عوام تک پہنچنے لگی تھی۔دوسرے باب میں غالبؔ کی سوانح پر منحصر ہے۔جس میں ان کے خاندانی پس منظر،ولادت و وفات،پنشن کا قضیہ،کلکتے کا معرکہ،قید کے واقعے کا وغیرہ کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔تیسرے باب میں غالبؔ کی سیرت وشخصیت اوران کے مزاج کے حوالے سے پر لطف باتیں بیان کی گئی ہیں۔چوتھے باب میں غالبؔ کی اردو،فارسی تصانیف کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اس جائزے میں جمیل جالبی نے کچھ ایسی تصانیف کا ذکر کیا ہے جن کا ذکر دوسری تاریخی کتابوں میں عموماً نہیں ملتا۔مثلاً 'باغ دو در'دعاء صباح،رسالہ فن باک وغیرہ۔پانچویں باب میں غالبؔ کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے مصنف نے غالبؔ کی طرز ادااورار دوغزل پر غالبؔ کے اثرات کو بھی واضح کیا ہے۔چھٹا باب غالبؔ کی فارسی شاعری کے حوالے سے ہے۔جالبی کے مطابق غالبؔ کا اصل کمال دراصل ان کی فارسی غزل میں نظر آتا ہے جہاں وہ ہر اثر سے بلند اٹھ کر وارفتگی کے عالم میں انفرادیت کا سکہ بٹھاتے ہیں۔(ص:۱۶۸)اس فصل کے ساتویں اور آخری باب میں غالبؔ کی اردونثر نگاری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔غالبؔ ہمیشہ فارسی شاعری اور فارسی نثر کو وجہ افتخار سمجھتے تھے،لیکن جب انہوں نے سرسری طور پر تکلف سے بری اردو میں خطوط لکھنے شروع کیے تو ان میں ایک رنگا رنگ،ہمہ گیر اور زندگی سے بھرپور شخصیت کا اظہار اس طرح ہوا کہ ہر طرف سے داد و تحسین ملنے لگی اور ان خطوط نویسی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔جمیل جالبی اس باب میں غالبؔ کے خطوط کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آج جو اردو نثر کا دریا پھیل کر سمندر بن گیا ہے اس کا ایک بڑا مخرج و منبع یہی اردو خطوط غالبؔ ہے۔

اس فصل کا دوسرا حصہ ''دوسرے بڑے شعرا'' کے عنوان سے ہے۔اس فصل میں پانچ باب ہیں۔ پہلا باب ''شاہ نصیر دہلوی'' سے متعلق ہے جس میں شاہ نصر کے حالات زندگی اور کلام کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔جمیل جالبی شاہ نصیر کا دور حیات (۱۱۵۷ھ-۱۲۵۴ھ/ ۱۷۶۱ء-۱۸۳۸ء) متعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شاہ نصیر کا سال ولادت کسی ذریعے سے معلوم نہیں ہوتا۔شیفتہ نے

اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ 'از مدت شصت سال بر سر مشق پختہ است' گلشن بے خار کا زمانۂ تصنیف ۱۲۴۸ھ-۱۲۵۰ھ ہے، اگر قیاساً شاہ نصیر کا ترجمہ ۱۲۴۹ھ میں لکھا گیا اور اس وقت انہیں شعر کہتے ساٹھ سال ہو چکے تھے تو گویا ۱۲۴۹ھ-۶۰=۱۱۸۹ھ میں انہوں نے شاعری شروع کی۔ اگر اس وقت ان کی عمر ۱۴ سال فرض کر لی جائے تو ان کا سال ولادت ۱۱۸۹ھ-۱۴=۱۱۵۷ھ متعین کیا جا سکتا ہے۔ حسرؔت موہانی نے بھی بغیر کسی حوالے کے شاہ نصیر کا سال ولادت ۱۱۵۷ھ دیا ہے۔ تنویر احمد علوی ان کا سال ولادت ۱۱۷۰ھ-۱۱۷۵ھ کے مابین مقرر کرتے ہیں۔'' ۶۵

دوسرا باب ''محمد ابراہیم ذوقؔ'' سے متعلق ہے۔ اس باب میں ذوقؔ کے حالات، ان کی شخصیت اور شاعری کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ جمیل جالبی نے مختلف شواہد و دلائل کی روشنی میں ذوق کی تاریخ پیدائش وسنہ وفات (۱۲۰۳ھ-۱۲۷۱ھ/ ۸۹-۱۷۸۸ء......۱۸۵۴ء) متعین کیا ہے۔ تیسرا باب ''بہادر شاہ ظفر'' کے حوالے سے ہے جس میں بہادر شاہ ظفر کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس تجزیے میں جمیل جالبی یہ سوال قائم کرتے ہیں کہ کیا بہادر شاہ ظفر کا کلام ان کے استاد ذوق کا کلام ہے؟ پھر وہ اس پر تفصیلی بحث کرتے ہیں اور نتیجہ نکالتے ہیں کہ ظفر کے کلام کے مزاج اور انداز بیان کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ محمد حسین آزاد نے اپنے استاد کو نادانی میں ذلیل کرایا ہے، اور ظفر کی عوامی مقبولیت کو کم کرنے میں حکومت وقت کا ساتھ دیا ہے۔ (ص:۳۰۶) چوتھا باب ''مومن خاں مومنؔ اور پانچواں باب ''مصطفیٰ خاں شیفتہ'' کے حالات زندگی اور ان کے کلام وفن کے جائزے پر مبنی ہے۔ اس فصل کا تیسرا اور آخری حصہ ''چند اور ممتاز شعرا: روایت کی اشاعت'' کے عنوان سے ہے۔ اس حصے میں کل ۹ باب ہیں جن میں سید علی غمگینؔ دہلوی، میر ممنونؔ نظام الدین دہلوی، نواب محمد اصغر علی خاں، میر مہدی مجروح، قربان علی بیگ سالکؔ، قلی میرٹھی، نظام رام پوری، ظہیر دہلوی، انور دہلوی کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

فصل دوم ''اردو مرثیہ'' سے متعلق ہے ۔اس فصل کا پہلا حصہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ''اردو مرثیہ: روایت و ارتقا'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے جس میں مرثیے کی روایت وارتقا اور اس کا پس منظر بیان کیا گیا ہے۔اسی باب میں مرثیے کے حوالے سے سوداؔ کا مختصر تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ دوسرا باب ''میر مستحسن خلیقؔ'' سے متعلق ہے جس میں میر مستحسن خلیقؔ کے مرثیوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔جمیل جالبی کے مطابق خلیق کے یہاں صحت محاورہ ، زبان میں صفائی و شائستگی ،خوب صورت تراکیب اور پر اثر بندش الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔تیسرا باب ''مظفر حسین ضمیرؔ'' چوتھا باب ''چھنو لال دلگیرؔ'' اور پانچواں باب ''مرزا جعفر علی فصیحؔ'' کے مرثیوں کے جائزے پر مبنی ہے۔ تیسرے باب میں ضمیرؔ کے مرثیوں کے تجزیاتی مطالعہ کے علاوہ ان کی چار مثنویوں نسخۂ محبت ،معراج نامہ ،مظہر العجائب اور چہاردہ بند، کا ذکر بھی ملتا ہے۔جمیل جالبی کے مطابق ''چہاردہ بند'' ضمیرؔ کے چودہ قصائد کا مجموعہ ہے جن میں چودہ معصومین کی مدح بیان کی گئی ہے ۔اس باب میں ضمیرؔ کی اردو غزل کا ذکر کرتے ہوئے جمیل جالبی یہ بتاتے ہیں کہ عبد الغفور نساخ اور محسن لکھنوی نے انہیں صاحب دیوان لکھا ہے۔ضمیرؔ کا دیوان نایاب ہے، مصحفیؔ نے ''ریاض الفصحا'' میں ان کی غزلوں کے انیس شعر پیش کیے ہیں۔اسی طرح ڈاکٹر اکبر حیدری نے بھی مختلف بیاضوں سے ضمیرؔ کی غزلوں کے ۱۳۱ اشعر جمع کیے ہیں۔(ص:۵۷۴)اس باب میں ''مرثیہ گوئی'' کا بھی مختصر ذکر ہے۔ جالبی کے مطابق اس صنف کے موجد میر ضمیرؔ ہی ہیں۔ضمیرؔ نے اسے مرثیہ کے وزن پر ہرثیہ کا نام دیا ہے۔جمیل جالبی اس صنف میں پیش کیے جانے والے موضوعات کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''اس میں تمسخرانہ انداز اور ہجویہ رنگ میں ایسی شاعری کی جاتی ہے جس میں تبرا واضح طور پر مومنین کے دلوں کو شاد کرے اور جسے سن کر وہ ثواب دارین حاصل کریں۔ ہرثیہ میں اسی لیے شیعہ عقیدہ کے مطابق آل محمد کے دشمنوں کی ہجو کہی جاتی ہے جو تبرا کی ہی ایک صورت ہے اور ۹ ربیع الاوّل کو ''عید شجاع'' کے موقع پر لکھنؤ میں ہرثیہ کی محفلیں جمتی ہیں۔''۶۶؎

اس فصل کا دوسرا حصہ ''اردو مرثیہ کا نقطۂ عروج'' کے عنوان سے ہے۔اس فصل میں صرف دو باب ہیں۔ پہلا باب میر انیسؔ سے متعلق ہے جب کہ دوسرا باب مرزا دبیرؔ کے حوالے سے ہے۔جمیل

جالبی نے ان دونوں شعرا کے مرثیوں کا بھرپور اور مفصل جائزہ لیا ہے۔ میر انیسؔ کے باب میں جالبی نے ایک ضمنی عنوان ''میر انیسؔ کے کلام پر بحثیں: امداد امام اثر سے ڈاکٹر احسن فاروقی تک'' قائم کیا ہے، جس میں یہ وضاحت ملتی ہے کہ اس بحث کا باقاعدہ آغاز کب ہوا اور میر انیسؔ کی شاعری کے بارے میں کس نے کیا کہا اور کہنے والے کا زاویۂ نظر کیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ اس فصل کا تیسرا اور آخری حصہ ''روایت کی تکرار: دوسرے مرثیہ گو'' کے عنوان سے ہے۔ اس حصے میں چھ باب ہیں جن میں میر مونسؔ، میر عشق، میر تعشق، مرزا محمد جعفر اوجؔ، میر نفیس اور پیارے صاحب رشید کی مرثیہ گوئی کے حوالے سے مختصراً گفتگو کی گئی ہے۔

فصل سوم کا عنوان ہے ''دور جدید کی توسیع: اردو نثر کا تنوع، طنز و مزاح کی روایت''۔ اس فصل میں دو باب ہیں۔ پہلا باب ''اودھ پنچ، اشاعت وخصوصیات'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں اودھ پنچ کے بانی منشی سجاد حسین اور طنز و مزاح کی روایت کا ذکر ہے۔ جالبی کے مطابق اودھ پنچ کا پہلا شمارہ ۱۶ جنوری ۱۸۷۷ء میں منظر عام پر آیا اور اتنی تیزی سے مقبول ہوا کہ پورے ہندوستان میں اس کی دھوم مچ گئی۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انیسویں صدی میں ہندوستان کے اٹھائیس شہروں سے تقریباً ۷۰ پنچ اخبارات منظر عام پر آئے۔ (ص: ۷۱۷) مواد، اسلوب اور پالیسی کے اعتبار سے ان سب میں یکسانیت پائی جاتی تھی۔ ان کا مشترکہ ہدف مغربی تہذیب اور سرسید کی اصلاحی تحریک تھی۔ دوسرا باب ''اودھ پنچ کے ممتاز لکھنے والے'' سے متعلق ہے۔ اس باب کے دو جز ہیں۔ (الف) جس میں مرزا مچھو بیگ، جوالہ پرشاد برق، پنڈت تربھون ناتھ ہجر، نواب سید محمد آزاد کا ذکر ہے۔ جز (ب) اکبرؔ الہ آبادی سے متعلق ہے۔ یہ جز ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں مصنف نے اکبرؔ الہ آبادی کے تمام پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ان کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ''اکبرؔ کی مزاحیہ شاعری کی بنیادیں ان کی سنجیدہ شاعری پر ہی کھڑی ہیں۔ اگر وہ پچاس سال کی عمر تک وہ شاعری نہ کرتے جو انہوں نے کی تو وہ اس پایہ کی مزاحیہ شاعری بھی تخلیق نہیں کر سکتے تھے جس سے ان کا نام آج تک روشن ہے۔''[۶۷]

فصل سوم کا پہلا حصہ (جلد چہارم) کے پہلے حصے پر ختم ہوجاتا ہے، اور اس فصل کا دوسرا حصہ جلد

چہارم کے دوسرے حصے سے شروع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے ''اردو کے عناصر خمسہ''۔ اس میں باب کے قائم مقام نمبر دیا گیا ہے۔ ابتدا میں تمہید ہے اس تمہید میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت، اس کے اثرات اور سرسید کی حکمت عملی کا ذکر ہے۔ جمیل جالبی کے مطابق سرسید نے اپنی زندگی میں جو کچھ کیا وہ سب اسی حکمت عملی کا نتیجہ تھا۔ اگر سرسید حکمت عملی اختیار نہ کرتے تو سوچئے آج ان کی قوم کیا اور کہاں ہوتی۔ سرسید کی حکمت عملی کو جمیل جالبی نے اسی تاریخی پس منظر میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔

تمہید کے بعد سرسید کے سوانحی حالات و واقعات، ان کا سیاسی شعور، تہذیب الاخلاق کا اجرا اور مقصد، ان کی ادبی خدمات، ان کے مضامین کی عام خصوصیات وطرز ادا وغیرہ کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے، اور آخر میں سرسید کا مقام و مرتبہ متعین کیا گیا ہے۔ سرسید کے بعد حالی کا ذکر ہے جس میں حالی کی زندگی، ان کی تصانیف اور شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ساتھ ہی حالی کی حیثیت بطور نقاد یا نثر نگار کہ کیا ہے اس کی وضاحت کی گئی ہے اور آخر میں تاریخی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ حالی کے بعد محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی اور نذیر احمد کے حالات زندگی اور ان کے کلام وفن کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان عناصر خمسہ کے بارے میں جالبی لکھتے ہیں:

> ''اردو ادب کے ان پانچ روشن ستاروں نے اپنی جدید فکر سے وہ راستہ دکھایا کہ اردو ادب قدیم دور سے نکل کر جدید دور میں داخل ہو گیا۔ آج تک اردو ادب میں جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کی بنیاد میں یہ سب لوگ شامل ہیں۔ ان سب میں اسلام قدر مشترک کا درجہ رکھتا ہے۔ ان سب کے انداز ہائے فکر مختلف تھے، لیکن یہ سب چشمے دور جدید کے دریا سے آملتے ہیں۔''[۶۸]

فصل سوم کا آخری حصہ ''روایت شاعری کا فروغ'' کے عنوان سے ہے۔ اس عنوان کے تحت جن شعرا کا ذکر کیا گیا ہے مصنف کے مطابق یہ سب کے سب روایتی شاعری کے آخری دور کے ممتاز شعرا ہیں۔ ان شعرا کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا باب ''سید اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی'' سے متعلق ہے۔ اس باب میں ان کے مختصر سوانحی حالات بیان کیے گئے ہیں نیز ان کے کلام کا فنی جائزہ لیا گیا

ہے۔ جالبی کے مطابق مسلسل غزل کا رجحان اس دور میں منیرؔ شکوہ آبادی کی انفرادیت ہے۔ یہی وہ رجحان ہے جو آنے والے دور میں نظم گوئی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرا باب ''سید مظفر علی اسیرؔ لکھنوی'' کے حالات زندگی اور ان کی شاعری کے جائزے پر مبنی ہے۔ اس جائزے میں جمیل جالبی یہ وضاحت کرتے ہیں کہ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ واجد علی شاہ کی مثنوی ''عشق نامہ'' اسیرؔ کی تصنیف ہے۔ یہ بات اس لیے صحیح نہیں ہے کہ عشق نامہ ''درۃ التاج'' (جو اسیرؔ کی غیر مذہبی عشقیہ مثنوی ہے) ہی کا ایک حوالہ ہے جس کا ذکر اس مثنوی میں آیا ہے اور جس پر سجاد علی مرزا نے مفصل اور مفید بحث کی ہے۔ (ص:۱۲۲۶) تیسرے باب میں ''امیر اللہ تسلیمؔ لکھنوی'' کی حیات و شاعری کا ذکر ہے۔ چوتھا باب ''میر ضامن علی جلالؔ لکھنوی'' سے متعلق ہے۔ اس حصے میں سب سے زیادہ صفحات جلالؔ لکھنوی کو دیئے گئے ہیں جن میں ان کے حالات زندگی، شاعری اور تصانیف کا مفصل ذکر ہے۔

فصل چہارم (جلد چہارم) کی آخری فصل ہے اور یہ ۹ حصوں پر مشتمل ہے۔ اس فصل کے ہر حصے میں ابواب کے بجائے نمبر دیئے گئے ہیں۔ پہلا حصہ ''اردو داستانیں: تمہید و مطالعہ'' کے عنوان سے ہے۔ ابتدا میں داستانوں کا مختصر پس منظر بیان کیا گیا ہے اس کے بعد ''طلسم ہوش ربا'' اور ''بوستان خیال'' کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ داستانیں کب لکھی گئیں، ان کے ماخذ کیا ہیں، ان کے مترجم کون کون ہیں، کس کی فرمائش پر لکھی گئیں، تراجم میں کن کن چیزوں کا خیال رکھا گیا، ترجمہ شدہ داستانوں کی زبان کیسی ہے۔ ان داستانوں کی اہمیت کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس فصل کے دوسرے حصے کا عنوان ''داستان اور ناول کا امتزاج'' ہے۔ اس حصے میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کا مختصر تعارف پیش کیا گیا اور ''فسانۂ آزاد'' کے حوالے سے مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں سرشار کے دوسرے ناول اور تصانیف کا بھی مختصراً ذکر کیا گیا ہے۔ تیسرے حصے کا عنوان ہے ''دوسرے اصناف نثر کا مطالعہ''۔ اس حصے میں یوسف خاں کمبل پوش کا سفرنامہ ''عجائبات فرنگ'' سیاحت نامہ کریم خاں (روزنامچہ) روزنامچہ سید مظہر علی سندیلوی کا ذکر ہے۔ چوتھا حصہ ''مذہبی تصانیف میں اردو نثر کا استعمال'' ہے۔ اس میں اسماعیل شہید دہلوی کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' اور سید غوث علی شاہ قلندر کے تذکرے ''تذکرہ غوثیہ'' کا ذکر کرتے ہوئے مصنف اردو نثر میں ان کتابوں کی اہمیت کو اجاگر کرتے

ہیں۔ پانچواں حصہ ''تذکروں میں اردو نثر'' کے عنوان سے ہے، جس میں گلشن ہند، خوش معرکۂ زیبا، تذکرہ طبقات الشعراء ہند، انتخاب یادگار، کے مصنفین کا مختصر تعارف پیش کیا گیا اور ان تذکروں کے بارے میں جمیل جالبی نے یہ رائے پیش کی ہے:

> ''یہ سب تذکرے اردو نثر میں لکھے گئے ہیں۔ ان تذکروں کو پڑھ کر یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ تذکرے جو ۱۸۵۷ء سے پہلے یا اس کے لگ بھگ آگے پیچھے لکھے گئے ہیں ان اور جملوں کی نثر پر مسجع و مقفع طرز ادا کا واضح اثر ہے، اور جملوں کی ساخت پر فارسی انداز نثر کا اثر ہے۔ اور وہ تذکرے جو ۱۸۵۷ء کے دس، پندرہ یا بیس سال بعد لکھے گئے ان کی نثر کا رخ سادہ بیانی کی طرف ہے۔''۶۹

فصل چہارم کا چھٹا حصہ ''کتب تواریخ میں اردو نثر'' کے حوالے سے ہے۔ اس حصے میں صرف دو تاریخی کتابوں کا بہت ہی مختصر ذکر ہے۔ ایک نیاز احمد کی ''تاریخ روہیل کھنڈ'' اور دوسری پنڈت کشن نرائن کی تالیف کردہ ''تاریخ بندیل کھنڈ'' ہے۔ جالبی دونوں کتابوں سے ایک ایک اقتباس بھی پیش کرتے ہیں۔ ساتواں حصہ ''اردو نعت گوئی کا نیا رنگ، نئی روایت'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں محسن کاکوروی اور کرامت علی خاں کے حالات زندگی اور ان کے کلام وفن کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ مصنف کے مطابق محسنؔ کاکوروی کا تاریخی نام منظور الٰہی تھا۔ آٹھواں حصہ ''شاعری کے دو روایتی رنگ'' کے عنوان سے ہے، جس میں امیرؔ مینائی اور مرزا داغؔ دہلوی کی سیرت وشخصیت، ان کی شاعری اور تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس حصے پر انیسویں صدی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور فصل چہارم کا نواں حصہ ''جدید دور کا ارتقا'' کے عنوان سے شروع ہوتا ہے جس میں صرف ایک شاعر یعنی مولوی اسماعیل میرٹھی کو شامل کیا گیا ہے اور ان کے تمام پہلوؤں کو احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسماعیل میرٹھی کی شاعرانہ حیثیت کا ذکر کرتے ہوئے جالبی لکھتے ہیں:

> ''وہ (اسماعیل میرٹھی) حقیقی معنیٰ میں نیچر پسند ہیں اور اردو شاعری کے سامنے ایک وسیع وعریض میدان کھول دیتے ہیں۔ شاعری کو زندگی سے

> قریب لانے اور یہ بتانے کے لیے کہ دنیا کی ہر چیز کو شاعرانہ بنایا جا سکتا ہے وہ یکتا ہیں۔ان کا خاص مقصد 'اصلاح' ہے اور اصلاح کو شاعری سے ہم آہنگ کرنے کی وہ خود ایک منفرد مثال ہیں۔اسی طرح نیچرل شاعری کے دائرے میں بھی وہ اپنی مثال آپ ہیں۔'' ۱۷۰

اس فصل کے اختتام پر اس جلد کا اشاریہ اور کتابیات درج کی گئی ہیں۔۸۱ صفحات پر مشتمل یہ طویل اشاریہ اور کتابیات جمیل جالبی کی محنت کا بین ثبوت ہیں اور قارئین کے لیے سود مند۔یہ مفصل، مکمل اور مستند تاریخ فرد واحد کی کامیاب کوششوں کا بہترین نتیجہ ہے۔ایسی ضخیم اور مستند تاریخ کئی سالوں کی محنت شاقہ کے بعد اور کئی لوگوں کی مدد سے تشکیل پاتی ہے،لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ جمیل جالبی نے تن تنہا اس مشکل کام کو انجام دیا ہے۔اس تاریخ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے حتی الامکان اصل ماخذ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔اصل متون اور مخطوطے تلاش کر کے ان سے معلومات حاصل کیں اور ان سے اپنی تاریخ کو معتبر بنایا ہے۔ڈاکٹر گیان چند جین کے بقول کوئی محقق ایسا نہ ہوگا جسے اس کے مطالعے سے متعدد نئی معلومات نہ ملیں،کوئی نقاد ایسا نہ ہوگا جسے اس کے تنقیدی بیانات سے رہبری و روشنی نہ ملے۔

تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک- پروفیسر سیدہ جعفر و پروفیسر گیان چند جین

پانچ جلدوں پر مشتمل ''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک'' دو مورخین یعنی پروفیسر سیدہ جعفر اور پروفیسر گیان چند جین کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے جو ۱۹۹۸ء میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔اس تاریخ میں بظاہر بارہ ابواب ہیں اور ان بارہ ابواب میں اردو کے آغاز سے لے کر ۱۷۰۰ء تک کے ادب کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

جلد اوّل کی ابتدا میں قومی کونسل کے ڈائرکٹر حمید اللہ بھٹ کا تحریر کردہ دیباچہ ہے۔جس میں انہوں نے چند سطروں میں تشکیل زبان کے مرحلے کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور ادارہ قومی کونسل نیز دونوں

مصنفین کی کاوشوں کو سراہتے ہوئے اس تاریخ سے تعلیمی ضرورت کے پورا ہونے کی امید ظاہر کی ہے۔ یہ دیباچہ پانچوں جلدوں کے آغاز میں فہرست مضامین سے پہلے شامل کیا گیا ہے جو غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ خود ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں اپنی اس تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے اس پر اعتراض کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''عجیب بات یہ ہے کہ یہ (دیباچہ) ہر جلد کی ابتدا میں دیا گیا ہے۔
حالاں کہ پانچوں جلدیں مل کر ایک کتاب ہیں۔ دیباچہ یا مقدمہ
کتاب کے ابتدا میں ہوتا ہے۔ بیچ بیچ میں نہیں۔''اے

دیباچہ کے بعد ڈاکٹر گیان چند جین کا مقدمہ ہے جس میں کتاب کے خاکے کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ان کے مطابق کتاب کا خاکہ ۱۳ بابوں پر مشتمل ہے۔ چھ باب انہوں نے خود لکھا ہے اور چھ باب سیدہ جعفر نے۔ بارہویں باب کا کچھ حصہ ڈاکٹر گیان چند جین نے لکھا ہے اور کچھ ڈاکٹر سیدہ نے۔۲ے جیسا کہ ابتدا میں یہ ذکر کیا گیا تھا کہ اس تاریخ میں بہ ظاہر بارہ ابواب ہیں۔ دراصل اس کی حقیقت کیا ہے اس ضمن میں خود ڈاکٹر گیان چند جین اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں وضاحت کی ہے کہ اس کتاب کا خاکہ تیرہ ابواب پر مشتمل تھا اور آخری تیرہواں باب جو ہندی اور فارسی روایات کی آویزش و آمیزش کے موضوع پر تھا وہ گم کر دیا گیا۔ بعد میں یہ گم شدہ باب ناشر کے پاس بھیج دیا گیا تا کہ ضمیمے کے طور پر چھاپا جا سکے۔۳ے موجودہ اڈیشن کی پانچویں جلد میں یہ باب کتابیات کے بعد بہ طور ضمیمہ شامل ہے۔

''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک'' کے اکثر حصے ڈاکٹر سیدہ جعفر کی تحقیقی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں اور جس کا اعتراف خود گیان چند جین نے اپنے مقدمہ میں بھی کیا ہے۔ اس تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر ابرار عبدالسلام نے پانچوں جلدوں میں موجود دونوں مورخوں کے لکھے ہوئے صفحات کی نشان دہی کی ہے۔ ذیل میں اسے پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے تا کہ کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ معلوم کرنے میں دقت پیش نہ آئے کہ کون سے صفحات کس مورخ کے نتائج فکر کا نتیجہ ہیں۔ ان صفحات کی تفصیل یہ ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین کے لکھے ہوئے صفحات

جلد اول: ص، ۱۱۷-۱۶......۲۶۲-۳۷۱

جلد دوم: ص، ۳۷۵-۱۹۹

جلد سوم: ص، ۴۳۱-۳۰۶

جلد پنجم: ص، ۱۸۸-۹......۴۰۷-۴۰۱......۴۸۵-۴۴۴

ڈاکٹر سیدہ جعفر کے لکھے ہوئے صفحات

جلد اول: ص، ۳۷۰-۱۱۸

جلد دوم: ص، ۱۹۸-۹......۵۲۷-۳۹۰

جلد وسوم: ص، ۴۶۷-۲۳۲

جلد چہارم: ص، ۳۰۵-۹

جلد پنجم: ص، ۴۰۰-۱۸۹ ۴۷

زیر مطالعہ کتاب کی پہلی جلد میں تین باب ہیں۔ پہلا باب ''اردو زبان کا آغاز وارتقا'' کے عنوان سے ہے جسے گیان چند جین نے لکھا ہے۔ یہ باب ۱۱۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں انہوں نے بڑی وضاحت کے ساتھ اردو زبان کے آغاز وارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے مستند ماہرین لسانیات کے نظریات وخیالات کا ذکر کیا ہے اور انہیں جانچا اور پرکھا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کھڑی بولی کو اردو کی بنیادی بولی مانتے ہیں اور اس بولی کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے واضح کرتے ہیں کہ اس اصطلاح کے حقیقی مفہوم پر اتفاق نہیں کیا جاتا۔ کیوں کہ یہ اصطلاح مختلف معنوں میں استعمال کی گئی ہے۔ (جلد اول، ص: ۲۸) پھر انہوں نے مختلف حوالوں اور شہادتوں سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کھڑی بولی کیا ہے اور تاریخی ادوار میں اس نے کیا شکل وصورت اختیار کی اور موجودہ دور تک کیسے پہنچی۔

اسی باب میں ''اردو کے مختلف نام اور آغاز کے نظریئے'' کے بارے میں مختلف ماہرین کی آرا کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے گیان چند جین اپنے نظریات پیش کرتے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اردو اور ہندی کھڑی بولی کے دو روپ ہیں اور لسانی نقطۂ نظر سے ان میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اردو کے آغاز کو دو منزلوں میں تلاش کرنا چاہیے، ایک کھڑی بولی کے آغاز کا زمانہ اور دوسرا کھڑی بولی کے اردو روپ دھارنے کا زمانہ۔ گیان چند جین کے مطابق اردو کا آغاز کھڑی بولی کا آغاز ہے اور یہ بولی گیارہویں

صدی عیسوی میں اس گمنام اپ بھرنش سے ابھری جو دلّی، میرٹھ اور مراد آباد وغیرہ کے علاقے میں بولی جاتی تھی، جو ممکن ہے کہ شورسینی سے مختلف ہو۔ اس کھڑی بولی میں عربی و فارسی الفاظ شامل ہونے سے اردو روپ متشکل ہوا۔ گیان چند جین اس ضمن میں یہ خیال بھی ظاہر کرتے ہیں کہ یہ عمل اول اول مدھیہ دیش یعنی دلّی اور مغربی یوپی میں ہوا ہوگا، لیکن چوں کہ اردو رسم الخط میں اس کے نمونے محفوظ نہیں۔ اردو ادب سب سے پہلے دکن میں ظاہر ہوتا ہے، شمالی ہند کے ابتدائی نمونے مشکوک ہیں۔ ۵ے باب کے آخر میں دکنی زبان کی خصوصیات اور دکنی گجری کے فرق کو بھی مولف نے واضح کیا ہے، اور اردو زبان کے آغاز ارتقا کی اس داستان کو ولی دکنی کے ذکر پر ختم کیا ہے۔

دوسرے باب کا عنوان ''دکن میں اردو کا تاریخی وتہذیبی پس منظر'' ہے۔ یہ باب سیدہ جعفر نے لکھا ہے اور اس میں بہمنی سلطنت، عادل شاہی سلطنت اور قطب شاہی سلطنت کے سیاسی و تاریخی پس منظر کا ذکر ہے۔ ۲۵۳ صفحوں پر مشتمل اس طویل باب میں بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کی تہذیبی، معاشرتی اور تمدنی تاریخ تفصیل سے بیان کی گئی ہے جس سے مولفہ کی تاریخ کے ہر پہلو سے گہری دلچسپی کا پتہ چلتا ہے، لیکن ایک تاریخ ادب میں سیاسی، سماجی، تہذیبی، تمدنی پس منظر پر مبنی اتنا طویل باب غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں کیا خوب ہوتا کہ سیدہ جعفر ۲۵۳ صفحوں کی ایک علاحدہ کتاب شائع کراتیں اور موجودہ تاریخ میں صرف ۲۰ یا ۲۵ صفحوں کے پس منظر پر قناعت کرلیتیں۔ ۶ے بہر حال اس طویل پس منظر سے جو فائدہ ہوتا ہے وہ یہ کہ دکنی ریاست کی تمام تر صورت حال سامنے آ جاتی ہے اور ساتھ ہی معلومات کا ایک وسیع خزانہ بھی میسر آتا ہے جو ادبی صورت حال کی تفہیم میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اس باب میں کچھ غلطیاں بھی موجود ہیں جن کی نشان دہی اور تصحیح ڈاکٹر ابرار عبدالسلام نے کی ہے۔ یوں تو انہوں نے اپنے طویل مقالے ''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک ...... تحقیق کے آئینے میں'' کی ہے۔ یوں تو ڈاکٹر ابرار عبدالسلام نے اس تاریخ کے پانچوں جلدوں کا بڑا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس میں انہوں نے زیر بحث کتاب میں موجود تحقیقی تضادات، غلط منصوبات، تحقیقی تسامحات اور سنین کے اغلاط کی نشان دہی اور تصحیح قدر تفصیل کے ساتھ کی ہے ان میں سے چند کا ذکر متن کے جائزے کے درمیان پیش کرنا مناسب ہوگا۔ مثلاً زیر بحث باب میں ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

''محمود گاواں کا مدرسہ ۸۷۷ھ/مطابق ۱۴۷۲ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔حسب ذیل قطعۂ تاریخ سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

ایں مدرسہ رفیع ومحمود نیا
تعمیر شدہ است بہ اہل صفا
آثار قبول بین کہ تاریخش
از آیت ابنا تقبل منّا

۸۷۷ھ (جلداول،ص:۱۵۶)

ڈاکٹر ابرار عبدالسلام مذکورہ قطعۂ تاریخ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آخری مصرع کے نیچے ۸۷۷ھ مرقوم ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پورا مصرع مادۂ تاریخ ہے اور اس سے ۸۷۷ھ برآمد ہوتے ہیں۔در اصل مادۂ تاریخ تین لفظ ہیں یہ قرآنی آیت ہیں جسے غلط نقل کیا گیا ہے۔آیت کا پہلا لفظ ''ابنا''نہیں بلکہ ''ربّنا'' ہے،کیوں کہ آخری تین الفاظ ''ابنا تقبّل منّا'' سے (۵۴+ ۵۳۲+ ۹۱)۶۷۷ھ برآمد ہوتے ہیں اس لیے یہ درست نہیں۔لفظ ابنا کے ۵۴ عدد کی بجائے صحیح لفظ ''ربّنا'' کے ۲۵۳/اعداد باقی دو الفاظ کے ساتھ ملانے سے ۸۷۶ھ برآمد ہوتے ہیں۔اس حساب سے مدرسے کا سال تعمیر ۸۷۷ھ نہیں بلکہ ۸۷۶ ھ ہے۔جیسا کہ مادۂ تاریخ سے ظاہر ہے۔۷۷؎ اس ضمن میں ابرار عبدالسلام ہارون خاں شیروانی کی تصنیف ''دکن کے بہمنی سلاطین'' کا ذکر کرتے ہیں اور یہ لکھتے ہیں کہ اس میں بھی یہی سال تعمیر درج ہے۔مزید ''برہان مآثر'' اور ''واقعات مملکت بیجاپور'' کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔اسی طرح اس باب میں ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

''محمد شاہ عادل نے ۱۰۶۸ھ میں رحلت کی۔محمد عادل شاہ کے بعد علی عادل شاہ ثانی تخت نشیں ہوا۔درباری شاعر عبدالنبی نے بقول سید نور اللہ مورخ تاریخ علی عادل شاہ ''نوبت شاہی زد بعد محمد علی'' سے اس کی تخت نشینی کی تاریخ نکالی تھی۔''۸۷؎

اس ضمن میں ڈاکٹر عبد السلام لکھتے ہیں کہ مذکورہ مادۂ تاریخ سے (۴۵۸+۳۱۶+۱۱+۷۶+۹۲+۱۱۰) ۱۰۶۳ھ مستخرج ہوتے ہیں۔ڈاکٹر سیدہ جعفر نے علی عادل شاہ

ثانی کی تخت نشینی کی تاریخ ۱۰۶۸ھ لکھی ہے۔ مادۂ تاریخ پر غور کرنے سے پانچ سال فرق بھی ختم ہو جاتا ہے۔ مادۂ میں موجود لفظ ''زد'' نہیں بلکہ ''زدہ'' ہونا چاہیے۔ اس کی تصدیق جلد سوم صفحہ ۳۹ سے بھی ہوتی ہے۔ مادۂ تاریخ میں ''ہ'' کے پانچ عدد شامل کرنے سے ۱۰۶۸ھ حاصل ہوتے ہیں، اور یہی تاریخ مطلوب ہے۔۷۹

جلد اول کا تیسرا اور آخری باب ''شمالی ہند میں اردو شاعری'' کے عنوان سے ہے۔ یہ باب ڈاکٹر گیان چند جین نے لکھا ہے۔ باب کے آغاز میں شمالی ہند کے ادبی پس منظر کا مختصر بیان ہے۔ اس کے بعد شمالی ہند کے قدیم شعرا کا تذکرہ ہے جس کا آغاز خواجہ مسعود سعد سلمان سے ہوتا ہے۔ گیان چند جین اس باب میں تقریباً سبھی قدیم مشاہیر سخن سے منسوب کلام کا جائزہ مختلف شہادتوں کی روشنی میں لے کر ان میں سے بعض انتساب کو رد کرتے ہیں اور بعض کو صحیح قرار دیتے ہیں، اور یہ کام واقعی بڑی دیدہ ریزی کا طالب ہے جسے گیان چند جین نے بخوبی انجام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً خواجہ فریدالدین مسعود شکر گنج سے منسوب کلام کا بغور جائزہ لے کر یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

> ''......ان میں بیشتر چیزیں الحاقی ہیں۔ یہ مجہول الاسم بیاضوں میں ملتی ہیں جو عہد شکر گنج سے صدیوں بعد کی لکھی گئی ہیں۔ جہاں اس کے شعری مرتبے کا تعلق ہے تو اس کی اہمیت اپنی قدامت کی وجہ سے ہے۔ ادبیت کے سبب نہیں۔ اسے بزرگوں کے باقیات الصالحات کے طور پر دیکھا جائے گا۔''۸۰

اسی طرح گیان چند جین نے امیر خسرؔو کے ہندوی کلام کا جائزہ لیا ہے اور مدلل بحثوں کے بعد امیر خسرؔو سے منسوب ہندوی کلام سے متعلق یہ نتیجہ پیش کیا ہے کہ:

> ''خسرؔو کے نام سے جو ہندی شاعری ملتی ہے تحقیق کے اصولوں پر اس کی کوئی سطر چوکھی نہیں اترتی۔ ہوسکتا ہے کہ ان میں سے کچھ حصہ ان کی تخلیق ہو لیکن اس کی زبان بہت کچھ اصلاح پا چکی ہے۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں ان کے حق میں فیصلہ کرنا ممکن نہیں۔ ان کی

جدید زبان ان کے جدید العصر ہونے کی بین دلیل ہے۔''[۸۱]

اس حصے میں امیر خسرؔو (ص:۳۸۵) شیخ عبد القدوس گنگوہی (ص:۴۳۵) یوسف زئی (ص:۴۴۶) وغیرہ کے دور حیات یا سنہ وفات مقرر کرتے وقت صرف ایک عیسوی سنہ دیا گیا ہے۔ جب کہ بعض محققین (جن میں خود گیان چند جین بھی شامل ہیں) کا کہنا ہے کہ اگر ہجری سنہ کے ساتھ تاریخوں میں مہینہ، تاریخ یا دن کا تعین نہیں کیا گیا تو پھر اس ہجری سنہ کے مطابقت سے دو عیسوی سنہ لکھنے چاہئیں۔

ڈاکٹر ابرار عبد السلام اس تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے سنین کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اس تاریخ کی ایک خامی یہ ہے کہ سنہ عیسوی اور سنہ ہجری کبھی ساتھ ساتھ اور کبھی آگے پیچھے چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ بہت سے مقامات پر سال ہجری اور سال عیسوی دونوں ایک ہی مقام پر دیکھنے میں آتے ہیں اور ان دونوں سنین میں اکثر عدم مطابقت پائی جاتی ہے۔ اور کچھ مقام ایسے آتے ہیں جہاں صرف ایک سنہ ہجری یا عیسوی دیا ہے۔ بعض ا وقات تو ایسا بھی ہوا ہے کہ مورخ نے آغاز میں صرف سنہ ہجری لکھا ہے لیکن چند سطروں بعد صرف سنہ عیسوی نقل کر دیا گیا ہے۔''[۸۲]

ڈاکٹر ابرار عبد السلام نے صرف پہلی جلد سے ۳۶ ایسی مثالیں پیش کی ہیں جن سے ان کی مذکورہ باتوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ سیدہ جعفر اور گیان چند جین کی تاریخ کی دوسری جلد چوتھے، پانچویں، چھٹے اور ساتویں باب پر مشتمل ہے۔ اس جلد کا چوتھا باب ''دکن میں اردو شاعری ۱۶۰۰ء'' سے متعلق ہے جسے سیدہ جعفر نے لکھا ہے۔ اس باب میں اٹھارہ شعرا کا تعارف و تذکرہ ہے۔ ابتدا میں سیاسی پس منظر اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ ادبی پس منظر بھی بیان کیا گیا ہے، جس میں مولفہ بہمنی سلطنت اور اس کے خاتمے کے بعد قائم ہونے والی ادبی تصانیف کی روایت کی تاریخ بھی مختصر اور جامع انداز میں بیان کرتی ہیں۔ اس کے بعد مشاہیر شعرا کا تذکرہ پیش کرتی ہیں۔ شاہ راجو قتال کے ذکر میں سیدہ جعفر مختلف حوالوں سے ان کی تاریخ وفات لکھتی ہیں، مگر اس ضمن میں کوئی حتمی تاریخ طے نہیں کرتیں۔ جمیل جالبی اپنی تاریخ میں شاہ راجو قتال کی تاریخ وفات ۷۳۶ھ/ ۱۳۳۵ء متعین کرتے ہیں۔[۸۳] بلکہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت اپنے مرتبہ ''شکار

نامہ'' کے مقدمے میں مختلف حوالوں سے شاہ راجو قتال کا سنہ وفات ۷۳۱ھ لکھتی ہیں اور گیان چند جین اسی سنہ وفات کو درست قرار دیتے ہیں۔۸۴؎ خواجہ بندہ نواز کے ذکر میں مولفہ ان کی تاریخ پیدائش و تاریخ وفات اقبال الدین احمد کے شعر کے حوالے سے پیش کرتی ہیں۔ وہ شعر یہ ہے۔

سنش عادل تولد وارث خود

۱۰۵ ۷۲۰

وفاتش وان کہ تاج المرسلین بود

۸۲۵ (جلد دوم، ص: ۴۵)

ڈاکٹر ابرار عبدالسلام اپنے جائزے میں مذکورہ شعر سے مستخرج کیے گئے اعداد کو درست نہیں مانتے اور وہ اس کی صحیح صورت حال یوں بیان کرتے ہیں:

> ''پہلے مصرعے میں ''سنش'' سے ۱۰۵، اعداد مستخرج کیے ہیں، جب کہ اس سے ۴۱۰ عدد برآمد ہوتے ہیں۔ ۱۰۵، اعداد لفظ ''عادل'' سے حاصل ہوتے ہیں پورے مصرعے میں کسی لفظ سے بھی ۷۲۰ عدد برآمد نہیں ہوتے۔ البتہ لفظ ''وارث'' سے ۷۰۷ عدد برآمد ہوتے ہیں۔ غلطی لفظ ''خود'' سے واقع ہوئی ہے۔ صحیح لفظ ''جود'' ہے جس سے ۱۳ عدد حاصل ہوتے ہیں۔ ''تذکرہ گیسو دراز'' میں اقبال الدین احمد اور ''واقعات مملکت بیجا پور'' میں بشیر الدین احمد نے لفظ ''جود'' ہی نقل کیا ہے۔''
>
> ......اقبال الدین احمد اور بشیر الدین احمد نے ''وارث جود'' سے ۷۲۰ عدد ہی برآمد کیے ہیں اور یہی مادۂ تاریخ ہے۔......۸۵؎

پانچواں باب ''گجرات میں اردو شاعری ۱۶۰۰ء تک'' کے عنوان سے ہے، یہ باب گیان چند جین نے لکھا ہے۔ باب کے آغاز میں مختصر سیاسی پس منظر بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد وہاں کے مشاہیر کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ قاضی محمود دریائی کے ذکر میں گیان چند جین ان کی تاریخ وفات متعین کرنے سے قبل یہ لکھتے ہیں کہ ان کی وفات تاریخ اور روایت میں بڑا اختلاف ہے۔ مجمع الاولیا، تحفۃ الکرام اور خزینۃ الا

صفیا میں ۹۲۰ھ کو تاریخ وفات قرار دیا ہے، پھر وہ خزینۃ الاصفیا سے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ نقل کرتے ہیں اور یہ لکھتے ہیں کہ ''شیخ ہدا'' سے ۹۲۰ھ برآمد ہوتے ہیں۔ان کا بیان کردہ قطعۂ تاریخ یہ ہے:

حضرتِ محمود شیخِ با کمال

سالکِ مشکل کشا محمود داں

شد چوزیں دنیا فانی در جہاں

سالِ وصلِ او بگو شیخِ ہدا ۸۶

اس ضمن میں ڈاکٹر عبدالسلام لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر گیان چند جین اگر ''خزینۃ الاصفیا'' سے براہ راست استفادہ کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ غلام سرور نے ''سالک مشکل کشا محمود'' (۱۱۱+۱۱۷+۹۸) سے بھی تاریخ نکالی ہے۔مزید یہ کہ تیسرا مصرع بے وزن ہے اور غلط نقل ہوا ہے۔ ابرار عبدالسلام کے مطابق صحیح متن ''شد چوں زیں دنیائے فانی در جناں'' ہے۔۸۷

جلد دوم کا چھٹا باب ''اردو نثر ۱۶۰۰ء تک'' کے عنوان سے ہے۔یہ باب بھی گیان چند جین نے تحریر کیا ہے۔ابتدا میں انہوں نے صوفیائے کرام کے ملفوظات کا جائزہ لیا ہے اور تحقیقی حقائق کی روشنی میں بہت سے ملفوظات کے انتسابات کو غلط قرار دیا ہے۔دوسرے حصے میں اردو کے قدیم رسالوں اور کتابوں کا جائزہ لیتے ہوئے اردو کی اولین تصانیف کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس سلسلے میں شروع میں ہندی نثر کا مختصر ذکر تقابلی جائزے کے لیے کرتے ہیں ،اور سید اشرف جہاں گیر سمنانی کی تالیف کردہ کتاب سے تذکرہ شروع کرتے ہیں اور پیر روشاں کی ''خیرالبیان'' تک پہنچتے ہیں۔مصنف اس دور کی سبھی معروف کتابوں کا جائزہ لے کر ان کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں اور پیر روشاں بایزید انصاری کی تصنیف ''خیر البیان'' کو اردو کی پہلی مستند با قاعدہ تصنیف کا درجہ عطا کرتے ہیں۔(جلد دوم،ص:۳۲۵)اس کتاب سے متعلق تمام معلومات گیان چند جین نے جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اردو'' جلد اول کے حوالے سے پیش کی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے خود اس تصنیف کو نہیں دیکھا۔علاوہ ازیں اس باب میں ''شاہ میراں جی شمس العشاق'' کا تفصیلی ذکر ہے جس میں مصنف میراں جی شمس العشاق کے پیر و مرشد کمال الدین بیابانی کی تاریخ وفات کا مادہ ''کمال اسکا ملیں عزلت گزیں'' (۸۶۷ھ) نقل کرتے ہیں۔

(جلد دوم،ص:۳۴۳)ڈاکٹر ابرار عبدالسلام کے مطابق تاریخ وفات کا مادہ ۸۶۷ھ بھی غلط ہے اور اس سے مستخرج اعداد بھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''کمال اسکا ملیں عزلت گزیں' سے (۹۱ +۲۱۲ +۵۰۷ +۸۷) ۸۹۷ھ مستخرج ہوتے ہیں۔ صحیح مادۂ تاریخ ڈاکٹر حسینی شاہد نے نقل کیا ہے۔ مادۂ تاریخ یہ ہے ''کمال الکاملین عزلت گزیں'' اس سے (۹۱+۱۸۲+۵۰۷+۸۷) ۸۶۷ھ برآمد ہوتے ہیں۔''۸۸

ساتویں باب کا عنوان ہے ''بیجاپور اور بیدر میں اردو شاعری سترہویں صدی میں''۔ اسے ڈاکٹر سیدہ جعفر نے لکھا ہے۔ یہ باب دو حصوں میں منقسم ہے۔ اس کا پہلا حصہ جلد دوم کے آخر میں ہے اور دوسرا حصہ جلد سوم کے آغاز میں ہے کہ اس تقسیم کی وجہ بقول افشاں زوار نا قابل فہم ہے۔ بہ ظاہر ایسا لگتا ہے کہ ہر جلد کے لیے تقریباً ساڑھے چار سو صفحات کی حد بندی کی گئی ہے اور یہ باب اس حد بندی کی وجہ سے دو جلدوں میں منقسم ہوا ہے۔۸۹ باب کے ابتدا میں سیاسی، تہذیبی اور ادبی پس منظر بیان کیا گیا ہے جس سے بیجاپور اور بیدر کی تہذیبی اور ادبی ماحول کی بھر پور عکاسی ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہاں کے اہم شعرا مثلاً عبدل، مقیمی، صنعتی، ملک خوشنود، رستمی وغیرہ کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ نصرتی کے ذکر میں ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں:

''شمس اللہ قادری نے نصرتی کی ایک مثنوی 'گلدستۂ عشق' کا ذکر کیا ہے...... چارلس اسٹوارٹ نے ٹیپو سلطان کے کتب خانے کی وضاحتی فہرست میں نصرتی کے دو شعری کارناموں کا ذکر کیا ہے جو 'گلشن عشق' اور 'گلدستۂ عشق' ہیں۔ موخر الذکر کے بارے میں وہ رقم طراز ہے کہ اس کا نام 'نوز یگے آف لو'(Nosegay of love) ہے۔''۹۰

اس ضمن میں پوری وضاحت ڈاکٹر گیان چند جین اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ چارلس اسٹوارٹ کی نادر فہرست عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے جہاں میں نے اسے دیکھا ہے۔ اگر سیدہ جعفر دیکھ لیتیں تو کئی غلط فہمیوں سے محفوظ رہتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فہرست کے مطابق وہاں نصرتی کی دو مثنویاں ''علی نامہ'' اور ''گلشن عشق'' تھیں۔ گلشن عشق کے ساتھ عشقیہ نظموں

کی ایک کتاب ''گلدستۂ عشق'' مجلد تھی۔ اسٹوارٹ نے یہ نہیں لکھا کہ یہ بھی نصرتی کی تصنیف تھی۔ دوسروں نے اسے نصرتی کی غزلیات کا مجموعہ کہہ دیا۔ اب اس کتاب سے متعلق کوئی معلومات نہیں ہے۔ ۹۱

آٹھواں باب ''گولکنڈہ میں اردو شاعری سترہویں صدی میں'' کے عنوان سے ہے۔ یہ باب بھی سیدہ جعفر کا تحریر کردہ ہے اور ماقبل باب کی طرح دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک حصہ جلد سوم میں ہے جس میں شیخ احمد گجراتی، قلی قطب شاہ، وجہی، قطبی وغیرہ کا ذکر ہے اور دوسرا حصہ جلد چہارم میں ہے۔ اس حصے میں احمد جنیدی، ابن نشاطی، سید بلاقی، داؤد، ضعیفی، ابوالحسن تانا شاہ وغیرہ کا ذکر موجود ہے۔ باب کے ابتدا میں حسب روایت سیاسی، تہذیبی اور ادبی پس منظر بیان کیا گیا ہے جس میں دکنی شعرا کے ادبی تصورات و خیالات کی وضاحت تفصیل سے کی گئی ہے۔ مولفہ کے مطابق دکنی شعرا نے اپنی منظومات میں جن ادبی تصورات کا اظہار کیا ہے ان کا تجزیہ کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کے ذہن میں شعر گوئی اور شعر فہمی کا ایک خاص تصور ضرور موجود تھا، وہ نقاد کے لیے سخن فہم، سخن داں اور عارف جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور اس سے اپنے کلام کی داد اس لیے چاہتے ہیں کہ وہی شعری محاسن اور فنی خوبیوں سے آشنا ہے۔

مذکورہ بالا باب کے شعرا کے حالات زندگی اور پیدائش و وفات کے سنین بالعموم درج نہیں کیے گئے ہیں، اس کا سبب ڈاکٹر سیدہ جعفر یہ بتاتی ہیں کہ تذکروں میں ان کے حالات نہیں ملتے۔ البتہ ان شعرا کی فنی خصوصیات اور ان کی تخلیقات کے تاریخی اور تنقیدی جائزے بڑے بھرپور انداز میں ملتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ ان جائزوں میں دیگر محققین اور ناقدین کی معلومات سے فائدہ اٹھاتی ہیں اور ان کا تنقیدی تجزیہ کرتے ہوئے درست معلومات سامنے لانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس حصے میں موجود اغلاط اور تحقیقی تسامحات کی نشان دہی اور تصحیح ڈاکٹر ابرار عبدالسلام نے کی ہے ان میں سے چند کا ذکر حسب ذیل ہے۔ مثلاً

ڈاکٹر سیدہ جعفر کے مطابق محمد قطب شاہ کا زمانہ حکومت چودہ سال رہا۔ (جلد سوم، ص: ۳۷۹) ڈاکٹر ابرار عبدالسلام لکھتے ہیں کہ محمد قطب شاہ ۱۷ ذیقعدہ ۱۰۲۰ھ کو تخت نشیں ہوا، اور ۱۳ جمادی الاوّل ۱۰۳۵ھ کو فوت ہوا۔ اس حساب سے اس کا زمانہ حکومت چودہ سال، پانچ ماہ اور ستائیس دن بنتا ہے۔ ۹۲
اسی طرح ڈاکٹر سیدہ جعفر لکھتی ہیں کہ ڈاکٹر زور اور سخاوت مرزا غواصی کو سید شاہ ابوالحسن حیدر ثانی کا مرید بتاتے ہیں جو حیدرآباد کے محلّہ حسینی علم میں سکونت پذیر تھے، اور ۱۰۹۸ھ میں وفات پائی تھی۔

(جلد سوم، ص:۳۸۸)اس ضمن میں ڈاکٹر ابرار عبدالسلام ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' کے حوالے سے صحیح نام سید شاہ ابوالحسن علی حیدر ثانی بتاتے ہیں اور یہ لکھتے ہیں کہ سخاوت مرزا کا بیان تو فی الوقت پیش نظر نہیں لیکن ڈاکٹر زور نے ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' میں شاہ ابوالحسن کی مذکورہ تاریخ وفات نہیں لکھی جو ڈاکٹر صاحبہ نے بیان کی ہے۔انہوں نے تاریخ وفات ۱۰۹۹ھ لکھی ہے۔محمد قطب شاہ کا سنہ وفات ڈاکٹر سیدہ جعفر ۱۰رجب ۱۰۳۵ھ/ ۱۶۲۵ء متعین کرتی ہیں۔(جلد سوم، ص: ۴۰۲)ابرار عبدالسلام کے مطابق ۱۰ رجب ۱۰۳۵ھ/ ۱۶۲۶ء کے مطابق ہے۔حالاں کہ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے خود اسی تیسری جلد میں (ص:۳۷۹) محمد قطب شاہ کی تاریخ وفات ۱۳ جمال دی الاوّل ۱۰۳۵ھ/ ۱۶۲۶ء متعین کر چکی ہیں اور اسی تاریخ وفات کو ڈاکٹر ابرار عبدالسلام صحیح قرار دیتے ہیں اور یہ لکھتے ہیں کہ اس کی تصدیق ''کلام الملوک'' اور ''مآثر دکن'' سے بھی ہوتی ہے۔۹۳

نواں باب ''گجرات میں اردو شاعری سترہویں صدی'' کے عنوان سے ہے جسے سیدہ جعفر نے لکھا ہے۔اس باب میں ۱۲ شعرا کا تذکرہ ملتا ہے، جن میں وجیہ الدین گجراتی، امین، سید ہاشم حسینی، محمد امین گجراتی، شیخ محمد اشرف گجراتی اور ولی وغیرہ شامل ہیں۔ابتدا میں سیاسی، تہذیبی اور ادبی پس منظر بیان کرنے کے بعد شعرا کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔اس باب میں بھی بالعموم شعرا کے سنہ ولادت و وفات نہیں ملتے۔صرف ولی گجراتی کے سنہ ولادت و وفات کا ذکر ہے، مگر اس ذکر میں بھی کوئی حتمی سنہ متعین نہیں کیا گیا۔اسی طرح ولی کے گجراتی الاصل ہونے کے بارے میں دیگر بہت سے محققین کی آرا تو پیش کی گئی ہیں، مگر یہاں بھی وہ اپنی حتمی رائے نہیں دیتیں۔اسی طرح ''سید محمود اور سید محمد علی عاجزؔ'' کے عنوان کے ضمن میں سیدہ جعفر اس شاعر کے نام اور اس کی مثنوی ''قصہ فیروز شاہ'' یا ''قصہ ملکہ مصر'' کے ناموں کے حوالے سے بحث کرتی ہیں، مگر یہ بحث بھی اپنے انجام تک نہیں پہنچتی۔اس ضمن میں ڈاکٹر گیان چند جین اپنی کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں لکھتے ہیں کہ یہ معاملہ اتنا الجھاؤ ہے کہ سیدہ جعفر کی مفصل تحریر پڑھنے کا حوصلہ نہیں ہوتا، وہ خود اس مسئلے کو کافی الجھا ہوا مانتی ہیں۔

دسواں باب ''اردو نثر سترہویں صدی میں'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں ملا وجہی، سب رس اور داستان امیر حمزہ کے دو دکنی نسخوں پر گیان چند جین نے لکھا ہے اور یہ وضاحت انہوں نے خود اپنی

کتاب ''اردو کی ادبی تاریخیں'' میں کی ہے۔ بقیہ باب سیدہ جعفر نے لکھا ہے۔ ابتدا میں مولفہ نے بڑی محنت اور تفصیل کے ساتھ صوفیا کے ملفوظات سے عابد شاہ کی نثر تک کا مختصر تعارف پیش کیا ہے۔ بعد ازاں ملا وجہی اور سب رس پر گیان چند جین نے روشنی ڈالی ہے، اور سب رس کے ماخذ کے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔ میراں جی خدانما کے ذکر میں ڈاکٹر سیدہ جعفر ان کے سنہ وفات کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''تذکرہ اولیائے دکن''، ''اردوئے قدیم'' اور بعض دوسری تصانیف میں میراں جی کا سنہ وفات ۱۰۷۰ھ/ ۱۶۵۹ء بتایا گیا ہے۔ ۹۴

ڈاکٹر ابرار عبدالسلام اپنے مقالے میں مذکورہ اقتباس نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

> ''فی الوقت 'تذکرہ اولیائے دکن' پیش نظر نہیں لیکن 'اردوئے قدیم' میں سنہ وفات وہ درج نہیں ہوئی ہے جو بتائی گئی ہے۔ 'اردوئے قدیم' ص: ۸۱ میں میراں جی کی تاریخ وفات ۲۵ شوّال ۹۰۲ھ لکھی گئی ہے۔ البتہ 'گلزار آصفیہ'' میں ۱۸ جمادی الاوّل ۱۰۷۰ھ مرقوم ہے جو ۱۶۵۹ء کے مطابق نہیں بلکہ ۱۶۶۰ء کے مطابق ہے۔'' ۹۵

جلد پنجم کا آغاز گیارہویں باب سے ہوتا ہے جس کا عنوان ''قدیم اردو کی اہم ادبی اصناف و موضوعات'' ہے۔ یہ باب ڈاکٹر گیان چند جین اور ڈاکٹر سیدہ جعفر کی مشترکہ کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ابتدا میں عربی و فارسی اصناف کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے، اس کے بعد ہندی اصناف کا تذکرہ ہے جس میں دوہے اور اشلوک کا تعارف اور مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ پھر غنائی اصناف کا تذکرہ کیا گیا ہے جس میں دھرپد، خیال، فکری، حقیقت، سہیلا وغیرہ شامل ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس دور کی مقبول عام نظمیں شادی نامہ، چکی نامہ، چرخہ نامہ، مولود نامہ وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ اس باب میں بیان کیا گیا مذکورہ حصہ گیان چند جین نے لکھا ہے۔ سترہویں صدی تک کی کلاسیکی اصناف مثلاً مثنوی، غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی کا مختصر تعارف سیدہ جعفر نے پیش کیا ہے۔ آخر میں قدیم نثری اصناف مثلاً ملفوظہ، صوفی، قول، نثری مقالے، رسالہ، نثری قصوں کا تعارف ڈاکٹر گیان چند جین نے پیش کیا ہے۔ نثری مقالے کے ضمن میں گیان چند جین کسی نتیجے پر نہیں پہنچتے جس سے یہ واضح نہیں ہو پاتا کہ ''نثری مقالے'' کسے کہتے ہیں۔

اس آخری باب کے بعد ۳۶ صفحوں پر مشتمل کتابیات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اردو، ہندی، فارسی، مراٹھی اور انگریزی مخطوطات رسالوں اور کتابوں کی اس طویل فہرست پر صرف سیدہ جعفر کا نام لکھا ہوا ملتا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صرف سیدہ جعفر کی کتابیات ہیں ڈاکٹر گیان چند جین کی نہیں۔ خود ڈاکٹر گیان چند جین اپنی کتاب ''اردو ادبی تاریخیں'' میں اس مسئلے سے متعلق لکھتے ہیں کہ میں نے اپنی کتابیات علاحدہ بنا کر بھیجی تھی، جب کہ سیدہ جعفر کی کتابیات الگ تھیں۔ معلوم نہیں موجودہ کتابیات دونوں کو مدغم کر کے بنائی گئی ہیں یا اس میں صرف سید جعفر کی کتابیں ہیں۔ ۹۶ اس کتاب میں اشاریہ بھی نہیں دیا گیا ہے جو کہ دینا چاہیے تھا۔ بہر حال اس کتابیات سے اتنا یو پتا چلتا ہے کہ مولفین نے اپنی تاریخ ادب کو وقیع اور مستند بنانے کے لیے کس قدر کی محنتیں ہیں۔ ڈاکٹر ابرار عبدالسلام اس تاریخ میں درج حوالوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اردو ادب کی یہ تاریخ حوالوں کا ایک ایسا مہیب جنگل ہے جس کا سحر قاری پر سوائے مرعوبیت کے کوئی اور تاثر ڈالتا نظر نہیں آتا۔ اس تاریخ میں موجود بے شمار تحقیقی تسامحات، تضادات، متنی اور تاریخی اغلاط کے علاوہ اور بھی بہت کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔...... حیرانی اس بات پر ہوتی ہے کہ کسی بھی محقق نے اس کام کے معیار کو تحقیقی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھنے اور تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش نہیں کی۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اردو کی ادبی تاریخوں کا تحقیقی جائزہ لیتے ہوئے اس تاریخ کو بھی تحقیقی حوالے سے پرکھا ہے، لیکن اس انداز سے کہ سب اچھا ہے اور جو کمی ہے وہ ان کی شریک مصنفہ کی ہو سکتی ہے۔'' ۹۷

کتابیات کے بعد وہ گم شدہ تیرہواں باب جس کی وضاحت زیر بحث کتاب کے ابتدا میں کی گئی ہے، ضمیمہ کے طور موجود ہے۔ اس کا عنوان ''قدیم اردو میں ہندی اور فارسی کی آویزش'' ہے۔ ابتدا میں اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقا کی مختصر کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد دسویں صدی ہجری سے لے کر سترہویں صدی تک کے زبان و ادب کا جائزہ لیا گیا ہے اور مثالوں سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ ابتدا میں

ہندی رنگ بہت غالب تھا، مگر آہستہ آہستہ عربی فارسی الفاظ اور فارسی رسم الخط نے اردو زبان وادب کو ایک واضح شکل وصورت عطا کی۔ اس بحث کے آخر میں ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

''...... یہ یقینی ہے کہ ہندی اور دکنی روایات کو ہٹا کر ان کی جگہ فارسی روایات سے استفادہ اردو ادب کے حق میں مفید ہوا۔ ہم یہاں بے جا فارسیت کی وکالت نہیں کر رہے، لیکن اعتدال کے ساتھ فارسی روایات نے اردو کو اردو پن دیا اور ملک کو ایک شستہ شیریں زبان وادب۔''۹۸

اس تاریخ میں جو سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر دیا گیا ہے، وہ یقیناً بہت مفید اور اہم ہے۔ حالاں کہ کہیں کہیں یہ پس منظر بہت طویل ہو جاتا ہے۔ مگر اس سے اس دور کے ماحول بالخصوص دکنی ماحول اور ادب کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر سیدہ جعفر جہاں ادبی پس منظر بیان کرتی ہیں وہیں ادبی روایات کا ذکر بھی تفصیل سے کرتی ہیں جس سے سارا ادبی ماحول سامنے آجاتا ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحبہ کا اسلوب بھی منطقی اور سلجھا ہوا ہے۔ وہ اپنی بات بہت ہی سادہ اور دل نشیں انداز میں پیش کرتی ہیں جس سے قاری کو ان کی بات سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آتی۔ وہ تاریخی مغالطّوں کو ٹھوس دلائل کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کرتی ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں تحقیق کا ذوق بھی اور شوق بھی، اور یہی ذوق وشوق کتاب کی اہمیت افادیت کے اضافے کا باعث بنتی ہے۔

اردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک - ڈاکٹر تبسم کاشمیری

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی یہ کتاب ''اردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک'' پہلی مرتبہ ۲۰۰۳ء میں سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کا پہلا ہندوستانی ایڈیشن ۲۰۰۶ء میں ایم. آر پبلی کیشنز، نئی دہلی سے شائع ہوا۔ تین سال کے وقفے کے بعد ۲۰۰۹ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن ایم. آر پبلی کیشنز سے ہی شائع ہوا۔ راقم کے پیش نظر یہی تیسرا ایڈیشن ہے۔ یہ کتاب ۸۹۲ صفحات اور ۱۹/ ابواب پر مشتمل ہے جو تقریباً ساڑھے آٹھ سو سالہ ادوار کو محیط ہے۔ ابتدا میں پیش لفظ ہے جس میں اردو زبان وادب کی تاریخ پر روشنی ڈالی

گئی ہے۔ نیز بیسویں صدی میں تاریخ نگاری میں جو تبدیلیاں رونماں ہوئی ہیں اس بابت بھی اہم گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف بیسویں صدی کو زبان وادب کی تاریخ نگاری کے لحاظ سے اہم قرار دیتے ہوئے یہ لکھتے ہیں:

> ''بیسویں صدی میں تاریخ کے تصورات میں انقلابی تبدیلیاں فرانس کے ''انلس دبستان'' (Annales School) سے شروع ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فرانس کے انلس دبستان کے مورخین نے تاریخ کو اس کے محدود کلاسیکی تصور سے رہائی دلوائی اور اسے ایک وسیع تر علمی معنویت عطا کی۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۸۹ء تک اس دبستان کی سرگرمیوں نے تاریخ کو ایک نئے رنگ وروپ سے سنوارا۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں تاریخ کے اس حوالے سے ادبی تاریخ بھی غور وفکر کی مستحق ہے۔'' ۹۹

مصنف نے پیش لفظ میں ادبی تاریخ کی اہمیت وافادیت کے ساتھ ساتھ مورخ کی ذمہ داریوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ نیز ادبی تاریخ کو محدود تناظر میں دیکھنے کے بجائے وسیع تناظر میں دیکھنے کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ ادبی مورخ کی نظر محض ادبی تاریخ پر ہی نہیں ہونی چاہیے بلکہ اسے ادبی تاریخ کو تحریر کرتے وقت ان تمام عوام وعناصر سے واقف ہونا چاہیے جس سے کہ ادبی تاریخ تشکیل پاتی ہے۔ اس بابت وہ لکھتے ہیں:

> ''دور حاضر میں ادبی تاریخ کو ایک وسیع زمانی تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اسے محض ادب کے محدود شعبہ سے بہر حال آزاد ہونا چاہیے اس لیے ادبی تاریخ کے مورخ کی بصیرت سیاسی، سماجی یا واقعاتی تاریخ کے مورخ سے زیادہ ہونی چاہیے۔ سماجیات کا مورخ اپنے محدود دائرۂ کار میں سمٹتا ہوا تاریخ کا سفر کرتا ہے، جب کہ ادبی مورخ تاریخ کے تمام دھاروں اور شعبوں پر بیک وقت نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔'' ۱۰۰

کتاب کا باب اوّل ''زبان کا ابتدائیہ ۱۰۰۰ء کے آس پاس لسانی صورت حال، پنجاب اور زبان کے ابتدائی نقش کا نظریہ'' وغیرہ سے متعلق ہے۔اس باب میں صاحب کتاب نے زبان کے لسانی تشکیل کا مرحلہ وار بیان کیا ہے،اور اپنے پیش رو مورخین کے افکار ونظریات کو پیش کرنے کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے خیالات وافکار بھی پیش کیے ہیں۔انہوں نے محمد تغلق کے تبدیلیِ آبادی کو اردو زبان کی لسانی تشکیل کے لیے بہتر قرار دیا ہے۔نیز انہوں نے اس دور کی سیاسی ،سماجی ،تاریخی اور تہذیبی صورت حال کو پیش کیا ہے۔علاوہ ازیں انہوں نے شمالی ہند اور دکن کے باشندوں کے میل ملاپ سے زبان میں جو ترقی ہوئی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> ''محمد تغلق کے اس فیصلے سے دلّی کی تہذیب وثقافت کے ساتھ ساتھ اردو زبان اپنی ابتدائی صورت میں دکن جا پہنچی تھی۔اردو کے حوالے سے نقل لسان کا بہت بڑا عمل تھا۔شمالی ہند سے پہلی بار آبادی کا اتنا بڑا حصہ جنوبی ہند میں منتقل ہوا تھا۔دکن کی سرزمین پر شمالی ہند کی زبان بولنے والی آبادی کی آبادکاری سے ایک نیا لسانی عمل شروع ہوا۔آہستہ آہستہ سماجی عمل بڑھنے سے دکن کی زبانوں سے 'زبان دہلوی' کا میل ملاپ ہوا،اور مقامی بولیوں اور زبانوں کے اشتراک سے زبان دہلوی ایک نئی شکل اختیار کرنے لگی اور یہی شکل بعد ازاں 'دکنی' کہلائی جو 'قدیم اردو' کی ابتدائی شکل ہے۔''۱۰۱

دوسرا باب ''شمالی ہند میں ابتدائی زبان وادب کا جائزہ......'' کے عنوان سے ہے۔اس میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے شمالی ہند کے چھ قدیم شعرا وادبا کی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔جس میں مسعود سعد سلمان لاہوری، بابا فرید شکر گنج ،امیر خسروؔ، کبیر، حضرت نوشہ گنج بخش اور افضل کا نام شامل ہے۔اس حصے میں مصنف نے بابا فرید کے ضمنی عنوان کے تحت (۱۲۶۶ء-۱۱۷۳ء) جو سنہ تحریر کیا ہے وہ اس تحریر سے جو انہوں نے 'بابا فرید' کی پیدائش سے متعلق لکھا ہے میل نہیں کھاتا۔عموماً شعرا وادبا کے نام کے ساتھ ان کی تاریخ پیدائش اور وفات ہی تحریر کیا جاتا ہے،لیکن مصنف نے نیچے لکھا ہے کہ ''آپ کی تاریخ پیدائش

۱۱۸۸ء-۵۸۴ھ ہے۔''(ص:۳۲) یہ تضاد سمجھ سے بالا تر ہے۔اب ان دونوں تاریخوں کا مطلب و مفہوم کیا ہے۔کیا عنوان کے نیچے دی گئی تاریخ اس دور کو ظاہر کرتی ہے جس دور کا تجزیہ کیا گیا ہے۔یا اسے بابا فرید کا عرصۂ حیات سمجھا جائے اس سے متعلق کوئی وضاحت نہیں کی۔ڈاکٹر گیان چند جین اپنی کتاب ''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک'' کی جلد اول میں بابا فرید شکر گنج کا زمانۂ حیات ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء تا ۶۶۴ھ/ ۱۵۶۵ء متعین کرتے ہیں۔۱۰۲؎ امیر خسرؔو کے ذکر میں مصنف نے چند صفحوں میں اچھی خاصی معلومات فراہم کی ہیں،اور اس عہد کی تہذیبی وسماجی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔مصنف نے کبیؔر کی تاریخ پیدائش ۱۴۷۰ء-۱۴۴۰ء درج کی ہے۔(ص:۳۸) جب کہ گیان چند جین نے ڈاکٹر رام کمار ورما کے حوالے سے اپنی تاریخ ادب کے جلد اول میں کبیؔر کا عرصۂ حیات ۱۳۹۸ء تا ۱۵۱۸ء لکھتے ہیں۔۱۰۳؎ نوشہ گنج بخش کے ذکر میں ان کی مثنوی ''گنج الاسرار'' کا تعارف پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> ''......گنج الاسرار جسے ابتدا میں دریافت کیا گیا تھا اور اردو کی ادبی تاریخ میں ایک نئی کڑی قرار دیا گیا تھا اب شکوک وشبہات کے دھندلکوں میں سوالیہ نشان کے طور پر نظر آرہی ہے۔''۱۰۴؎

افضل پانی پتی سے متعلق مصنف اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے اختلافی حیثیت کا ذکر کرتے ہیں اور اس ضمن میں دیگر ناقدین کی آرا بھی پیش کرتے ہیں۔علاوہ ازیں والہ داغستانی کے ذریعے پیش کیے گئے افضل کے حالات سے اتفاق کرتے ہیں،لیکن یہ اتفاق کس بنیاد پر قائم ہوا ہے اس بارے میں کوئی وضاحت نہیں کرتے۔افضل کی تصنیف ''بکٹ کہانی'' کا فنی نقطۂ نظر سے بھر پور جائزہ لیا گیا ہے جس سے مصنف کی تنقیدی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔مگر ساتھ ہی یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے دیگر مورخین کی کتابوں کا مطالعہ سرسری طور پر کیا ہے،جس کی وجہ سے اس باب میں اکثر مقامات پر تضاد پایا جاتا ہے۔

تیسرا باب ''گجری ادب: گجرات'' سے متعلق ہے،جس میں ۱۴۰۷ء سے ۱۵۷۲ء تک کے گجری ادب کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اس باب میں مصنف نے گجری دور کے اہم شعرا مثلاً شاہ بہاء الدین باجنؔ،قاضی محمود دریائی،شاہ علی محمد جیوگام دھنی،خوب محمد چشتی کے حوالے سے گفتگو کی ہے،اوران شعرا کی شاعرانہ خوبیوں کو اجاگر کیا ہے،ساتھ ہی گجری ادب پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے،جس سے بطور مورخ اور

نقاد کے ان کی حیثیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔چوتھا باب 'بہمنی دور کا ادب'' سے متعلق ہے،جس میں ۱۳۴۷ء سے ۱۵۲۶ء یعنی پونے دوسوسالہ بہمنی ادب کا تاریخی جائزہ پیش کیا گیا ہے،ساتھ ہی بہمنی ادب کے آغاز وارتقا پر بھی بہتر انداز میں روشنی ڈالی ہے۔اس باب کے آغاز میں بہمنی دور کی سیاسی وسماجی تاریخ پیش کرنے کے بعد مصنف اس دور کے قابل ذکر شعرا مثلاً نظامی،خواجہ بندہ نواز گیسو دراز،لطفی،میراں جی شمس العشاق،اشرف بیابانی وغیرہ کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے ان شعرا کے فکر وفن پر بہتر انداز میں اظہار خیال کیا ہے، نیز ان کی اہم تصانیف کا ادبی وفنی نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہوئے ان میں پائی جانے والی اہم خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔میراں جی شمس العشاق کے تذکرے میں ایک چیز کھٹکتی ہے وہ یہ کہ ان کے نام کے ساتھ لکھا گیا سنہ ۱۴۹۸ء-۱۴۰۷ء ہے۔اس طرح سنین اکثر شعرا وادبا کے نام کے ساتھ درج کیے گئے ہیں،جس سے یہ واضح نہیں ہو پاتا کہ یہ سنین ان شعرا وادبا کا تاریخ پیدائش ووفات ہے یا ان کا ادبی دور۔اس ضمن میں مصنف نے بھی کوئی وضاحت نہیں کی ہے۔

پانچواں باب ''بیجا پور کا ادب'' کے حوالے سے ہے۔اس باب میں عادل شاہی عہد کے معتبر ادبا و شعرا مثلاً برہان الدین جانم،عبدل،مقیمی،صنعتی،امین الدین علی اعلیٰ،حسن شوقی،نصرتی وغیرہ کے حالات زندگی اوران کی فکری وفنی جہات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔بعض شعرا کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری مثنوی ''چندر بدن ومہیار'' کے شاعر مقیمی کے ذکر میں اس کا سنہ ولادت ۱۶۰۶ء-۱۶۰۱ء کے درمیان اور سنہ وفات ۱۶۷۰ء-۱۶۱۵ء کے درمیان متعین کرتے ہیں۔جب کہ گیان چند جین وسیدہ جعفر کی مولفہ کتاب ''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک'' کی جلد دوم کے ساتویں باب میں سیدہ جعفر نے بیجا پور ہی کے ایک دوسرے شاعر ''مرزا مقیم'' کا سنہ ولادت وہی لکھا ہے جو مقیمی کا سنہ ولادت ڈاکٹر تبسم نے لکھا ہے۔قدیم دکنی ادب کے شعرا وادبا کے سنین پیدائش ووفات کے تحریر کرنے میں ایسی خامیاں درآتی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر مورخین مرزا مقیم اور مقیمی دونوں کو ایک ہی شخص تصور کر لیتے ہیں جس کی بنیاد پر ان سے یہ غلطیاں ہو جاتی ہیں۔جمیل جالبی نے اپنی تاریخ میں مرزا مقیم اور مقیمی کے حوالے سے بڑی تفصیلی بحث کی ہے اور واضح کیا ہے کہ مرزا مقیم اور مقیمی دو الگ الگ شخصیت ہے۔وہ اس بابت لکھتے ہیں:

''مرزا مقیم اور مقیمی دو الگ الگ شخص ہیں۔اولذکر بیجا پور میں سلطان محمد

عادل شاہ کے دربار سے وابستہ تھا اور فارسی کا خوش گو شاعر تھا، جس نے 'قلعہ ابکھیری' کے فتح کے موقع پر 'فتح نامہ بکھیری' مرتب کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اور مقیمی 'چندر بدن مہیار' کا مصنف ہے جس نے کم از کم ایک فارسی مثنوی ضرور لکھی ہے اور دونوں مثنویوں میں اپنا تخلص مقیمی ہی استعمال کیا ہے۔ مقیمی کسی بادشاہ کا متوسل نہیں تھا۔ چندر بدن و مہیار میں کسی بادشاہ کی مدح میں کوئی شعر نہیں ملتا۔'' ۱۰۵

ڈاکٹر سیدہ جعفر کا بھی اس ضمن میں یہی خیال ہے۔ چنانچہ وہ لکھتی ہیں:

''مرزا مقیم اور مقیمی دو مختلف شخصیتیں ہیں۔ مقیم ایرانی نژاد شاعر تھا اور فارسی میں طبع آزمائی کرتا تھا۔'' ۱۰۶

کتاب میں متعین کیا گیا مقیمی کا سنہ ولادت (۱۶۰۶ء-۱۶۰۱ء) دراصل مرزا مقیم کا ہے، کیوں کہ سیدہ جعفر کی طرح جمیل جالبی نے بھی مذکورہ سنہ ولادت مرزا مقیم کا بتاتے ہیں۔ اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر تبسم نے مقیمی کا جو سنہ ولادت و وفات تحریر کیا ہے وہ درست نہیں۔ بہر حال اس باب میں مصنف نے سیاسی، تہذیبی اور لسانی حوالے سے اہم گفتگو کی ہے جس کے مطالعے سے اس عہد کا ادبی پس منظر واضح طور پر سامنے آ جاتا ہے۔

چھٹا باب ''گولکنڈہ کا ادب: قطب شاہی دور ۱۶۸۷ء-۱۵۱۸ء'' کے حوالے سے ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے قطب شاہی دور کے ادبی و سیاسی حالات و واقعات کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے اس حصے میں ۱۷۰ سالہ دور کو اس خوب صورت انداز سے بیان کیا ہے کہ اس عہد کی پوری ادبی تاریخ کا منظر قاری کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس باب میں فیروز، ملا خیالی اور محمود کے ابتدائی دور کے حالات کو بھی موثر پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ محمد قلی قطب کی شاہ کی ادبی زندگی کا بھرپور جائزہ ملتا ہے جس سے ان کی ادبی زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس باب میں ایک ذیلی عنوان ''گولکنڈہ کا بزم آخر'' کے نام سے قائم کیا گیا ہے، جس میں ڈاکٹر کاشمیری عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے ادبی ماحول کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے اسے محمد قلی قطب شاہ کی روایت کا حامل قرار دیتے ہیں۔

ساتویں باب کا عنوان ''ولی: مرکز جو روایت کا ثمر......'' ہے۔اس باب میں ولی اور سراج اورنگ آبادی جیسے شعرا کے حالات اور ان کی شاعرانہ خصوصیات کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے جس سے اس عہد کی صورت حال کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔اس میں ولی کے تاریخ وفات کے تعین میں کوئی وضاحت نہیں کی ہے۔البتہ ان شعرا کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے مصنف نے اپنی تنقیدی صلاحیت کا بھر پور استعمال کیا ہے۔آٹھواں باب ''تاریخ کا عمل۔اٹھارہویں صدی کا ہندوستان'' کے عنوان سے ہے۔اس باب کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔پہلے حصے میں سترہویں صدی کے اواخر اور اٹھارہویں صدی کے نصف اوّل کے سیاسی وسماجی صورت حال کے ساتھ ساتھ مغلیہ سلطنت کے زوال کی روداد کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔دوسرے حصے میں اس عہد کے ایک شاعر جعفر زٹلی کا تذکرہ ہے۔یہ وہ شاعر ہے جسے عام طور پر ہزل گو شاعر سمجھ کر اس کے فکر وفن سے روگردانی برتی گئی۔ڈاکٹر تبسم نے اس حصے میں ان کوششوں کا بیان کرتے ہیں جو جعفر کی زٹلی کی فنی قدر و قیمت کا اعتراف کرنے لیے کی گئیں۔یہ بیانات اس سلسلے میں اہم بھی ہیں اور ان کی مورخانہ صلاحیتوں کو واضح بھی کرتے ہیں۔ان کے مطابق ۱۹۲۸ء میں حافظ محمود شیرانی نے پہلی بار ''پنجاب میں اردو'' میں جعفر کی فنی خصوصیات کو اجاگر کیا۔اس کے بعد جعفر کے کلام وفن پہ تنقیدی وتحسینی مضامین منظر عام پر آتے رہے اور بقول گیان چند جین جعفر زٹلی پر پی ایچ.ڈی کا مقالہ بھی لکھا گیا۔ڈاکٹر تبسم نے اس نوعیت کی تاریخی معلومات پیش کر کے جہاں ایک طرف جعفر زٹلی کی اہمیت کو واضح کیا ہے وہیں اس سے تاریخی معلومات میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔

نواں باب ''شمالی ہند میں نئی لسانی روایت، ولی کی کرامت سخن، ریختہ گو شعرا......'' کے حوالے سے ہے۔اس باب میں مصنف نے شمالی ہند میں نئی لسانی روایت کے آغاز اور محرکات وعوامل سے متعلق اہم گفتگو کی ہے۔نیز ولی کے دیوان کے دلّی آنے پر اس کے مرتب ہونے والے اثرات کا بھی ذکر کیا ہے۔ساتھ ہی اس دور کے ایہام گو شعرا کی شاعرانہ خصوصیات اور ایہام گوئی کے خلاف جو ردعمل سامنے آیا اس پر بھی روشنی ڈالی ہے،اور دلّی میں شعری روایت کی ابتدا کس طرح ہوئی اس بابت بھی بڑے خوب صورت انداز میں مصنف نے اظہار خیال کیا ہے۔اسی باب میں ''ایہام گو شعرا کا دور'' کے ضمنی عنوان کے تحت حاتم، آبرو، محمد شاکر ناجی جیسے اہم شعرا کے فکر وفن کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔''نئی شعریات کا ظہور''

جیسے ذیلی عنوان کے تحت مرزا مظہر جان جاناں کی شعری وفنی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مرزا مظہر کا سنہ ولادت ۱۱۱۳ھ/ ۱۷۰۱ء اور سنہ وفات ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۰ء لکھا ہے، لیکن اس کے ماخذ کے متعلق کوئی وضاحت نہیں کی ہے۔ جب کہ جمیل جالبی نے اپنی تاریخ ادب میں مرزا مظہر کا سنہ ولادت ۱۱۱۰ھ/ ۱۶۹۹ء اور سنہ وفات ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء درج کیا ہے۔[۱۰۷]

''ادبی روایت کا استحکام......عہد ساز شعرا کا دور'' یہ کتاب کے دسویں باب کا عنوان ہے۔اس باب میں مختلف طور پر سیاسی وادبی پس منظر بیان کیا گیا ہے،اس کے بعد اردو کے اہم شعرا مثلاً سودا، میر، درد، قائم ،سوز اور میر اثر کا ذکر ہے جس میں ان کے مختصر حالات بیان کیے گئے ہیں اور ان کے کلام کا فنی و تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ان کے کلام کی خصوصیات کو واضح کیا گیا ہے۔گیارہویں باب ''دبستان لکھنؤ: سیاسی ،تہذیبی اور ادبی تشکیل'' کے عنوان سے ہے۔اس باب کے آغاز میں مصنف نے دبستان لکھنؤ کے ادبی پس منظر کو صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے لسانی ،تہذیبی اور ادبی تشکیل کے محرکات وعوامل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ساتھ ہی شجاع الدولہ سے لے کر واجد علی شاہ کے دور تک کے سیاسی ،سماجی وتہذیبی حالات وواقعات اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ نوابین اودھ کے عہد کا پورا منظر سامنے آجاتا ہے۔اس باب کے دوسرے حصے میں لکھنوی تہذیب کے تشکیلی عناصر کا تفصیلی جائزہ لینے کے ساتھ ہی اس عہد کی تہذیبی صورت حال کو اجاگر کرنے کی مصنف نے کامیاب کوشش کی ہے۔اس باب کے تیسرے حصے میں لکھنوی کے ادب کے اہم عناصر اور اس کا تجزیہ وتعارف اس انداز سے پیش کیا گیا ہے جس سے لکھنوی ادب کی اہم خصوصیات واضح ہو جاتی ہیں۔

''ادبی روایت کی توسیع: لکھنؤ ن ایک نیا ادبی مرکز'' یہ بارہویں باب کا عنوان ہے۔اس عنوان کے تحت مصنف نے ادبی روایت کی توسیع سے متعلق جامع گفتگو کی ہے،اور لکھنؤ کی ادبی مرکزیت اور اس کی اہم خصوصیات کو احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے اس باب میں میر حسن کا سنہ ولادت ۱۷۴۱ء درج کیا ہے ۔ جب کہ جمیل جالبی نے ان کا سنہ ولادت ۱۱۴۹ھ/ ۳۷-۱۷۳۶ء درج کیا ہے۔[۱۰۸] اس باب میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔تیرہواں باب ''انیسویں صدی میں اردو زبان کے دو ادارے'' کے عنوان سے ہے۔باب کے آغاز میں اٹھارہویں

صدی کے آخری دور کی سیاسی وسماجی صورت حال کا ذکر ہے،اس کے بعد انیسویں صدی میں اہم خدمات انجام دینے والے فورٹ ولیم کالج کی تاریخ اور اردو ادب کی خدمات میں اس کے اہم کردار کا جائزہ لیا گیا ہے۔علاوہ ازیں اس باب میں مصنف نے فورٹ ولیم کالج کے علاوہ دلّی کالج کی خدمات کو پورے سیاق سباق کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور دونوں کالجوں کے قیام کے اغراض ومقاصد کو بھی واضح طور پر بیان کیا ہے، نیز فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل جان گلکرسٹ کی خدمات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے فورٹ ولیم کالج کے مقابلے میں دلّی کالج کی خدمات کا ذکر بہت ہی مختصر انداز میں کیا ہے۔ یہاں تک کہ دلّی کالج کے مشاہیر کی خدمات پر بھی کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ چودھواں باب ''داستانی ادب کا ظہور'' کے نام سے ہے۔اس میں اردو کی اہم داستانوں مثلاً ''باغ و بہار'' اور ''فسانۂ عجائب'' کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔اس جائزے میں مصنف نے دونوں داستانوں پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور ان کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔کتاب کے پندرہویں باب کا عنوان ''عوامی روایت کا شاعر:نظیر اکبر آبادی'' ہے۔اس باب میں مصنف نے اپنے پیش رو مورخین کے مقابلے میں نظیر اکبر آبادی کو ایک عوامی شاعر کی حیثیت سے متعارف کرانے میں ایک منفرد انداز اپنایا ہے،جس میں انہوں نے نظیر کی شاعرانہ خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے ان کی شاعری کو قومی یکجہتی اور ہندو مسلم ثقافت کا حسین امتزاج قرار دیا ہے اور آگرہ کی تہذیب وثقافت کا جو عکس ان کی شاعری میں ملتا ہے اس پر بھی گفتگو کی ہے، آخر میں ان کی بعض اہم نظموں مثلاً روٹی،شہر آشوب اور جاڑا وغیرہ کا تجزیہ پیش کیا ہے۔

سولھواں باب ''لکھنؤ کی نئی شمعیں'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں لکھنؤ کے نمائندہ شعرا مثلاً خواجہ حیدر علی آتش،امام بخش ناسخ، دیا شنکر نسیم، واجد علی شاہ کی سیرت و شخصیت اور ان کی شعری خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ساتھ ہی اس عہد کی ادبی وتہذیبی صورت حال بیان کی گئی ہے۔مصنف نے اس باب میں مثنوی ''سحر البیان'' اور مثنوی ''گلزار نسیم'' کی داخلی و خارجی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔اس کے علاوہ واجد علی شاہ کا ڈارامہ ''رہس'' اور امانت کا ڈرامہ ''اندر سبھا'' کا تعارف ایک ساتھ کرایا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں ڈرامے ایک ہی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔سترہواں باب ''دلّی میں کمپنی کی عمل داری ۱۸۰۳ء'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے کمپنی

کی ہندوستان میں عمل داری اوران اثر ورسوخ سے پیدا شدہ نتائج کا تذکرہ کیا ہے۔ساتھ ہی مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔انہوں نے اس عہد کا جونقشہ اپنی کتاب میں کھینچا ہےاس سے ان کے وسیع مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے۔ بہ حیثیت مورخ انہوں نے اپنی ذامہ داریوں کو بہ خوبی نبھایا ہے اور تمام حقائق کوموثر انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

اٹھارھواں باب ''دلّی کی بزم آخر'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں شاہ نصیؔر، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، ظفر اور شیفتہؔ وغیرہ کا ذکر ہے۔ان شعرا میں غالبؔ کا تذکرہ سب سے طویل اور جامع ہے۔اس میں نثر اور شاعری دونوں کا ساتھ ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔اس جائزے میں اس عہد کا پوراادبی منظر نامہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔خصوصاً غالبؔ کے حوالے سے جولکھا گیا ہےاوران کےفکر فن کا جس انداز سے تجزیہ پیش کیا گیا ہےاس سے غالبؔ ی افہام وتفہیم میں بڑی آسانی ہو جاتی ہے۔کتاب کا انیسواں اور آخری باب ''اردو مرثیہ'' کے حوالے سے ہے۔اس باب میں مصنف نے صنف مرثیہ کی اہمیت و افادیت اور لکھنوی ثقافت سے اس کی مطابقت پر بحث کی ہے۔لکھنوی معاشرے میں مرثیے کا کیا مقام تھا اور مرثیہ نگاروں کی کیا قدر ومنزلت تھی اور مجالس وعزاداری کی نوعیت کیا تھی ان تمام صورت حال سے متعلق اہم معلومات فراہم کی ہیں۔مرثیے کی صنف لکھنوی معاشرے میں کس قدر بلند تھی اوراس کے اہم شعرا میر انیسؔ اور دبیرؔ کی جواہمیت وحیثیت تھی اس بھر پور انداز میں اظہار کیا گیا ہے،لیکن نمونۂ کلام نہیں دیا گیا ہے جس کی وجہ سے تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی یہ تاریخی کتاب اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے۔اس میں روایتی تواریخ ادب کا رنگ بہت کم ملتا ہے۔البتہ ابواب بندی میں یہ کتاب اپنے ماقبل لکھی گئی تاریخی کتابوں جیسی ہی ہے۔مگران ابواب کے بیان کا انداز جداگانہ ہے۔اس تاریخ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تاریخ کے زمانی تسلسل کومختلف ادوار کی اکائیوں میں تقسیم نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ایک خاص ترتیب تنظیم اس کی خاکہ بندی میں موجود ہے۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی شاعر یا اس کے فن پارے کا تذکرہ کرتے ہیں تواس سے متعلق تفصیل سے یہ معلومات فراہم کرتے ہیں کہ وہ کب منظر عام پر آیا اور کس محقق کے تلاش وجستجو کا نتیجہ ہے اور تنقید ادب میں اس کا کیا مقام ہے۔علاوہ ازیں کسی شاعر یا

ادیب کا مرتبہ متعین کرتے ہوئے اس کے متعلق پہلے سے موجود معلومات و آرا کا بھی تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اور ساتھ ہی اپنی ذاتی رائے بھی دیتے ہیں جو حسب حال ہوتی ہے۔ اکیسویں صدی کے ادب کے لیے یہ تاریخ اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے قابل قدر ہے جس سے ہر قاری کے علم میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوگا۔

○

حواشی:

۱۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو، زیر اہتمام: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اشاعت ۱۹۶۲ء، تمہید ص: ب، ج
۲۔ خواب باقی ہیں، آل احمد سرور، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۱ء ص: ۱۹۲
۳۔ اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، انجمن ترقیِ اردو، پاکستان ۲۰۰۰ء ص: ۳۳۸
۴۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو، ص: ۱۶
۵۔ ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خاں، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۲۰۰۵ء ص: ۲۶۷
۶۔ اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۴۰۲
۷۔ ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خاں، ص: ۲۷۷
۸۔ اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۴۰۳
۹۔ ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خاں، ص: ۲۵۴
۱۰۔ اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۴۰۹
۱۱۔ ایضاً، ص: ۴۱۶
۱۲۔ ایضاً، ص: ۴۲۴
۱۳۔ مغزِ مرغوب و چہار شہادت (مرتبہ) ڈاکٹر محمد ہاشم، سلسلۂ مطبوعات حیدرآباد اردو اکاڈمی، ۱۹۶۶ء، ص: ۸۶
۱۴۔ تاریخ ادب اردو (جلد اول) ڈاکٹر جمیل جالبی، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۹۵ء ص: ۳۳۶
۱۵۔ ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خاں، ص: ۲۷۶
۱۶۔ اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۴۴۲
۱۷۔ تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (جلد پنجم) پروفیسر سیدہ جعفر - پروفیسر گیان چند جین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء ص: ۳۴-۱۰
۱۸۔ اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر افشاں زوار، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۸ء ص: ۲۹۲
۱۹۔ تاریخ ادب اردو (جلد اول) ڈاکٹر جمیل جالبی، ص: ۲
۲۰۔ ایضاً، ص: ۲
۲۱۔ ایضاً، ص: ۹۹
۲۲۔ ایضاً، ص؛ ۱۴۲
۲۳۔ اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۷۰۰
۲۴۔ ایضاً، ص: ۷۰۰
۲۵۔ ایضاً، ص: ۶۹۷
۲۶۔ تاریخ ادب اردو (جلد اوّل) ڈاکٹر جمیل جالبی، ص: ۲۰۱
۲۷۔ سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ: حیات اور کارنامے، ڈاکٹر حسینی شاہد، انجمن ترقیِ اردو آندھرا پردیش، حیدرآباد، ۱۹۷۳ء، ص: ۱۱۴
۲۸۔ اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۷۰۴
۲۹۔ تاریخ ادب اردو (جلد اوّل) ڈاکٹر جمیل جالبی، ص: ۲۷۵
۳۰۔ اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۷۰۴

۳۱۔ تاریخ ادب اردو (جلد اوّل) جمیل جالبی، ص: ۲۹۰
۳۲۔ ایضاً، ص: ۳۵۱
۳۳۔ اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۶۰۷
۳۴۔ تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (جلد سوم) پروفیسر سیدہ جعفر- پروفیسر گیان چند جین، ۱۹۹۸ء ص: ۳۵۳
۳۵۔ اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۶۰۸
۳۶۔ ایضاً، ص: ۶۰۸
۳۷۔ اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر افشاں زوار، ص: ۱۶۸
۳۸۔ اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۶۸۵
۳۹۔ ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ، رشید حسن خاں، ص: ۲۸۷
۴۰۔ تاریخ ادب اردو (جلد دوم) ڈاکٹر جمیل جالبی، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۹۴ء ص: ۱۳
۴۱۔ ایضاً، ص: ۱۳
۴۲۔ ایضاً، ص: ۶۷۷
۴۳۔ اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۶۱۷
۴۴۔ تاریخ ادب اردو (جلد دوم) ڈاکٹر جمیل جالبی، ص: ۲۰۷
۴۵۔ اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۶۱۹
۴۶۔ تاریخ ادب اردو (جلد دوم) ڈاکٹر جمیل جالبی، ص: ۶۸۵
۴۷۔ ایضاً، ص: ۹۵۲
۴۸۔ ایضاً، ص: ۹۸۵
۴۹۔ اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۶۲۷
۵۰۔ تاریخ ادب اردو (جلد دوم) ڈاکٹر جمیل جالبی، ص: ۱۰۸۶
۵۱۔ اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص: ۶۲۸
۵۲۔ تاریخ ادب اردو (جلد سوم) ڈاکٹر جمیل جالبی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص: ۱۶
۵۳۔ ایضاً، ص: ۱۹
۵۴۔ ایضاً، ص: ۴۰
۵۵۔ اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر افشاں زوار، ص: ۱۸۰
۵۶۔ تاریخ ادب اردو (جلد سوم) ڈاکٹر جمیل جالبی، ص: ۲۸۷
۵۷۔ ایضاً، ص: ۴۳۰
۵۸۔ اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر افشاں زوار، ص: ۱۸۱
۵۹۔ تاریخ ادب اردو (جلد سوم) ڈاکٹر جمیل جالبی، ص: ۴۲۷
۶۰۔ ایضاً، ص: ۸۶۵
۶۱۔ ایضاً، ص: ۹۰۶
۶۲۔ اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر افشاں زوار، ص: ۱۸۴
۶۳۔ تاریخ ادب اردو (جلد سوم) ڈاکٹر جمیل جالبی، ص: ۱۰۱۸

۶۴۔ تاریخ ادب اردو(جلد چہارم،حصّہ اوّل)ڈاکٹرجمیل جالبی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۲۰۱۵ءتمہید،ص:۲۰
۶۵۔ ایضاً،ص:۲۰۲
۶۶۔ ایضاً،ص:۵۷۵
۶۷۔ ایضاً،ص:۱۷۷
۶۸۔ تاریخ ادب اردو(جلد چہارم،حصّہ دوم)ڈاکٹرجمیل جالبی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۲۰۱۵ءص:۱۱۱۲
۶۹۔ ایضاً،ص:۱۳۹۵
۷۰۔ ایضاً،ص:۱۵۴۴
۷۱۔ اردو کی ادبی تاریخیں،ڈاکٹرگیان چندجین،ص:۸۶۱
۷۲۔تاریخ ادب اردو۱۷۰۰ءتک(جلد اوّل)پروفیسر سیدہ جعفر-پروفیسر گیان چندجین،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۹۸ءص:۱۰
۷۳۔ اردو کی ادبی تاریخیں،ڈاکٹرگیان چندجین،ص:۸۶۰
۷۴۔ تاریخ ادب اردو۱۷۰۰ءتک:تحقیق کے آئینے میں،ڈاکٹرابرارعبدالسلام،ادارۂ یادگارِ غالب،کراچی،۲۰۱۴ءص:۲۴-۲۳
۷۵۔ تاریخ ادب اردو۱۷۰۰ءتک(جلداوّل)پروفیسرسیدہ جعفر-پروفیسرگیان چندجین،ص:۹۵
۷۶۔ اردو کی ادبی تاریخیں،ڈاکٹرگیان چندجین،ص:۸۶۲
۷۷۔ تاریخ ادب اردو۱۷۰۰ءتک:تحقیق کے آئینے میں،ڈاکٹرابرارعبدالسلام،ص:۴۸
۷۸۔ تاریخ ادب اردو۱۷۰۰ءتک(جلداوّل)پروفیسرسیدہ جعفر-پروفیسرگیان چندجین،ص:۲۳۹
۷۹۔ تاریخ ادب اردو۱۷۰۰ءتک:تحقیق کے آئینے میں،ڈاکٹرابرارعبدالسلام،ص:۵۰
۸۰۔ تاریخ ادب اردو۱۷۰۰ءتک(جلداوّل)پروفیسرسیدہ جعفر-پروفیسرگیان چندجین،ص:۳۸۳
۸۱۔ ایضاً،ص:۴۱۹
۸۲۔ تاریخ ادب اردو۱۷۰۰ءتک:تحقیق کے آئینے میں،ڈاکٹرابرارعبدالسلام،ص:۳۷
۸۳۔ تاریخ ادب اردو(جلداوّل)ڈاکٹرجمیل جالبی،ص:۱۵۱
۸۴۔ اردو کی ادبی تاریخیں،ڈاکٹرگیان چندجین،ص:۸۷۰
۸۵۔ تاریخ ادب اردو۱۷۰۰ءتک:تحقیق کے آئینے میں،ڈاکٹرابرارعبدالسلام،ص:۵۷
۸۶۔ ،تاریخ ادب اردو۱۷۰۰ءتک(جلددوم)پروفیسرسیدہ جعفر-پروفیسرگیان چندجین،ص:۲۱۵
۸۷۔ تاریخ ادب اردو۱۷۰۰ءتک:تحقیق کے آئینے میں،ڈاکٹرابرارعبدالسلام،ص:۵۸
۸۸۔ ایضاً،ص:۵۸
۸۹۔ اردوادب کی تاریخوں کاتحقیقی وتنقیدی جائزہ،ڈاکٹرافشاں زوار،ص:۳۲۹
۹۰۔ تاریخ ادب اردو۱۷۰۰ءتک(جلدسوم)پروفیسرسیدہ جعفر-پروفیسرگیان چندجین،ص:۱۲۶
۹۱۔ اردو کی ادبی تاریخیں،ڈاکٹرگیان چندجین،ص:۸۶۸
۹۲۔ تاریخ ادب اردو۱۷۰۰ءتک:تحقیق کے آئینے میں،ڈاکٹرابرارعبدالسلام،ص:۱۷۸
۹۳۔ ایضاً،ص:۱۷۹
۹۴۔ تاریخ ادب اردو۱۷۰۰ءتک(جلد چہارم)پروفیسرسیدہ جعفر-پروفیسرگیان چندجین،ص:۳۵۵
۹۵۔ تاریخ ادب اردو۱۷۰۰ءتک:تحقیق کے آئینے میں،ڈاکٹرابرارعبدالسلام،ص:۱۹۱

۹۶۔ اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند جین، ص:۸۷۲

۹۷۔ تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک: تحقیق کے آئینے میں، ڈاکٹر ابرار عبدالسلام، ص: ۲۵-۲۲

۹۸۔ تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (جلد پنجم) پروفیسر سیدہ جعفر- پروفیسر گیان چند جین، ص:۴۸۵

۹۹۔ اردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ایم. آر پبلی کیشنز: نئی دہلی، ۲۰۰۹ء ص: پیش لفظ، ص:۹

۱۰۰۔ ایضاً، پیش لفظ، ص:۱۰

۱۰۱۔ ایضاً، ص:۳۰-۲۹

۱۰۲۔ تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (جلد اوّل) پروفیسر سیدہ جعفر- پروفیسر گیان چند جین، ص:۳۷۴

۱۰۳۔ ایضاً، ص:۴۵۲

۱۰۴۔ اردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ص:۴۶

۱۰۵۔ تاریخ ادب اردو (جلد اوّل) ڈاکٹر جمیل جالبی، ص:۳۸-۲۳۶

۱۰۶۔ تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (جلد دوم) پروفیسر سیدہ جعفر- پروفیسر گیان چند جین، ص:۴۳۶

۱۰۷۔ تاریخ ادب اردو (جلد دوم) ڈاکٹر جمیل جالبی، ص:۳۵۹

۱۰۸۔ ایضاً، ص:۸۱۹

حاصل مطالعہ

''تاریخ'' بنیادی طور پر عربی کا لفظ ہے جس کا مادہ ''ارخ'' ہے۔ اس کا مطلب ہے ''وقت کا بیان کرنا''، 'علم التاریخ' سے مراد ایسا علم جس میں واقعات مع تاریخ بیان کیے جائیں۔ اردو میں تاریخ کا لفظ متعدد معنوں میں مستعمل ہے لیکن ہمیں یہاں ہر قسم کے معنی سے سروکار نہیں۔ بطور ایک علمی اصطلاح کے اردو میں لفظ تاریخ کا مفہوم کسی چیز کے ظہور کا وقت، کسی امر عظیم کے وقت کا تعین، اس فن کا نام جس میں واقعات گذشتہ سے بحث کی جاتی ہے، لیا جاتا ہے۔ انگریزی میں تاریخ کے لیے "History" کا لفظ مستعمل ہے، جس کا تعلق لاطینی لفظ "Histo" یا "Historia" سے ہے، اس سے مراد کسی واقعے کی تفتیش و تحقیق کرنا ہے۔ عام طور پر لفظ ہسٹری (History) سے مراد کسی قوم، معاشرے اور ادارے کے وقائع خاص کا صحتِ وجوہات کے ساتھ ترتیب وار تحریری ریکارڈ ہے۔ یونانی زبان میں لفظ 'تاریخ' انڈ نئے "EIDENAI" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، جس سے مراد کسی واقعے کی بصیرت و ادراک حاصل کرنا ہے اور فرانسیسی زبان میں یہ لفظ ہسٹر (ISTOR-HISTOR) کے طور پر استعمال ہوا ہے، جس سے مراد ماضی کی کسی چیز یا واقعے کے بارے میں جاننا اور معلومات رکھنا ہے۔

تاریخ ایک سبق آموز داستان ہے، جس میں ماضی کا بیان، حال کا تجزیہ اور مستقبل کی روشنی ہوتی ہے۔ یہ صرف روایت پسند اور نقوشِ پارینہ کا خزانہ نہیں بلکہ ہمارے ذہنی و فکری، جذباتی و تہذیبی، معاشرتی و ثقافتی سفر کی ارتقائی داستان ہے، جس کے آئینے میں قومی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایسا علم ہے جو پوری زندگی پر محیط ہے۔ فکری، عملی، ادبی، مالی، ملکی، سیاسی، اقتصادی غرض انسانی حیات کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کی روداد تاریخ نہ کہلائے۔ دیومالائی شخصیتوں سے لے کر مفکروں، سیاست دانوں اور سائنسدانوں کے افکار و نظریات کے علم کا منبع و مخرج بھی یہی ہے۔ اسی بنیاد پر تاریخ کو ''ام العلوم'' تصور کیا جاتا ہے۔

وہ تمام عملی مطالبے جو کسی تاریخی فیصلے کے بین السطور میں ہوتے ہیں، تاریخ کو عصری تاریخ کے کردار میں بدل دیتے ہیں خواہ کوئی بھی واقعات زمانے کے اعتبار سے کتنے ہی بعید کیوں نہ ہوں فی الحقیقت موجودہ ضروریات سے متعلق ہوتے ہیں، اس لیے یہ کہا گیا ہے کہ ''**الماضی اشبہ بالآتی من الماء بالماء**'' عہد گزشتہ عہد آئندہ سے اس قدر مشابہ ہے کہ پانی، پانی سے بھی اس قدر مشابہ نہیں۔'' تاریخ ایک ایسا مضمون ہے جو زندگی کے ہر پہلو کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے، جس کے مطالعے کے لیے بڑے گہرے تجربے کے ساتھ پختہ عقل اور غور وفکر کی ضرورت ہے کیوں کہ اس کا مطالعہ جہاں ہمیں یہ مواقع فراہم کرتا ہے کہ ماضی میں کسی قوم کے افکار ونظریات کیا تھے؟ وہ نظریہ یا ایجاد کن مرحلوں، راستوں اور دشواریوں سے گزر کر پایۂ تکمیل تک پہنچی۔ وہیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ہم دوسروں کے تجربے سے سیکھیں کیوں کہ تاریخ میں لامحدود انسانی تجربہ ہوتا ہے جو کہ انفرادی تجربہ سے زیادہ وسیع اور مختلف اقسام کا ہوتا ہے۔ ان تجربات یا انسانی ذہن کو اس وقت تک مکمل طور پر نہیں سمجھا جا سکتا جب تک بکھری ہوئی کڑیوں کو ملایا نہیں جائے گا اور یہ کام صرف تاریخ کر سکتی ہے۔

انیسویں صدی میں تاریخ میں ایک بڑی تبدیلی اس وقت آئی، جب سائنس کی تعلیم اور سائنسی طرز فکر کی ہمہ گیر اہمیت زندگی کے ہر شعبہ میں محسوس کی جانے لگی تو اس رجحان نے تعلیم کے میدان میں بھی دور رس اثرات ڈالے۔ جس کا اثر تاریخ اور مورخ دونوں پر ہوا۔ اب تاریخی واقعات کی اصلیت اور صداقت معلوم کرنے کے لیے تحقیق وجستجو کے سائنسی طریقے کام میں لائے جانے لگے۔ جس کی وجہ سے وہ شخصیتیں جن کا مقام تاریخ میں اس لیے اہم تھا کہ ان کے ارد گرد کراماتیں اور معجزے تھے، ان کی اصلی اور تاریخی حقیقت جس میں چھپی تھی، ایک ایسے معاشرے میں تو موثر ہو سکتی تھیں جس کی ذہنی ترقی نہیں ہوئی تھیں یا جو چیزوں کو عقلی اور سائنسی بنیاد پر نہیں سمجھ پاتے تھے، اس لیے وہ واقعات کی وجوہات تلاش نہ کر کے ان پر یقین کر لیتے اور اسے مافوق الفطرت قوتوں سے منسوب کر دیتے تھے۔ آج جب سائنسی طریقے پر ان واقعات کو جانچا گیا تو ان کی تاریخی اہمیت کم ہو گئی اور جب تاریخی اہمیت کم ہو گئی تو ان کے عمل اور کردار سے انسان کچھ سیکھنے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کرتا ہے۔ کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ انسان صرف انسان سے سیکھ سکتا ہے جو انسانی درجے سے بلند ہوں ان کی صفات حاصل کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔

جب تک تاریخ نے انیسویں صدی میں قدم نہیں رکھا وہ تحقیق وترتیب کے اصول سے نا آشنا رہی، اور تاریخ کے صفحات میں حکمراں طبقے کی تعریف، دلچسپ قصے، داستان اور رزمیہ نظمیں کہانی کی شکل میں لکھی جاتی رہیں۔ انیسویں صدی میں تاریخ کے لیے تحقیق وترتیب کا اصول مقرر کیا گیا اور اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ تاریخ محض سیاسی واقعات یا چند شخصیتوں کے کارناموں کا مجموعہ نہیں بلکہ اس میں سماجی ومعاشی او رثقافتی عناصر اہم کردار ادا کرتے ہیں اور ان سب کی شمولیت ہی تاریخ کو تاریخ بناتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ تاریخ ادب میں ادوار کا تعین سہولت کے پیش نظر ضرور کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ادوار منجمد اور قائم بالذات ہوتے ہیں اور ایک دور سے دوسرے دور کے درمیان کوئی دیوار حائل ہوتی ہے۔ تاریخ چاہے وہ عام تاریخ ہو یا تاریخ ادب ایک مسلسل بہتے ہوئے دھارے کی طرح ہوتی ہے جسے خانوں میں تقسیم کرنا آسان نہیں۔ دراصل ایک دور دوسرے دور میں اس طرح پیوست ہوتا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ایک دور کہاں ختم ہوا اور دوسرا دور کب شروع ہوا۔

بہر حال ادبی تاریخ شیشے کے مانند وہ سمندر ہے جو ان تمام مطالبات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، جس میں ہم زبان اور اس کے بولنے اور لکھنے والوں کی اجتماعی وتہذیبی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ ادب میں سارے فکری، تہذیبی، سیاسی، معاشرتی اور لسانی عوامل ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک وحدت ایک اکائی بناتے ہیں اور ادبی تاریخ ان تمام اثرات، روایات، محرکات، خیالات اور رجحانات کا آئینہ بن جاتی ہے، جن کی مدد سے ہم کسی بھی قوم کے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور تاریخی عوامل کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ ادیبوں، فلسفیوں، مفکروں، شاعروں اور عالموں کو جان یا پہچان سکتے ہیں۔ کسی معاشرے کی اخلاقی اقدار، روایات اور ثقافتی ادارے کس طرح تبدیلی کا شکار ہوئے ان سب کا صحیح اندازہ ادبی تاریخ کے مطالعے سے ہی ہوتا ہے۔

ادبی تاریخ ہمہ جہت چیز ہے اور ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اہمیت کی حامل ہے کیوں کہ ادبی فن پارے کو پڑھ کر جہاں ہم اس کی تحسین کرتے ہیں وہیں بہت سے سوالات بھی سر اٹھاتے ہیں۔ ان سوالات کو حل کرنے کے لیے گزشتہ ادبی روایات کو سمجھنا ہوتا ہے۔ پھر شاعر یا ادیب اپنے فن پارے میں جو زبان استعمال کرتا ہے، اس میں بہت سے استعارے، تشبیہات یا تراکیب ایسی ہوتی ہیں جو صرف اس

کے دور ہی سے مخصوص ہوتی ہیں۔ ان کو سمجھنے کے لیے پورے ادب کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ جو تاریخ ادب کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی ضرورت کے پیش نظر راقم نے اپنے مقالے کا موضوع ''اردو کی ادبی تاریخوں سے متعلق تنقید کا تجزیاتی مطالعہ'' منتخب کیا، جو درج ذیل پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

باب اول: تاریخ اور ادبی تاریخ کے چند مباحث

باب دوم: ادبی تاریخ کے ابتدائی نقوش (تذکروں کے حوالے سے)

باب سوم: رام بابو سکسینہ اور اعجاز حسین سے قبل ادبی تاریخ کے نمونے

باب چہارم: اردو ادب کی مختصر تاریخوں سے متعلق تنقید کا محاکمہ

باب پنجم: اردو ادب کی طویل تاریخوں سے متعلق تنقید کا محاسبہ

باب اوّل '' تاریخ اور ادبی تاریخ کے چند مباحث'' کے عنوان سے ہے۔ باب کے ابتدا میں مختلف زبانوں میں تاریخ کی جو تعریف بیان کی گئی ہے اس کا ذکر ہے۔ اس کے بعد تاریخ کے حوالے سے مشرقی و مغربی مورخین کے اقوال و نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان اقوال و نظریات میں ایک بات جو مشترک ہے وہ یہ کہ مغربی مورخین اسے صرف واقعات کی کھتونی نہیں بلکہ ایک ہمہ جہت علم سمجھتے ہیں، جو زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے۔ کوئی قوم یا معاشرہ ایک خاص وقت یا ایک خاص دور میں کس طرح رہتا تھا، کیا سوچتا تھا، روایات کیا تھیں، انداز تعمیر کیا تھا؟ ان سارے سوالات کا جواب صرف تاریخ دے سکتی ہے۔

اسی طرح جب ہم مسلمان مورخین کے نظریات و خیالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ بھی اس علم کو بے مقصد یا قصہ کہانی نہیں سمجھتے ہیں۔ مسلمان مورخین کا نقطۂ نظر قرآن کریم سے متاثر ہے اور قرآن کریم میں خود یہ کہا جا رہا ہے کہ اگر تم قوموں کے عروج و زوال اور عزت و ذلت کا حقیقی سبب معلوم کرنا چاہتے ہو تو تاریخ کی ورق گردانی کرو، اور تم سے پہلے جو قومیں گزر چکی ہیں ان کا حال معلوم کرو۔

ابتدا میں ہر قوم صرف اپنی تاریخ میں دلچسپی لیتی تھی اور اسے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی تھی لیکن جب تجارتی اور سفارتی تعلقات نے قوموں کو ایک دوسرے کے قریب کیا تو ان میں ایک دوسرے کو جاننے کا شوق پیدا ہوا۔ باوجود اس کے کہ ہر قوم کی تاریخ جدا ہوتی ہے اس میں ایک تاریخی تسلسل برقرار رہتا ہے خواہ وہ تسلسل تہذیب و تمدن کی شکل میں ہو یا تخلیقات و ایجادات کی شکل میں کیوں کہ ایک قوم جو سرمایہ

چھوڑ کر جاتی ہے وہ باقی رہتا ہے اور اس کی بنیاد پر دوسری قومیں مزید تعمیر کرتی ہیں اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے، جس سے پوری انسانیت فائدہ اٹھاتی ہے۔

جیسے جیسے حالات بدلے، تاریخ کا دائرہ بڑھا، مورخ کی ذمہ داری بڑھی۔ واقعات کے اسباب پر غور وفکر ساتھ ساتھ ان واقعات کو اصول تحقیق کی روشنی میں جانچا جانے لگا اور یوں تاریخ کو ایسے مورخین سے چھٹکارا ملا جو تاریخ کے صفحات کو اوہام وخیالات وخود تراشیدہ روایات سے بوجھل کرتے تھے کیوں کہ اب تاریخ لکھنے کے لیے ایسے مورخ کی ضرورت ہوتی ہے جو تربیت یافتہ ہو، کیوں کہ تربیت یافتہ مورخ ہی واقعات کی اہمیت اور ان کی روح کو سمجھ سکتا ہے، ایک غیر تربیت یافتہ مورخ کی نظروں میں بہت سے واقعات غیر اہم ہوتے ہیں اور وہ اس قابل نہیں ہوتا کہ ان کا ادراک کر سکے، جب کہ ایک تربیت یافتہ مورخ کی نگاہ اس قابل ہوتی ہے کہ وہ واقعات کی نوعیت اور حقائق کو دیکھ سکے اور ان کا تجزیہ کر سکے۔

وقت اور معلومات کے بڑھتے ذخیرے کے ساتھ تاریخ کے علم کا دامن بھی وسیع ہوتا گیا اور اس کے بہت سے دوسرے شعبے وجود میں آتے گئے، مثلاً معاشرتی تاریخ، معاشی تاریخ، سیاسی تاریخ، قومی تاریخ، مذہبی تاریخ۔ اسی طرح اس کا ایک نہایت اہم شعبہ ادبی تاریخ بھی ہے۔

ادب کی تاریخ عام تاریخ کا ایک جز یا شعبہ ہونے کے باوجود بھی اس سے الگ اور منفرد ہے۔ ایسا اس لیے کہ ادب کی تاریخ کا معاملہ عام تاریخ کے مقابلے میں خاصا نازک اور پیچیدہ ہے۔ اس لیے کہ یہ تاریخ کے مروجہ تصور کے مطابق محض ایام شماری نہیں اور نہ معلومات وکوائف مرتب کرنا ہے۔ اگر چہ تاریخ میں یہ سب کچھ شامل ہے لیکن بنیادی طور پر یہ تخلیق اور تخلیق کاروں کا مطالعہ ہے۔ اگر ایک طرف تاریخ ادب سے تخلیق کی معیار بندی ہوتی ہے تو دوسری جانب تخلیق کاروں کی انسانی اور تخلیقی شخصیت کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ تاریخی مطالعے کا مقصد صرف اپنی معلومات میں اضافہ کرنا نہیں ہوتا، بلکہ اپنے ادبی ذوق کی تربیت بھی مقصود ہوتی ہے۔ حال کو ماضی کے حقائق کے ذریعے سوچنے سمجھنے کی کوشش ہوتی ہے۔ عام طور پر ادب کا قاری اس کا مطالعہ صرف ذہنی تسکین کی خاطر کرتا ہے۔ اس لیے وہ صرف اپنے دور کے ادبی فن پاروں تک محدود رہتا ہے۔ مگر ادب کا سنجیدہ قاری صرف اپنے دور تک محدود رہنا نہیں چاہتا بلکہ وہ اپنے دور تک آنے والی ادبی روایت اور ان کی روح سے بھی آشنا ہونا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ

اپنے دور کے ادب کی ذہنی، فکری اور لسانی روایتوں کو جاننا چاہتا ہے۔ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں کی معلومات وتفہیم کے لیے ان ادبی شہ پاروں کا گہری نظر سے مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔تبھی جا کر یہ مقاصد پورے ہوسکتے ہیں۔

باب دوم ''ادبی تاریخ کے ابتدائی نقوش (تذکروں کے حوالے سے)ہے۔اس باب میں اردو کے چند اہم تذکروں مثلاً ''نکات الشعرا'' (میر تقی میرؔ) ''مخزن نکات'' (قائم چاند پوری) ''طبقات الشعرا'' (قدرت اللہ شوق) ''تذکرہ شعرائے اردو'' (میر حسن) ''گلشن ہند'' (مرزا علی لطف) ''مجموعۂ نغز'' (حکیم قدرت اللہ قاسم) ''گلشن بے خار'' (نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ) ''تاریخ ادب ہندوستانی'' (گارساں دتاسی) ''طبقات شعرائے ہند'' (کریم الدین ،فیلن) کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔کیوں کہ اردو شعروادب کے تاریخی اور تحقیقی مطالعے کے لیے تذکرے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ان تذکروں کے مطالعے کے بغیر نہ قدیم شعروادب کے فکری میلانات کو سمجھا جا سکتا ہے، نہ اس عہد کے تنقیدی شعور کا جائزہ لیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے فنی معیاروں کو پرکھنے کی کوشش ہی کامیاب ہوسکتی ہے۔کیوں کہ یہی یادگاریں تاریخ ادب کی پہلی منزل اور اس کی بنیاد ہیں۔ادبی مورخین ابتدائی معلومات انہیں تذکروں سے حاصل کرتے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں اسے اپنی تاریخوں کا حصہ بناتے ہیں۔قدیم اردو شاعری کے نمونے فراہم کرنے ہوں یا کسی شاعر کے سوانحی حالات کا بیان ہو، انہیں تذکروں سے مدد لی جاتی ہے۔ان تذکروں میں مختلف اشارات کی صورت میں زبان وادب کے ارتقاء کی جو داستان ملتی ہے یا قدیم شعرا کے کلام پر جو ذاتی رائے نما تنقید نظر آتی ہے وہ ادبی تاریخوں میں جابجا دیکھی جاسکتی ہے۔

اردو میں تذکرہ نگاری کی روایت دوسری متعدد اصناف ادب کی طرح فارسی کے توسط سے داخل ہوئی۔یہاں اس میدان میں ارباب قلم کی کاوشوں کے اولین نمونے ۱۱۶۵ھ/۵۲-۱۷ء کے قریب منظر عام پر آئے۔اس وقت سے لے کر آب حیات کی اشاعت (۱۸۸۰ء) تک اردو شعرا کے کئی تذکرے مرتب کیے گئے لیکن ان میں بعض تذکرے نایاب ہیں مثلاً محمد یار خاں خاکسارؔ، محمد رفیع سوداؔ، سراج الدین علی خاں آرزوؔ اور سید امامؔ وغیرہ کے تذکروں کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا بلکہ ان میں سے بعض کا وجود بھی مشتبہ ہے۔اس لیے ان کے آغاز وانجام یا نوعیت وکیفیت کے متعلق کوئی گفتگو لا حاصل ہے۔ ہاں قدیم ترین

دستیاب تذکروں کو سامنے رکھ کر ان کی تقدیم و تاخیر کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ اردو کے قدیم ترین تذکروں میں مندرجہ ذیل کے نام لیے جاتے ہیں۔

۱۔ نکات الشعرا	میر تقی میر	۱۱۶۵ھ
۲۔ گلشن گفتار	حمید اورنگ آبادی	۱۱۶۵ھ
۳۔ تحفۃ الشعرا	افضل بیگ قاقشال	۱۱۶۵ھ
۴۔ ریختہ گویاں	فتح علی حسینی گزدیزی	۱۱۶۶ھ
۵۔ مخزن نکات	قیام الدین قائم	۱۱۶۸ھ

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی کتاب ''شعرائے اردو کے تذکرے'' میں جو ادوار قائم کیے ہیں اگر ان کا مختصراً جائزہ لیں تو اردو تذکروں کا پہلا دور میر تقی میر کے ''تذکرے نکات الشعرا'' (مولفہ ۱۱۶۵ھ/۵۲ ۱۷ء) سے لے کر اسد علی خاں اورنگ آبادی کے تذکرے ''گل عجائب'' (مولفہ ۹۶-۱۱۹۴ھ/۸۲-۱۷۸۰ء) تک محیط نظر آتا ہے۔ یہ دور حمید اورنگ آبادی (گلشن گفتار) سید فتح علی حسینی الگردیزی (تذکرہ ریختہ گویاں) قائم چاندپوری (مخزن نکات) اور میر حسن (تذکرہ شعرائے اردو) وغیرہ کا دور ہے۔ یہ تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں ذکر اردو شعرا کا کیا گیا ہے اس لیے انتخاب کلام بھی اردو زبان ہی میں درج ہے۔ اس دور کی واضح خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ سب تذکرے مختصر ہیں۔ کیوں کہ اس دور میں صرف انتخاب کلام کا رجحان تھا۔ ان تذکروں میں شعرا کی تعداد سو سے لے کر تین سو کے قریب تک پہنچتی ہے جس میں میر تقی میر کا تذکرہ ''نکات الشعرا'' کلام پر تبصرے اور آرا کے اعتبار سے سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔

اس کے بعد تذکرہ نگاری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جس میں تمام قابلِ ذکر شعرا کو جگہ دی گئی ہے اس لیے اسے جامعیت کا دور کہا جاتا ہے۔ یہ دور علی ابراہیم کے تذکرے ''گلزار ابراہیم'' مرقومہ ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء سے شروع ہوکر قطب الدین باطن کے تذکرے ''گلستان بے خزاں'' مرقومہ ۶۵-۱۲۶۱ھ/ ۴۹-۱۸۴۵ء تک پھیلا نظر آتا ہے۔ اس دور میں لکھے جانے والے اہم تذکرے ''عیار الشعرا'' خوب چند ذکاؔء، مولفہ ۲۶-۱۲۳۱ھ/۱۸۱۲-۱۷۹۹ء، اعظم الدولہ سرورؔ کا لکھا ہوا تذکرہ ''عمدہ

منتخبہ'' مولفہ۴۴-۱۲۱۶ھ/ ۲۹-۱۸۰۱ء اور قدرت قاسم کا تذکرہ ''مجموعہ نغز'' مولفہ ۱۲۶۱ھ/ ۷-۱۸۰۷ء ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی تذکرے لکھے گئے ہیں مثلاً گلشنِ ہند (بہ زبانِ اردو) گلشنِ بے خار، دستور الفصاحت اور خوش معرکہ زیبا وغیرہ۔ اس دور میں لکھے جانے والے تذکروں میں شعرا کی تعداد چھ سو سے لے کر پندرہ سو تک ملتی ہے۔ اسی ضخامت کی وجہ سے بعض تذکروں میں کچھ خرابیاں در آئی ہیں مثلاً تکرار کی کیفیت اور ناقص معلومات پر مبنی باتیں۔ بہر حال ''عیار الشعرا'' کو اس دور کا ضخیم ترین تذکرہ کہا جا سکتا ہے کیوں کہ اس میں بقول سید عبداللہ پندرہ سو شعرا کا ذکر ملتا ہے۔ معلومات کے اعتبار سے ''مجموعہ نغز'' کو ایک بہترین کوشش کہا جا سکتا ہے۔ تیسرے دور میں صرف انہی شعرا کے حالات و واقعات کا ذکر ملتا ہے جو اہم سمجھے جاتے ہیں۔ نیز تذکروں میں حالات و واقعات کے صحت و سند کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ یہ دور کریم الدیؔن کے تذکرے ''طبقات الشعرا ہند'' مولفہ ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء سے لے کر مولانا محمد حسین آزاد کے تذکرے ''آب حیات'' مولفہ ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء تک پھیلا نظر آتا ہے۔ آب حیات کے بعد حقیقتاً تذکرہ نگاری کا دور ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ مغرب کے زیر اثر تنقید، تاریخ اور سوانح نگاری لے لیتی ہے۔ خود ''آب حیات'' طرز قدیم کے تذکروں سے بالکل مختلف چیز ہے۔ اس میں اردو زبان کی تاریخ، لسانی مسائل، مختلف ادوار کی خصوصیات اور شعرا کی شخصیت و کلام پر رائے زنی کا وہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو تاریخ، سوانح کا خاصہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ اردو زبان و ادب کے تقریباً سارے ناقدین آب حیات کو اردو ادب کی پہلی تاریخی و تنقیدی کتاب خیال کرتے ہیں،. اس بات سے انکار نہیں کہ آب حیات کے بعد بھی تذکرے کے طرز پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔

گویا تذکرہ نگاری کی قدیم روش میں تبدیلی آئی اور دستاویزی شہادتوں کی بدولت مستند مواد پیش کیا جانے لگا۔ علاوہ ازیں شعری و لسانی روایات کی عہد بہ عہد ترقیوں کو ایک تاریخی دستاویز کی صورت میں منضبط کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان محرکات کی روشنی میں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ تذکرہ نگاری کا فن وقت اور حالات کے تقاضوں کا ردّعمل ہے۔ انسان کی ارتقاء پذیر قوت فکر کی کرشمہ سازیاں ماحول اور زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ان تقاضوں کی نوعیت اور ان کے نتائج کو ہر لحاظ سے نئے آب و رنگ سے آشنا کرتی رہتی ہیں۔ اس کے باوجود ہر نسل کے فن کار اپنی راہ کے تعین اور کوششوں کی کامیابی

کے لیے بڑی حد تک اسلاف کے نقوشِ قدیم ہی سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اس لیے ان کے کارناموں کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوتی۔ تذکروں کا بھی یہی حال ہے۔ آج عملاً تاریخ ادب ان کی جگہ لے چکی ہے اور ان اغراض و مقاصد کی صورت گری کے لیے جن کی تکمیل کے ساتھ ان کی افادیت و مقبولیت کا دامن وابستہ تھا، علم و تحقیق کی وسیع تر شاہراہیں کھل گئی ہیں۔ تاہم کوئی انصاف پسند اور ذمہ دار مورخ یہ جرأت نہیں کرسکتا کہ ماضی کے اس عظیم ورثے کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر آگے بڑھ جائے۔ کیوں کہ انہیں تذکروں کی مدد سے حال کا رشتہ ماضی سے جوڑا جاسکتا ہے اور آئندہ بھی جب کسی ادبی گتھی کو سلجھانا ہوگا یا کوئی خلا پر کرنا ہوگا تو ان کی مدد سے ہی ایسے مراحل طے کیے جاسکیں گے۔

باب سوم ''رام بابو سکسینہ اور اعجاز حسین سے قبل ادبی تاریخ کے نمونے'' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' مولوی عبد الحئ کی ''گل رعنا'' اور عبد السلام ندوی کی ''شعر الہند'' کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ''آب حیات'' ۱۸۸۰ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کتاب میں آزاد نے اپنے سے قبل لکھے گئے تذکروں کا انداز اپنانے کے ساتھ ایک نئی روش بھی اختیار کی۔ انہوں نے اردو شاعری کو پانچ ادوار میں تقسیم کر کے ہر دور سے صرف نمائندہ شعرا کو منتخب کیا اور جو ان کی نظر میں غیر اہم شعرا تھے انہیں نظر انداز کر دیا۔ منتخب کیے گئے شعرا کے مختصر حالات زندگی، ان کی شکل وصورت، ان کے مزاج اور ان کی زندگی کے اہم واقعات اور خصوصیات کلام کو اس طرح بیان کیا کہ ان کی جیتی جاگتی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ یوں تو بظاہر آزاد نے اسے صرف شاعری کی تاریخ کے طور پر لکھا ہے، مگر اس میں بیک وقت کئی ایسے عناصر، اور کئی ایسی خصوصیات ہیں جو اسے تذکرہ اور تاریخ کے درمیان لاکر کھڑا کر دیتی ہے۔

آب حیات جب پہلی مرتبہ منظر عام پر آئی تو اس میں بعض ایسی کمزوریاں تھیں جس کی وجہ سے اس پر سخت تبصرے ہوئے۔ خاص طور پر مومن جیسے ممتاز غزل گو شاعر کو نظر انداز کر دینے اور ذوق کو تمام منتخب شاعروں سے افضل و برتر ثابت کرنے کے نتیجے میں آزاد کو ہدف ملامت بنایا گیا۔ آخر کار مصنف کو کتاب پر نظر ثانی کرنی پڑی اور ۱۸۸۳ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن بہت سے اضافوں اور ترمیموں کے ساتھ شائع کرایا جس کی تفصیل اسلم فرخی نے اپنی کتاب ''محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف'' کی جلد دوم میں صفحہ ۱۴ تا ۱۹ پر دی ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ میر ضاحک، میر حسن، خلیق، مومن، دبیر اور انیس کے حالات پہلی بار

دوسرے ایڈیشن میں پیش کیے گئے۔اسی طرح ناسخ اور ذوق کے حالات از سر نو لکھے گئے۔جن اغلاط کی طرف لوگوں نے اشارہ کیا تھا انہیں دور کیا اور نئی معلومات کا اضافہ کیا۔گویا اب یہ کتاب محض شاعری کی تاریخ نہیں بلکہ توانا، متحرک اور زندگی سے لبریز دستاویز بن کر ابھری۔اس کی وجہ یہ تھی کہ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی اس وقت تک اردو شعرا کے بے ربط سے تذکروں کو چھوڑ کر شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا اور شعرا کے مفصل حالات پر کوئی کتاب موجود نہ تھی۔لہٰذا ایک ایسی کتاب کی سخت ضرورت تھی جس میں شعرا کے متعلق زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کیے گئے ہوں، اس میں تحقیق وتنقید کے نمونے بھی ہوں اور شاعروں کے مستند حالات بھی۔محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' نے اس کمی کو حتی الامکان پورا کر دیا۔

آب حیات کے بعد تذکرہ نویسی کا جدید دور شروع ہوتا ہے جس میں شعراالہند، گل رعنا اور خمخانۂ جاوید جیسے تذکرے لکھے گئے۔ان میں سے بعض میں آب حیات کی طرح تاریخ ادب کا رنگ وآہنگ موجود ہے، گل رعنا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔اگر اس کے اندراجات پر نظر ڈالی جائے تو یہاں 'آب حیات' کی تقلید صاف نظر آتی ہے۔مثلاً ابتدا میں محمد حسین آزاد نے اپنے مقدمے میں اردو زبان اور اردو شاعری کی تاریخ بیان کی ہے۔حکیم صاحب نے بھی مقدمے میں چند صفحوں میں اردو نثر کی تاریخ کے اضافوں کے ساتھ اردو زبان اور اردو شاعری کی تاریخ بیان کی۔نثری تاریخ کے اضافے پر گیان چند جین کا یہ اعتراض ہے کہ ''اردو شاعری کی تاریخ میں اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔'' بہر حال مقدمے کے بعد کتاب کو تین طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے۔طبقۂ متقدمین، طبقۂ متوسطین، طبقۂ متاخرین، اور ہر طبقے میں تین تین دور قائم کیے گئے ہیں۔

میر کے نکات الشعرا سے لے کر محمد حسین آزاد کی کتاب آب حیات تک جتنے تذکرے لکھے گئے ان میں سے اکثر تذکرے ایسے ہیں جن میں اس سے قبل لکھے گئے تذکروں کی تقلید نظر آتی ہے، اور ہر تذکرہ نگار کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان سے قبل لکھے گئے تذکرے میں جو خامیاں اور کمیاں رہ گئی ہیں انہیں دور کرے۔مولف ''گل رعنا'' نے بھی ''آب حیات'' کی تقلید کی اور اس کی تاریخی فروگزاشتوں اور کمیوں کو اپنی کتاب سے پورا کرنے اور دور کرنے کی کوشش کی ہے۔آب حیات میں جن مشہور شعرا کو نظر انداز کر دیا گیا تھا یا کسی اور وجہ سے انہیں شامل نہیں کیا گیا تھا مولوی عبدالحئی نے انہیں اپنے تذکرے میں جگہ دی

ہے۔ان کے حالات لکھے ہیں اوران کی شاعری پر نقد وتبصرہ بھی کیا ہے۔

گل رعنا کے بارے میں مولوی عبدالحق کا یہ کہنا کہ اس کتاب میں تنقید کے اعلیٰ نمونے موجود نہیں، کچھ حد تک درست معلوم ہوتا ہے۔لیکن سچ تو یہ ہے کہ مولف نے اپنی کتاب میں کہیں اس کا دعویٰ بھی نہیں کیا ہے کہ یہ کتاب تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہے،اوراس میں وہ تنقید کے ان اعلیٰ معیاروں کی پیروی کریں گے جو اس وقت تک رائج تھے۔تحقیقی اعتبار سے گل رعنا میں کچھ کمیاں ہیں لیکن اس زمانے میں اس سے زیادہ بہتر کام کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی تھی، کیوں کہ مولف کے سامنے وہ مواد نہ تھا جو ان کے اخلاف کے حصے میں آیا، ان کا سب سے بڑا ماخذ آب حیات ہے۔لیکن انہوں نے مواد کی کمی کے باوجود جس طرح اس اوّلین تاریخ کے بعض تسامحات اور عدم توازن کی نشان دہی کی ہے وہ قابل داد ہے۔

''شعرالہند'' مولانا عبدالسلام ندوی کی وہ تصنیف ہے جو ان کی زندگی اور ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جس میں اردو شاعری اوراس کی مختلف اصناف کے تاریخی و ادبی ارتقا سے بحث کی گئی ہے۔کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے۔پہلی جلد میں چار ابواب ہیں ۔ پہلے باب میں اردو شاعری کے آغاز سے بحث کی گئی ہے۔اس کے بعد قدما کا پہلا دور شروع ہوتا ہے جس میں اردو شاعری کی تجدید اور اصلاح کا ذکر ہے۔دوسرے دور میں میر تقی میؔر اور مرزا سودا کے کلام کا موازنہ کیا گیا ہے۔تیسرے دور میں لکھنوی شاعری کے آغاز پر بحث کی گئی ہے اور مصحفی و انشا کا مقابلہ کیا گیا ہے۔اس بحث کے بعد ،تلامذۂ شعرائے قدیم ،کا عنوان قائم کیا گیا ہے جس میں خان آرزو،مرزا مظہر،میر سوز،انشا،جرأت،میر حسن وغیرہ کے مختصر حالات اور ان کی شاعری کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔''متبعین شعرائے قدیم'' کا عنوان قائم کرکے اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کون کون شعرا نے کن کن شعرا کا تتبع کیا ہے۔دوسرے باب میں متوسطین کے پہلے دور کا ذکر ہے اس کی ابتدا شیخ ناسخ سے ہوتی ہے۔اس میں تفصیل سے یہ بتایا گیا ہے کہ شیخ ناسخ نے زبان میں کیا کیا تبدیلیاں کیں اور اس سلسلے میں ایک آخری تبدیلی الفاظ کی ہے جس کی ایک طویل فہرست ''جلوۂ خضر'' سے نقل کی گئی ہے۔اس کے بعد ''اردو شاعری کے دو مختلف اسکول'' کے تحت دلّی اور لکھنؤ کی خصوصیات کلام تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔

شعرالہند اردو کی ان کتابوں میں سے ہے جس کے بارے میں آج تک یہ حتمی فیصلہ نہیں کیا جاسکا کہ یہ

'تذکرہ' ہے، یا 'تنقید'۔اسم با مسمیٰ ہے یا بے مسمیٰ ؟اس کو تحقیق سے کوئی نسبت ہے یا نہیں؟اس کی ادبی قدر و قیمت ہے یا تاریخی ،اگرادبی قدر و قیمت ہے تو کیا ہے؟ یا اگر تاریخی قدر و قیمت کی حامل ہے تو اس کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ بعض ناقدین اسے محنت و مشقت سے لکھی ہوئی ایک کتاب سمجھتے ہیں اور بعض اسے دوسروں کے اقوال وآرا کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔وہ حضرات جو اس تنقید و تنقیص میں سب سے آگے ہیں ان میں مولوی عبد الحق ،نصیر الدین ہاشمی، نیاز فتح پوری اور کلیم الدین احمد کے نام خصوصاً لیے جا سکتے ہیں۔ان سب کے اعتراضات مختلف قسم کے ہیں ،لیکن ایک عام اعترض یہ ہے کہ شعرالہند میں ''جلوۂ خضر''،''نکات الشعرا''،''آب حیات''،''مقدمہ شعروشاعری''،''شعرالعجم'' کے اس کثرت سے اقتباسات دیے گئے ہیں کہ خود مولانا کی رائے کہیں پر بھی نہیں آسکی ہے،اور گر کوئی رائے حقیقی معلوم ہوتی ہے تو غور وفکر سے پتا چلتا ہے کہ وہ کسی پیش رو کی رائے کی تلخیص ہے۔بہر حال ان اعتراضات سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شعرالہند ان تمام ناقدین کی توجہ کا مرکز بنی رہی تھی اور آج بھی ہے جو ادبیات کو جدید فلسفہ،سماجیات اور نفسیات کے آلے سے جانچتے، پرکھتے ہیں۔اس کا بہت واضح مطلب ہے کہ شعرالہند سے اپنے تمام تر اختلافات کے باوجود یہ ناقدین حضرات اس سے صرف نظر نہیں کر سکتے ،اور جس کتاب سے ناقدین کا بہت بڑا اگروہ صرف نظر نہ کر سکے تو اس کتاب کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے۔

باب چہارم ''اردو ادب کی مختصر تاریخوں سے متعلق تنقید کا محاکمہ'' کے عنوان سے ہے۔رام بابو سکسینہ سے لے کر عصر حاضر تک چھوٹی بڑی مختلف قسم کی کئی ادبی تاریخیں معرض وجود میں آ چکی ہیں۔ان میں بعض ادبی تاریخیں ایسی ہیں جن میں پورے اردو ادب کا جائزہ لیا گیا ہے،اور بعض ایسی ہیں جو کسی خاص پہلو یا ایک حصے پر مشتمل ہیں۔مثلاً اصناف سے متعلق تاریخیں ،مختلف علاقوں کے اردو ادب کے جائزے پرمبنی تاریخیں،اسی طرح مختلف ادوار، رجحانات یا تحریکات سے متعلق تاریخیں وغیرہ۔چوں کہ میرے تحقیقی مقالے کا موضوع اردو ادب کی مختصر تاریخ کے جائزے پرمبنی ہے اس لیے زیر بحث باب میں صرف ان نمائندہ ادبی تاریخوں کو شامل کیا گیا ہے جن میں خاصی حد تک تاریخی تسلسل کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے،اور ادب کے دونوں پہلوؤں یعنی شاعری اور نثر کو مساوی اہمیت دے کر ان کا اجتماعی جائزہ لیا گیا ہے۔لہٰذا اس باب میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل ہیں۔

تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ

اے ہسٹری آف اردو لٹریچر۔ گراہم بیلی

مختصر تاریخ ادب اردو۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین

اردو ادب کی تاریخ۔نسیم قریشی

اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ۔ ڈاکٹر سلیم اختر

اردو ادب کی مختصر تاریخ ۔ ڈاکٹر انور سدید

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ ۔سید احتشام حسین

تاریخ ادب اردو(ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد)

رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب پہلی ایسی کتاب ہے جسے ناقدین نے باضابطہ ادبی تاریخ کہا ہے۔ یہ کتاب رام بابو سکسینہ نے انگریزی زبان میں ''اے ہسٹری آف اردو لٹریچر'' کے نام سے لکھی تھی، جو پہلی بار رام نرائن لال پریس۔الہ آباد سے ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔ دو سال بعد ۱۹۲۹ء میں اس کتاب کا اردو ترجمہ مرزا محمد عسکری نے کیا اور ترجمہ نول کشور پریس سے اسی سال شائع ہوا۔ آغا محمد باقر نے ۱۹۳۳ء مذکورہ کتاب کی تلخیص کی جو'' تاریخ نظم ونثر اردو'' کے نام سے شیخ مبارک علی شنز، لاہور سے شائع ہوئی۔

رام بابو سکسینہ کی انگریزی کتاب کے ترجمے اور تلخیص کی اشاعت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع، مواد، مواد کی ترتیب و پیش کش اور تنقیدی نوٹ کے اعتبار سے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔اس کتاب میں پہلی بار نظم اور نثر دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ رام بابو سکسینہ نے تمہید میں جو دعویٰ کیا ہے کہ یہ تاریخ مکمل طور پر ادبی تاریخ کے اصول وضوابط پر پوری اترتی ہے اور اس میں محض کسی زمانے کے واقعات کا ایک ذخیرہ نہیں، بلکہ ان خیالات وخصوصیات کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کا اثر اس زمانے پر تھا۔ان کا یہ دعویٰ کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں۔ یہ تاریخ آب حیات سے قدرے بہتر ضرور ہے ،مگر اس میں زیادہ زور سوانحی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے اسے پرکھنے پر دیا گیا اور ان کی تقسیم بھی غیر سنجیدہ ہے۔ کہیں زمانے کو ملحوظ رکھا ہے تو کہیں علاقے کو۔اس کے علاوہ اس میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ہر دور کی شاعری اور نثر کا ذکر یکجا نہیں کیا گیا ہے بلکہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ایک حصہ شاعری کی

تاریخ پر اور دوسرا حصہ نثر کی تاریخ پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ کتاب میں کچھ خامیاں بھی ہیں جن کی نشان دہی بزرگ محقق ڈاکٹر مختار الدین آرزو نے اپنے ایک پر از معلومات تحقیقی و تنقیدی مقالے ''تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ'' مشمولہ ادبی دنیا، لاہور بابت دسمبر ۱۹۴۰ء میں کی ہے۔اس طویل مقالے کے پہلے حصے میں ڈاکٹر آرزو نے ان اغلاط سے بحث کی ہے جو کتاب پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی کھٹکنے لگتی ہیں ۔انہوں نے صرف اغلاط کی نشان دہی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی تصحیح بھی کی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مجموعی حیثیت سے آج جب اس کتاب کو دیکھا جائے تو اس کے اندر وہ تمام چیزیں نظر آتی ہیں جو ایک ادیب کی معلومات کے لیے سرمایۂ ناز ہیں۔

گراہم بیلی کی تاریخ ''اے ہسٹری آف اردو لٹریچر'' انگریزی زبان میں تاریخ ادب اردو کے ضمن میں پہلی کوشش ہے، اور اولین کوشش کے حوالے سے اس کتاب کی اہمیت بذات خود بڑھ جاتی ہے۔گراہم بیلی کے علاوہ دوسرے مستشرقین نے بھی مختلف شعرا و ادبا پر مضامین لکھے ہیں جن کے ذریعے اردو کے قارئین جدید ادبی تاریخ کے تصور سے متعارف ہوئے، مگر گراہم بیلی کا شمار ان چند مستشرقین میں کیا جاتا ہے جنہوں نے پوری ایمان داری کے ساتھ برصغیر کے ادب، لسانیات اور بالخصوص اس کی تاریخ کو اپنی زبان میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔''اے ہسٹری آف اردو لٹریچر'' اسی نوعیت کی ایک تصنیف ہے، جس کی تاریخی اہمیت آج بھی برقرار ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۹۳۲ء میں منظر عام پر آئی ۔اس کتاب کا اردو ترجمہ اردو ادب کی تاریخ کے نام سے ۱۹۹۳ء میں ترقی اردو بیورو، دہلی سے شائع ہوا، جس کے مترجم و مرتب سید محمد عصیم ہیں۔ جائزے کے لیے میرے پیش نظر یہی کتاب رہی۔

بیلی کی یہ تاریخ انتہائی مختصر ہے اور اس کے مختصر ہونے کی وجہ اس کتاب کے مترجم اپنے مقدمے میں یہ بیان کرتے ہیں کہ گراہم بیلی نے یہ کتاب آکسفورڈ پریس کی ''ہیری ٹیج آف انڈیا سیریز'' کے لیے لکھی تھی، چوں کہ اس سلسلے کے تحت اختصار پر ترجیح دی جاتی تھی، اس لیے گراہم بیلی نے اردو زبان و ادب کی تاریخ کو ایک سو بیس صفحات میں محدود کر دیا۔ظاہر ہے کہ اتنے کم صفحات میں اردو ادب کی تقریباً چھ سو سالہ تاریخ اور روایت کے ایک طویل تسلسل کا احاطہ کر لینا ناممکن نہیں مگر مشکل ضرور ہے۔اسی اختصار کی وجہ سے بیلی کی تاریخ کو چشم کم سے دیکھا گیا، لیکن اس کی کثرت مواد کو دیکھا جائے تو یہ دو، تین سو صفحوں کی

کتاب سے کم نہیں۔

سید اعجاز حسین کی کتاب ''مختصر تاریخ ادب اردو'' خاص طور پر طلبا کی ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی۔لیکن ان کی دقیق بینی نے سہل انگاری کی راہ سے انہیں دور رکھا۔انہوں نے مختصر،مگر جامع انداز میں مختلف ادوار کی تقسیم کر کے سماجی و سیاسی محرکات اور شاعری کے محاسن پر روشنی ڈالی ہے۔اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں منظر عام پر آیا۔بعدازاں کتاب کی مقبولیت کے سبب اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔اس کتاب کی ترتیب تقریباً وہی ہے جو رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب کی تھی۔مثلاً نظیر اکبرآبادی کے لیے الگ باب مختص کرنا ،ناول،صحافت اور تنقید وغیرہ کے عنوانات قائم کرنا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری ترتیب رام بابو سکسینہ کے زیر اثر تشکیل پائی۔بہر حال اعجاز حسین کی تاریخ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ترمیم شدہ ۱۹۶۴ء والے ادیشن میں اس وقت تک کے اکثر مشہور شاعروں اور نثر نگاروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔اسی وجہ سے اس کتاب کی اہمیت وافادیت اس دور میں چھپنے والی دوسری تاریخی کتابوں سے زیادہ ہے۔

نسیم قریشی کی کتاب ''اردو ادب کی تاریخ'' کا پہلا ایڈیشن آزاد کتاب گھر،کلاں محل دہلی سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔بعد میں اس کی اشاعت کی ذمہ داری فرینڈس بک ڈپو،علی گڑھ نے سنبھالی۔ کتاب کی ابتدا میں چند سطروں کا دیباچہ ہے جس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ''یہ کتاب خاص طور پر طالب علموں کی ضرورت کو نگاہ میں رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔'' یہی وجہ ہے کہ اس مختصر تاریخ میں نہ ادبی رجحانات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی اور نہ تمام قابل لحاظ ارباب فن کا تذکرہ ہے۔یہ تاریخ ادب ۱۹۵۵ء میں نصابی ضروریات کے لیے یقیناً کافی رہی ہوگی،مگر آج کے دور میں یہ نصابی ضروریات کو بھی پورا نہیں کر سکتی۔اس تاریخ کا انداز تذکروں جیسا ہے،یعنی شاعر یا نثر نگار کے نام کے بعد مختصراً ان کے کام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔کسی ادیب یا شاعر کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا ہے،اور نہ ہی کسی کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔البتہ کہیں کہیں مصنف نے ادوار پر مجموعی تبصرہ کرتے ہوئے اس دور کے سیاسی وسماجی پس منظر کو مدنظر رکھا ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب تاریخ ادب کے زمرے میں شامل ہو جاتی ہے،لیکن محققین کے لیے یہ تاریخ کسی نوعیت کے اضافے کا باعث نہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کا پہلا ایڈیشن ستمبر ۱۹۷۱ء میں سنگ میل

پبلی کیشنز اردو بازار ،لاہور سے شائع ہوا۔اس کے بعد تقریباً بارہ ایڈیشن اسی ادارے سے شائع ہوئے ،اور ہر ایڈیشن میں مصنف کچھ حذف واضافہ کرتے رہے۔اس کا آخری ایڈیشن سنگ میل پبلی کیشنز سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔اس ایڈیشن کے بعد مصنف نے اپنی کتاب میں کوئی ترمیم و اضافہ نہیں کیا۔ چنانچہ اس آخری ایڈیشن کے بعد پچھلے تمام ایڈیشن غیر اہم ہو جاتے ہیں۔تبصرے کے لیے میرے پیش نظر یہی آخری ایڈیشن ہے جو کتابی دنیا، دہلی سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔اس تاریخ کا خاکہ روایتی تاریخوں سے تھوڑا مختلف ہے۔ پہلے پانچ ابواب تمہید کے طور پر ہیں جن میں لسانی مباحث کا جائزہ اور اصناف کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ جب کہ چھٹے باب سے مصنف اپنی سہولت کے مطابق تقسیم کر کے اردو ادب کے باقاعدہ جائزے کا آغاز کیا ہے،جس میں ادوار بھی ہیں، جیسے جنوبی ہند میں اردو ادب،شمالی ہند میں اردو ادب،علاقائی رنگ بھی ہے جیسے لکھنؤ کا دبستان شاعری، دہلی کے نامور شعرا، پاکستان میں اردو ادب وغیرہ۔تحریکیں بھی ہیں جیسے سرسید تحریک،ترقی پسند ادب کی تحریک،اسی طرح اصناف کا ذکر مثلاً اردو نثر کا ظہور، داستاں سرائی (جس میں تمام مشہور و معروف داستانوں کا ذکر ہے۔) مرثیہ عہد بہ عہد وغیرہ۔ یوں چار صدیوں کی پوری تاریخ کو مختلف حصوں میں بانٹ کر سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ کتاب مقبول عام ہونے کے ساتھ ساتھ بقول مصنف متنازع تاریخ بھی رہی ہے۔اس میں جہاں ابتدائی ادوار کا جائزہ لیا گیا ہے وہیں معاصر ادب کا بھی مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے،اور غالباً یہی وجہ کتاب کے متنازع ہونے کی رہی۔ معاصر ادب اور ادبی رویوں پر لکھنا یوں بھی مشکل کام ہے، بلکہ ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔اس لیے وہ خود کو داد کا مستحق سمجھتے ہیں۔انھوں نے بڑی جرأت و ہمت سے اس مشکل کام کو سرانجام دیا ہے۔اس سے پہلے لکھی جانے والی تمام تاریخیں صرف کلاسیکی ادب کے جائزے پر مبنی ہیں،اور سبھی تاریخ نگاروں نے معاصر ادب کا بھاری بھر کم بوجھ دیکھ کر چھوڑنے دینے میں ہی عافیت محسوس کی۔مگر یہ بوجھ کسی نہ کسی کو تو اٹھانا ہی تھا،اور اس کی ابتدا سلیم اختر نے کی۔اس کتاب میں کچھ کمیاں اور خامیاں بھی ہیں،مگر ان کی وجہ سے کتاب کی اہمیت و افادیت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' پہلی بار مقتدرہ قومی زبان ،اسلام آباد سے

۱۹۹۱ء میں شائع ہوئی۔اس کے بعد اس کتاب کے کئی اور ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔میرے پیش نظر اس کتاب کا پہلا ایڈیشن رہا ہے، جسے سامنے رکھ کر کتاب کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔کتاب ۱۳/ابواب پر مشتمل ہے اور یہ تمام ابواب زیادہ تر زمانی دور کے مطابق ہیں۔مورخ ادب کے ساتھ بڑا مسئلہ یہ رہا ہے کہ تاریخ کے ابواب دور کے اعتبار سے دیئے جائیں ،تحریکات یا رجحانات کے اعتبار سے دیئے جائیں یا اصناف کے اعتبار سے۔ان میں سے کسی ایک کو ملحوظ خاطر رکھیں تو دوسرے تقاضے مسخ ہو جاتے ہیں۔زیر بحث تاریخ میں مصنف نے زمانی تسلسل کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے،مگر ہر زمانی دور میں انہوں نے جو تقسیم کی ہے اس میں کہیں رجحانات ،کہیں تحریکات اور کہیں اصناف کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔یوں ایک زمانی دور میں موجود اصناف اور ان کے حوالے سے مشہور افراد کا جائزہ سامنے آجاتا ہے۔اس کتاب میں جہاں چند خامیاں ہیں وہیں کچھ خوبیاں بھی ہیں۔مثلاً انور سدید کسی دور، واقعہ یا شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں تو ساتھ ہی اس پر اپنی رائے یا تبصرہ بھی پیش کرتے ہیں،جس سے کسی بھی واقعے یا ادوار کو سمجھنے میں قارئین کو مدد ملتی ہے۔کتاب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں معاصر ادب پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے جس کا فائدہ یہ ہے کہ آئندہ مورخین کے لیے سماجی حالات میں نئی تاریخ رقم کرنے کے لیے اچھے خاصے مواد مل جائیں گے۔

''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' یہ کتاب سید احتشام کی وفات (۱۹۷۲ء) سے قبل تیار ہوچکی تھی،لیکن اس کی اشاعت ان کی وفات کے دس سال بعد ہوئی۔اس کا پہلا ایڈیشن ترقی اردو بیورو، دہلی نے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا،اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۸ء میں۔مزید دو اور ایڈیشن اس ادارے سے شائع ہوئے۔۲۰۰۴ء میں اس کا پانچواں ایڈیشن قومی کونسل سے شائع ہوا۔۲۰۱۱ء میں اس کا آٹھواں ایڈیشن اسی ادارے سے شائع ہوا،اور جائزے کے لیے یہی ایڈیشن میرے پیش نظر ہے۔کتاب چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔جس میں مختلف عنوانات کے تحت مصنف نے اردو زبان و ادب کی ابتدائی تاریخ ،شمالی و جنوبی ہند کے سماجی ،سیاسی ،تاریخی اور ادبی حالات کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔

یہ کتاب دیگر ادبی تاریخوں سے کافی حد تک مختلف ہے۔اگر چہ کتاب کا خاکہ،ابواب کی تقسیم روایتی تاریخوں کے مطابق ہے،مگر حالات و واقعات کا بیان اور ان کے نتائج روایتی تاریخوں سے خاصے الگ ہیں۔احتشام حسین نے حالات و واقعات کو بیان کرنے میں سادہ بیانی کے بجائے تنقیدی انداز اپناتے

ہوئے ادبی تخلیقات پر سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے اثرات کو بیان کیا ہے۔اس کتاب کے مختلف ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ موضوع کے اعتبار سے یہ تنقیدی تاریخ ہے اوراس میں پہلے سے معلوم تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے۔لہٰذااس میں کسی نئی معلومات یا گمشدہ کڑیوں کا سراغ نہیں ملتا۔

پانچواں باب ''اردو ادب کی طویل تاریخوں سے متعلق تنقید کا محاسبہ'' کے عنوان سے ہے۔اردو میں زبان وداب کی تاریخ کی ایک درجن سے زائد کتابیں لکھی گئی ہیں۔رام بابوسکسینہ سے لے کرڈاکٹرتبسم کاشمیری تک جوتاریخیں لکھی گئی ہیں وہ زبان وادب کی تاریخ کوسمجھنے میں بڑی معاون ہیں۔بعض مورخین نے طلبا کے معیار ومزاج کے مطابق مختصرادوار کی تاریخیں لکھی ہیں تو بعض نے مفصل۔پچھلے باب میں اردو ادب کی مختصرتاریخوں سے متعلق تنقید کا محاکمہ کیا گیا تھا۔اس باب میں اردوادب کی طویل تاریخی کتابوں کا محاسبہ بہ اعتبار سنین پیش کیا گیا ہے۔یوں تو اردوادب کی طویل تاریخوں کی بھی ایک طویل فہرست ہے،مگر اس باب میں ان سب کا احاطہ ممکن نہیں،ان میں سے چند اہم ادبی تاریخیں مثلاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیراہتمام شائع ہونے والی ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اردو'' (مکمل جلدیں) پروفیسر سیدہ جعفرو پروفیسر گیان چند جین کی ''تاریخ ادب اردو۱۷۰۰ءتک'' (مکمل جلدیں) اور ڈاکٹرتبسم کاشمیری کی ''اردوادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ءتک'' اس باب میں شامل ہیں،جن کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔

''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' کی پہلی جلد ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔اس تاریخ میں کل سات باب ہیں،جن میں ۱۲۰۰ء سے لے کر۱۷۰۰ءتک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔کتاب کے آغاز میں پروفیسر آل احمد سرور کی تحریر کردہ تمہید ہے،جس میں وہ تاریخ ادب کے مکمل منصوبے کی تفصیلات بیان کرتے ہیں۔اس تمہید کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۹۵۵ء میں شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کو ''تاریخ ادب اردو'' تحریر کرنے کا ایک منصوبہ بھیجا جو ۱۹۵۶ء میں منظور ہو گیا اوراس کے لیے معقول رقم عطا کی گئی۔ مارچ ۱۹۵۷ء میں ایک کمیٹی بلا کر پانچ جلدوں کی اسکیم بنائی گئی اوراس کے مختلف ابواب،مختلف مشاہیر ادب کے سپرد کیے گئے۔اس وقت کے صدر شعبہ رشید احمد صدیقی ڈائرکٹر اور نذیر احمد اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھے۔یکم مئی ۱۹۵۸ءکو رشید احمد صدیقی کی سبک دوشی کے بعد آل احمد سرور صدر شعبہ اوراسکیم کے ڈائرکٹر

مقرر ہوئے۔اگست ۱۹۵۸ء میں نذیر احمد اپنا کام انجام دے کر اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے عہدے سے الگ ہو گئے۔نومبر ۱۹۵۸ء میں مجنوں گورکھ پوری اس اسکیم کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ یہ تاریخ ایک ضخیم منصوبے کا حصہ تھی، جو بہت سی وجوہ کی بنا پر مکمل نہیں ہوسکی، اور اس پہلی جلد کو بھی رشید حسن خاں کے جارحانہ تبصرے کی وجہ سے مارکیٹ سے اٹھالیا گیا۔ یہ کتاب ایک مصنف کا کارنامہ نہیں بلکہ اس کے اجزا مختلف ماہرین نے لکھے ہیں۔تحقیق میں اختلاف رائے جائز ہے۔ایک محقق کسی واقعے کا جو سنہ قرار دیتا ہے دوسرے کی رائے میں کوئی اور سنہ درست ہوسکتا ہے۔ ہر باب یا جز کے ساتھ اس کے مصنف کا نام درج ہے ۔اس کے ہر بیان کی ذمہ داری اس کے مصنف پر ہے۔اگر ڈائرکٹر یا اسسٹنٹ ڈائرکٹر مضمون نگار کی تحریر میں ترمیم کرتے تو وہ تحریف قرار دی جاتی۔قاری کو آزادی ہے کہ وہ کسی سنہ وفات کے بارے میں دو مضمون نگاروں کی دی ہوئی مختلف تاریخوں میں سے جسے چاہے قبول کرے۔البتہ ادارے کے ذمہ داروں کو چاہیے تھا کہ اختلافی بیانات کے نیچے فٹ نوٹ میں اپنی رائے دے کر آخر میں صراحت کر دیتے۔

''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' تقریباً ۴۰ سال قبل شائع ہوئی تھی۔لہٰذا اس میں اپنے دور تک کی ہی معلومات شامل ہوں گی جو یقیناً اب اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد نئی معلومات کی روشنی میں اپنی حیثیت و اہمیت کھو بیٹھی ہے۔اس لیے اسے آج سے تقریباً ۴۰ سال پرانے معیار کی روشنی میں ہی پرکھنا چاہیے اور اس میں درآئے تسامحات کی سخت گرفت نہیں کرنی چاہیے۔کتاب میں جو غلطیاں طباعت کی تھیں ،انہیں بھی رشید حسن خاں نے محققین کے نامۂ اعمال میں درج کر دیا۔ بہر حال اس تاریخ کو بازار سے اٹھا لینے کے بجائے بہتر ہوتا کہ اس کے اگلے ایڈیشن میں وہ تمام خامیاں دور کر دی جاتیں تا کہ تاریخ ادب کے قارئین اس سے استفادہ کر سکتے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی ''تاریخ ادب اردو'' چار جلدوں پر مشتمل ہے۔اس باب میں چاروں جلدوں کا باری باری جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اس تاریخ کی پہلی جلد جو آغاز سے لے کر ۱۷۵۰ء تک کے قدیم ادب کے جائزے پر مبنی ہے، پہلی مرتبہ ۱۹۷۵ء میں مجلس ترقی ادب اردو، لاہور سے شائع ہوئی، اور یہی جلد ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ،دہلی سے پہلی مرتبہ ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔جلد دوم ۱۹۸۲ء میں ،جلد سوم ۲۰۰۶ء میں مجلس ترقی ادب، لاہور سے شائع ہوئی۔جلد چہارم انیسویں صدی کے نصف آخر کے جائزے

پر مبنی ہے۔ یہ جلد دو حصوں میں پہلی مرتبہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی سے شائع ہوئی۔

ان جلدوں کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے ڈاکٹر جمیل جالبی کے علم وفضل، دیدہ ریزی اور محنت ولگن کا جو احساس ہوتا ہے وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ جو کام بڑے بڑے ادارے، انجمن اور بورڈ نہیں کر پائے جمیل جالبی نے وہ کام تن تنہا سرانجام دیا ہے۔ اس کام کے لیے انہیں کن دشوار مراحل سے گزرنا پڑا اس کی تفصیل انہوں نے پہلی جلد کے پیش لفظ میں بیان کی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی تاریخ میں صرف سیاسی پس منظر یا ادبی پس منظر بیان نہیں کرتے بلکہ ہر دور کا سیا سی، تہذیبی، معاشرتی پس منظر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی پس منظر پر بھی اظہار خیال کرتے ہیں۔ کسی دور کے ادب پر اس دور کے سیاسی، معاشرتی حالات و واقعات کے کیا اثرات مرتب ہوئے اس کا بیان جمیل جالبی بڑی وضاحت سے کرتے ہیں۔ انہوں نے تاریخ لکھنے کے طریق کار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نے بہت سے مخطوطات اور نایاب کتابوں کی تلاش و تحقیق کے بعد شعرا وا دبا کا تعارف پیش کیا ہے۔ اس تلاش وجستجو کے بعد ہی یہ ممکن ہو سکا ہے کہ وہ درست اور غلط روایات میں امتیاز بر قرار رکھنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ ساتھ ہی عہد پارینہ کے ادبی فن پاروں کے تعارف وتبصرے میں گہری تنقیدی بصیرت کی مدد سے اس فن پارے اور اس کے تخلیق کار کے مزاج وآہنگ کو پیش کرتے ہیں اور اس دور کی شعری روایت کا تفصیلی جائزہ بھی لیتے ہیں۔ جالبی کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بالعموم تقابلی جائزہ لینا پسند کرتے ہیں۔ مختلف شعرا وادبا کے اسلوب اور فن پاروں کی فنی ولسانی خصوصیات کا ایک دوسرے سے مقابلہ کر کے ان کی مشترک خصوصیات، اختلافات اور اہمیت بیان کرتے ہیں، جس کی وجہ سے پوری صورت حال سامنے آجاتی ہے، اور ادبی روایت میں ان کی قدر وقیمت کا تعین آسان ہو جاتا ہے۔ یہ خصوصیت دیگر ادبی تاریخوں میں موجود نہیں ہے۔

یہ مفصل، مکمل اور مستند تاریخ فرد واحد کی کامیاب کوشش کا بہترین نتیجہ ہے۔ ایسی ضخیم اور مستند تاریخ کئی سالوں کی محنت شاقہ کے بعد اور کئی لوگوں کی مدد سے تشکیل پاتی ہے، لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ جمیل جالبی نے تن تنہا اس مشکل امر کو انجام دیا ہے۔ اس تاریخ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے حتی الامکان اصل ماخذ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اصل متون اور مخطوطے تلاش کر کے ان سے

معلومات حاصل کیں اوران سے اپنی تاریخ کو معتبر بنایا ہے۔ بقول ڈاکٹر گیان چند جین کوئی محقق ایسا نہ ہوگا جسے اس کے مطالعے سے متعدد نئی معلومات نہ ملیں، کوئی نقاد ایسا نہ ہوگا جسے اس کے تنقیدی بیانات سے رہبری وروشنی نہ ملے۔

پانچ جلدوں پر مشتمل ''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک'' دو مورخین یعنی پروفیسر سیدہ جعفر اور پروفیسر گیان چند جین کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے جو ۱۹۹۸ء میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔ اس تاریخ میں بظاہر بارہ ابواب ہیں اوران بارہ ابواب میں اردو کے آغاز سے لے کر ۱۷۰۰ء تک کے ادب کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ابرار عبدالسلام نے اپنے طویل مقالے ''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک ...... تحقیق کے آئینے میں'' مذکورہ مصنفین کی تاریخ کی پانچوں جلدوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اوراس میں موجود تحقیقی تضادات، غلط منصوبات، تحقیقی تسامحات اور سنین کے اغلاط کی نشان دہی اور تصحیح کی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے صرف پہلی جلد سے سنین کے اغلاط کی ۱۳۶ مثالیں پیش کی ہیں۔ علاوہ ازیں سینکڑوں تحقیقی تسامحات، تضادات، متنی اور تاریخی اغلاط کی بھی نشان دہی کی ہے۔

زیر بحث تاریخ کے ہر باب کے ابتدا میں سیاسی، سماجی اور ادبی پس منظر بیان کیا گیا ہے، کہیں کہیں یہ پس منظر بہت طویل ہوگیا ہے جو ایک تاریخی کتاب کے حسب حال نہیں، مگر اس سے اس دور کے ماحول بالخصوص دکنی ماحول اور ادب کو سمجھنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر سیدہ جعفر جہاں ادبی پس منظر بیان کرتی ہیں وہیں ادبی روایات کا ذکر بھی تفصیل سے کرتی ہیں جس سے سارا ادبی ماحول سامنے آجاتا ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحبہ کا اسلوب بھی منطقی اور سلجھا ہوا ہے۔ وہ اپنی بات بہت ہی سادہ اور دل نشیں انداز میں پیش کرتی ہیں جس سے قاری کو ان کی بات سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آتی۔ وہ تاریخی مغالطوں کو ٹھوس دلائل کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کرتی ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں تحقیق کا ذوق بھی ہے اور شوق بھی، اور یہی ذوق وشوق کتاب کی اہمیت افادیت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ''اردو ادب کی تاریخ: ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک'' پہلی مرتبہ ۲۰۰۳ء میں سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کا پہلا ہندوستانی ایڈیشن ۲۰۰۶ء میں ایم.آر پبلی کیشنز، نئی دہلی سے

شائع ہوا۔ تین سال کے وقفے کے بعد ۲۰۰۹ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن ایم .آر پبلی کیشنز سے ہی شائع ہوا۔ راقم کے پیش نظر یہی تیسرا ایڈیشن ہے۔ یہ کتاب ۸۹۲صفحات اور ۱۹/ ابواب پر مشتمل ہے جو تقریباً ساڑھے آٹھ سو سالہ ادوار کو محیط ہے۔ ابتدا میں پیش لفظ ہے جس میں اردو زبان و ادب کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز بیسویں صدی میں تاریخ نگاری میں جو تبدیلیاں رونماں ہوئی ہیں اس بابت بھی اہم گفتگو کی گئی ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی یہ تاریخی کتاب اپنی نوعیت کی ایک منفرد کتاب ہے۔ اس میں روایتی تواریخ ادب کا رنگ بہت کم ملتا ہے۔ البتہ ابواب بندی میں یہ کتاب اپنے ماقبل لکھی گئی تاریخی کتابوں جیسی ہی ہے۔ مگر ان ابواب کے بیان کا انداز جداگانہ ہے۔ اس تاریخ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تاریخ کے زمانی تسلسل کو مختلف ادوار کی اکائیوں میں تقسیم نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ ایک خاص ترتیب و تنظیم اس کی خاکہ بندی میں بروئے کار لائی گئی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی شاعر یا اس کے فن پارے کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس سے متعلق تفصیل سے یہ معلومات فراہم کرتے ہیں کہ وہ کب منظر عام پر آیا اور کس محقق کی تلاش و جستجو کا نتیجہ ہے اور تنقید ادب میں اس کا کیا مقام ہے۔ علاوہ ازیں کسی شاعر یا ادیب کا مرتبہ متعین کرتے ہوئے اس کے متعلق پہلے سے موجود معلومات و آرا کا بھی تنقیدی جائزہ لیتے ہیں اور ساتھ ہی اپنی ذاتی رائے بھی دیتے ہیں جو حسب حال ہوتی ہے۔ اکیسویں صدی کے ادب کے لیے یہ تاریخ اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر قابل قدر ہے جس سے ہر قاری کے علم میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوگا۔

مختصر یہ کہ ادبی تاریخ کو نہ محض ادبی فن پاروں کی جمالیاتی کیفیت یا سوانحات کا مجموعہ ہونا چاہیے نہ تنقیدی مضامین کا، اور نہ یہ صرف بدلتے ہوئے مذاق سخن کی دستاویز ہو، بلکہ اسے ایک فعال اور متحرک فن کی داستان ہونی چاہیے۔ اس بے جان چیز میں روح ڈالنے کے لیے مورخ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ زبان و ادب کی نشو و نما کے ساتھ ان کے پیچھے بدلتے ہوئے حالات و محرکات بھی پیش کرے۔ ادب میں کسی تخلیق یا تخلیق کار کا مقام متعین کرنا چاہے تو اس کے ثقافتی اور تہذیبی پس منظر کو سامنے رکھ کر تجزیہ کرے اور یہ دیکھنے کی کوشش کرے کہ مختلف سیاسی، سماجی، تہذیبی یا علمی اداروں نے تخلیق کار یا اس کی تخلیق پر کیا اثر ڈالا ہے۔ مورخ اگر بیسویں یا انیسویں صدی کی تاریخ لکھ رہا ہے تو اسے نہ صرف متعلقہ دور بلکہ اس سے

پہلے ادوار کی تمام تر ادبی، سیاسی، سماجی اقدار کے بارے میں معلومات ہونی چاہیے۔ یعنی ان ادوار کے سماجی و معاشی حالات کیا تھے؟ ان مختلف ادوار میں مختلف اصناف کی اہمیت کیا تھی۔ اسی طرح یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ مورخ بھی اپنے دور، اپنے ماحول اور اپنے سماج کے رجحانات سے متاثر ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو غیر جانب دار رکھنے کی لاکھ کوشش کرے مگر ادیب اور اس کی تحقیق کی معیار بندی میں وہ اپنے دور کے رجحانات اور نظریات سے متاثر ہوکر ہی تاریخ لکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی تاریخ کا مطالعہ کرتے وقت ہم ایک ساتھ کئی دور کے ذہنوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس میں ایک دور تو وہ ہے جس کی تاریخ بیان کی جارہی ہے اور جس کے ادبی کارناموں اور ادبی زبان و بیان میں اس کے ذہن اور اس کے دور کی عکاسی ہوتی ہے۔ دوسرا دور مورخ کی تاریخ بیان کررہا ہے۔ مورخ کی پسند ناپسند، اس کے اپنے دور اور معاشرہ کی سوچ، زبان و اصطلاحات کی عکاسی اس کی تاریخ کے آئینے میں ہوتی ہے۔ مورخ کے دور میں کن اقدار کو زیادہ اہمیت حاصل ہے، وہ کن شاعروں اور نثر نگاروں کو زیادہ پسند کرتا ہے اور کیوں؟ ادبی تاریخ انہیں سوالوں کا جواب خوبصورت اور مربوط انداز میں پیش کرتی ہے۔ ہمارے کئی اہم مورخین نے ادبی تاریخ نویسی کے تقاضوں کو حسن و خوبی کے ساتھ پورا کیا ہے۔

○

آماخذ ومصادر

(الف) کتب

نام کتاب	مصنف/مرتب/مترجم	ناشر/مطبع	سنہ اشاعت
آب حیات کا تنقیدی مطالعہ	سید مسعود حسن رضوی ادیب	کتاب نگر، دین دیال روڈ لکھنؤ	۱۹۵۳ء
آب حیات کی حمایت میں اور دوسرے مضامین، ڈاکٹر محمد صادق		مجلس ترقی ادب لاہور	۱۹۷۳ء
آب حیات	محمد حسین آزاد	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۲۰۰۳ء
آب حیات	مرتبہ: ڈاکٹر ابرار عبدالسلام	بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان	۲۰۰۶ء
آزاد بحیثیت محقق	قاضی عبدالودود	ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ	۱۹۸۴ء
ادب کا مقصد	نورالحسن ہاشمی	ہندوستانی کتاب گھر، لکھنؤ	۱۹۵۶ء
ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ	رشید حسن خاں	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۲۰۰۵ء
ادبی تحقیق	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۱۹۹۴ء
ارباب نثر اردو	سید محمد، مرتبہ: رحیل صدیقی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	۲۰۱۱ء
اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک	ڈاکٹر تبسم کاشمیری	ایم. آر. پبلی کیشنز، نئی دہلی	۲۰۰۹ء
اردو ادب کی تاریخ	نسیم قریشی	فرینڈس بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۸۷ء
اردو ادب کی تاریخوں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر افشاں زوار		پنجاب یونیورسٹی، لاہور	۲۰۰۸ء
اردو ادب کی تاریخ	ٹی. گراہم بیلی، مترجم: سید محمد عصیم	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	۱۹۹۳ء
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	۲۰۱۱ء
اردو ادب کی مختصر تاریخ	ڈاکٹر انور سدید	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد	۱۹۹۱ء
اردو ادب میں مہدیوں کا حصہ	سید نصرت مہدی	اسٹوڈینٹس بک ہاؤز، حیدرآباد	۱۹۸۵ء
اردو تذکرہ نگاری ۱۸۳۵ء کے بعد	رئیس احمد	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی	ندارد
اردو تنقدی پر ایک نظر	پروفیسر کلیم الدین احمد	بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ	۲۰۱۰ء
اردو تنقید کا ارتقا	ڈاکٹر عبادت بریلوی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۱۷ء

اردوشعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۷۲ء
اردو کی ادبی تاریخ	عبدالقادر سروری	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدرآباد	۱۹۵۸ء
اردو کی ادبی تاریخیں	ڈاکٹر گیان چند جین	انجمن ترقی اردو، پاکستان	۲۰۰۰ء
اردو کی ادبی تاریخیں	سلمان احمد (پرویز احمد)	قیصرالادب، حیدرآباد	۱۹۹۹ء
اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۲۰۱۵ء
اردو میں تنقید	احسن فاروقی	لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ	ندارد
اردو نثر کا آغاز وارتقا	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	مجلس تحقیقات اردو، حیدرآباد	ندارد
اسلام کا نظریۂ تاریخ	محمد مظہرالدین	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور	۱۹۵۱ء
اصناف ادب	ابوالاعجاز صدیقی	سنگت پبلشر، لاہور	۲۰۱۲ء
الفاروق (حصّہ اوّل)	علامہ شبلی نعمانی	دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۱۸۹۸ء
امیر خسرو دہلوی	ممتاز حسین	پاکستان ہیرالڈ، لمیٹڈ، کراچی	۱۹۷۵ء
امیر خسرو	وحید مرزا	نیشنل امیر خسرو سوسائٹی، ایوان غالب، دہلی	۲۰۰۷ء
انتخاب حاتم	مرتبہ: پروفیسر عبدالحق	جمال پرنٹنگ پریس، دہلی	۱۹۷۷ء
اندازنظر (تحقیقی وتنقیدی مضامین)	پروفیسر شہاب الدین ثاقبؔ	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	۲۰۱۵ء
انشاءاللہ خاں انشاؔ	عابد پشاوری	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۷۵ء
باغ و بہار	میرامن، مرتبہ: رشید حسن خان	انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی	۱۹۹۲ء
بدلتی ہوئی تاریخ	ڈاکٹر مبارک علی	فکشن بازار، لاہور	۱۹۹۷ء
برطانوی مستشرقین اور تاریخ ادب	ڈاکٹر علی جاوید	ثمر آفسیٹ پریس، نئی دہلی	۱۹۹۲ء
برہان اقبال	محمد منور	اقبال اکیڈمی، لاہور	۱۹۸۷ء
بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا (۱۲۰۴ء تا ۱۸۵۷ء)، اختر اورینوی		قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	۲۰۱۴ء
پنجاب میں اردو	حافظ محمود شیرانی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۱۹۸۲ء
تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (جلد چہارم)، پروفیسر سیدہ جعفر و گیان چند جین		قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۱۹۹۸ء
تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (تحقیق کے آئینے میں)، ڈاکٹر ابرار عبدالسلام		ادارہ یادگار غالب، کراچی	۲۰۱۴ء
تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (جلد اوّل) پروفیسر سیدہ جعفر و گیان چند جین		قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۱۹۹۸ء
تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (جلد پنجم)، پروفیسر سیدہ جعفر و گیان چند جین		قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۱۹۹۸ء
تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (جلد سوم) پروفیسر سیدہ جعفر و گیان چند جین		قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۱۹۹۸ء

تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک (جلد دوم)	پروفیسر سیدہ جعفر و گیان چند جین	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۱۹۹۸ء
تاریخ ادب اردو (چہارم)	ڈاکٹر جمیل جالبی	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	۲۰۱۵ء
تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)	ڈاکٹر جمیل جالبی	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۹۵ء
تاریخ ادب اردو (جلد دوم)	ڈاکٹر جمیل جالبی	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۹۴ء
تاریخ ادب اردو (جلد سوم)	ڈاکٹر جمیل جالبی	مجلس ترقی ادب، لاہور	۲۰۰۸ء
تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ، مترجم: مرزا محمد عسکری	کمار بک ڈپو، پرائیویٹ لمیٹڈ، لکھنؤ	۱۹۹۹ء
تاریخ ادب اردو	شائع کردہ: ادارہ ادبیات اردو	حیدرآباد حیدرآباد	۱۹۷۲ء
تاریخ تمدن ہند	پروفیسر محمد مجیب	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۱۹۹۹ء
تاریخ کے بدلتے نظریات	ڈاکٹر مبارک علی	فکشن ہاؤس، لاہور	۱۹۹۷ء
تاریخ نگاری قدیم وجدید رجحانات	سید جمال الدین	مکتبہ جامعہ، نئی دہلی	۲۰۱۲ء
تدریس تاریخ	خلیل الرّب	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی	۲۰۱۶ء
تذکرہ شعرائے اردو	میر حسن، مرتبہ: حبیب الرحمٰن شروانی	انجمن ترقی اردو ہند، دہلی	۱۹۴۰ء
تذکرہ طبقات الشعرا	قدرت اللہ شوق، مرتبہ: نثار احمد فاروقی	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۸ء
تذکرہ گلشن ہند	مرزا علی لطف، مرتبہ: مولوی عبدالحق	کتب خانہ آصفیہ، حیدرآباد	۱۹۰۶ء
تگ وتاز	کامل قریشی	ہندوستانی ادبی سوسائٹی، دہلی	۱۹۹۳ء
تنقید کیا ہے	پروفیسر آل احمد سرور	مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر دہلی	۱۹۷۲ء
تنقیدات عبدالحق	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی	۱۹۹۳ء
جدید اردو تنقید: اصول ونظریات	پروفیسر شارب ردولوی	مطبوعہ اعلیٰ پریس، دہلی	۱۹۷۴ء
حفظ اللسان معروف بہ خالق باری	مرتبہ: حافظ محمود شیرانی	انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی	۱۹۴۴ء
حیات عبدالحئی	سید ابوالحسن علی ندوی	سید احمد شہید اکیڈمی	۲۰۰۴ء
خطبات گارساں دتاسی	مترجم وشائع کردہ: انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن		۱۹۳۵ء
خواب باقی ہیں	پروفیسر آل احمد سرور	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۱ء
داستان تاریخ اردو	مولفہ: حامد حسن قادری	لکشمی نرائن اگروال، تاجر کتب، آگرہ	۱۹۳۸ء
دستورا لفصاحت	حکیم سید علی خان یکتا، مرتبہ: امتیاز علی عرشی	ہندوستانی پریس، رام پور	۱۹۴۳ء
دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	۲۰۱۶ء
دہلی میں اردو شاعری کا پس منظر	محمد حسن	ماڈل ٹاؤن، دہلی	۱۹۶۴ء

دیوانِ آتش	مرتبہ: شاہ عبدالسلام	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی	۱۹۷۷ء
ذکرِ میر	مرتبہ: نثار احمد فاروقی	انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی	۱۹۹۶ء
رسالہ تذکرات	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	یہ کتاب ریختہ پر موجود ہے	۱۹۶۸ء
سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ: حیات اور کارنامے، ڈاکٹر حسینی شاہد		انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش، حیدرآباد	۱۹۷۳ء
سیر المصنفین (جلد اوّل)	مولوی یحیٰ تنہا	شیخ مبارک علی اینڈ سنز، لاہور	۱۹۴۸ء
شعرا کے تذکرے	قاضی عبدالودود	خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ	۱۹۹۵ء
شعر الہند	عبدالسلام ندوی	دار المصنفین شبلی اکیڈمی۔ اعظم گڑھ	۲۰۰۹ء
شعرائے اردو کے تذکرے اور تذکرہ نگاری کا فن، ڈاکٹر سید عبداللہ		مکتبہ خیابان ادب، لاہور	۱۹۶۸ء
شعرائے اردو کے تذکرے	پروفیسر حنیف نقوی	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۹۸ء
شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ	مرتبہ: اسلم پرویز	انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی	۱۹۹۹ء
طبقات شعرائے ہند	مولوی کریم الدین وفیلن، مرتبہ: عطا کاکوی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ		۱۹۸۳ء
عبدالسلام ندوی کی ادبی خدمات	ڈاکٹر شباب الدین	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۹۹ء
علی گڑھ تاریخ ادب اردو (جلد اوّل) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ		زیر اہتمام، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	۱۹۶۲ء
غالب درون خانہ	کالی داس گپتا رضا	ساکار پبلشرز، پرائیویٹ لمیٹڈ، بمبئی	۱۹۸۹ء
قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	محمد حسن	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۲۰۰۵ء
کربل کتھا	مرتب: خواجہ احمد فاروقی	شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی	۱۹۶۱ء
کڑوے کسیلے مضامین	مرتبہ: اورنگ زیب نیازی	مغربی پاکستان، اردو کیڈمی، لاہور	۲۰۰۳ء
کلیات نثر حالی (جلد اوّل)	مرتبہ: اسماعیل پانی پتی	مجلس ترقی ادب، لاہور	ندارد
کلیات ولی	مرتبہ: احسن مارہروی	انجمن اردو پریس، اورنگ آباد	۱۹۲۷ء
گل رعنا	حکیم سید عبدالحئی	دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۲۰۱۴ء
لکھنؤ کا دبستان شاعری	ابواللیث صدیقی	شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	۱۹۴۴ء
ماضی کے مزار	سبط حسن	مکتبہ دانیال، کراچی	۱۹۸۷ء
مجموعہ نغز	قدرت اللہ قاسم، مرتبہ: محمود شیرانی	پنجاب یونیورسٹی، لاہور	۱۹۳۳ء
محمد حسین آزاد: حیات اور تصانیف (جلد دوم) اسلم فرخی		انجمن ترقی اردو، پاکستان	۱۹۶۵ء
محمد حسین آزاد	پروفیسر مظفر حنفی	ساہتیہ اکادمی، دہلی	۱۹۹۶ء
محمد حسین آزاد	نند کشور وکرم	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی	۱۹۸۲ء

مختصر تاریخ ادب اردو	سید اعجاز حسین، مرتب: سید محمد عقیل	جاوید، پبلشرز نشیمن، الہ آباد	۱۹۸۴ء
مخزن نکات	قائم چاند پوری، مرتبہ: اقتدا حسین	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۷۲ء
مرزا محمد رفیع سوداؔ	خلیق انجم	انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ	۱۹۶۶ء
مضامین نو	پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۷۷ء
مطالعۂ داغ	سید محمد علی زید	نظامی پریس، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ	۱۹۷۴ء
معمولات مظہریہ	مترجم: محمود عبدالستار	بھولے پور ضلع امبیڈکر نگر، یوپی	۲۰۰۷ء
مغز مرغوب و چہار شہادت	مرتبہ: محمد ہاشم	حیدرآباد اردو اکیڈمی، حیدرآباد	۱۹۶۶ء
مقالات آزاد (جلد اول)	مرتبہ: آغا محمد باقر	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۶ء
مقالات مظہری	مترجم: شیخ غلام علی	نول کشور پریس، لاہور	ندارد
مقدمہ ابن خلدون (جلد اوّل)	مولانا راغب رحمانی	نفیس اکیڈمی، اردو بازار، کراچی	۲۰۰۱ء
مکاتیب آزاد	مرتبہ: مرتضیٰ حسین فاضل	مجلس ترقی ادب، لاہور	۱۹۶۶ء
مکاتیب حالی	مرتبہ: شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	ادبی پریس، کراچی	۱۹۵۰ء
موازنہ انیس و دبیر	علامہ شبلی نعمانی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۲۰۰۴ء
میر تقی میرؔ: حیات اور شاعری	خواجہ احمد فاروقی	انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ	۱۹۵۴ء
نادرات شاہی	مرتبہ: امتیاز علی عرشی	ہندوستانی پریس، لاہور	۱۹۴۴ء
نقوش سلیمانی	سید سلیمان ندوی	دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۲۰۱۶ء
نکات الشعرا	میر تقی میرؔ، مترجم: ڈاکٹر حمیدہ خاتون	آفسیٹ پرنٹرس، دہلی	۱۹۹۴ء
نکات الشعرا	میر تقی میرؔ، مرتبہ: پروفیسر محمود الٰہی	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۸۴ء
واقعات انیس	میر مہدی حسن احسن لکھنوی	دراصح المطابع، تھوپی ٹولہ، لکھنؤ	ندارد
ولی گجراتی	مرتبہ: ظہیر الدین مدنی	ادبی پبلشرز، بمبئی	۱۹۷۴ء

(ب) رسائل و جرائد/ لغات/ ویب سائٹ

ادب کیا ہے (مضمون)   ڈاکٹر جمیل جالبی   www.urduweb.org   ۲۰۱۶ء
رسالہ 'اردو'   مدیر: مولوی عبدالحق   انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، دکن   ۱۹۳۷ء
رسالہ 'نگار' (تذکروں کا تذکرہ نمبر)   مولفہ: ڈاکٹر فرمان فتح پوری   گارڈن مارکیٹ، کراچی، پاکستان   ۱۹۶۵ء
علی گڑھ میگزین   مدیر: اقبال حسین صدیقی   علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ   ۱۹۸۹ء
فرہنگ آصفیہ (جلد اول)   مولوی سید احمد دہلوی   ترقی اردو بیورو، نئی دہلی   ۱۹۸۷ء
مصباح اللغات   مولف: ابوالفضل مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، مکتبہ قدوسیہ، اردو بازار، لاہور   ۱۹۹۹ء
نوراللغات (جلد دوم)   نورالحسن نیر   جنرل پبلشنگ ہاؤس، کراچی   ۱۹۵۹ء